بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جنوری 2014
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
سال نو مبارک

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، عنایت علی خان 11
نعت، امجد اسلام امجد 11
نبی کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

بند ھن، شاہین رشید 25
دستک، شاہین رشید 274
سیر دو جہاں، آمنہ زریں 30
نیا سال، ادارہ 17

ناول

ایک تھی مثال، رخسانہ نگار عدنان 248
رقص بسمل، نبیلہ عزیز 36

مکمل ناول

عشق دعا ہے، لبنیٰ جدون 76
زندگی سے یوں کھیلے، عارفہ رباب 204

ناولٹ

بت شکن، امایہ خان 134
محبت راز ہے ایسا، عظمیٰ افتخار 172

افسانے

بے جوڑ، راشدہ رفعت 53
قصوروار کون، طوبیٰ احسن 69
پہلوئے حور، ملیحہ صدیقی 66
رکاوٹ، قانتہ رابعہ 128
عادی، صباحت یاسمین 166

نظمیں، غزلیں

غزل، اقبال عظیم 267
غزل، تاثیر 267
غزل، شمیم فاطمہ 266
نظم، حفیظ ہوشیارپوری 266

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---	8000 روپے

مستقل سلسلے

خط آپ کے، رضیہ جمیل 283
مسکراہٹیں، صبا سحر 268
آئینہ خانے میں، صبا سحر 278
باتوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 270
یادرکھے جھروکے، امت الصبور 281
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی 273
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 288
خوبصورت بنئے، ادارہ 290

جنوری 2014
جلد 28 شمارہ 5
قیمت 50 روپے

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۹۱، بی ۲، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

جنوری ۲۰۱۴ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
نئے سال کا پہلا شمارہ۔

یخ بستہ شامیں اور گہری سرد راتیں لوٹ آئی ہیں۔ بدلتے موسم زندگی کا استعارہ ہیں۔ ایک عمر کی مسافت ان ہی سرد گرم موسموں میں گزر جاتی ہے۔ دکھ سکھ، نشیب و فراز، خوشی اور غم۔ ایک دھوپ چھاؤں کا عالم ہے زندگی۔ ہر خزاں کے بعد بہار، ہر رات کے بعد سحر طلوع ہوتی ہے اور ہر مشکل کے بعد قدرت آسانی بھی مہیا کرتی ہے۔

زندگی اسی طرح رنگ بدلتی ہے اور زندگی کو اس کے ان تمام رنگوں کے ساتھ خوش دلی سے قبول کر لینا ہی اصل کامیابی ہے۔ جو اس حقیقت کو پا لیتے ہیں، وہ خالق کائنات کی رضا میں راضی اور مطمئن رہتے ہیں انہیں نہ کامیابی غرور، تکبر میں مبتلا کرتی ہے اور نہ وہ ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر مایوس ہوتے ہیں ایسے ہی لوگ صحیح معنوں میں زندگی جیتے ہیں۔

قارئین کو نیا سال مبارک۔

ہماری دعا ہے کہ یہ سال آپ کے لیے خوشیوں کا سورج لے کر طلوع ہو۔ آپ کے سارے خواب روشن تعبیر پائیں اور آپ کے نیک ارادے تکمیل پا کر آپ کی زندگی میں اجالے بھر دیں۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- عشق دعا ہے۔ لبنیٰ جدون کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- زندگی سے یوں کھیلے۔ عارفہ رُباب کا مکمل ناول،
- امایہ خان اور عظمیٰ افتخار کے ناولٹ،
- راشدہ رفعت، ملیحہ صدیقی، طوبیٰ احسن، قانتہ رابعہ اور صباحت یاسمین کے افسانے،
- رخشانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- کرن خان اور علی نامر کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ بندھن،
- بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا۔ سلمیٰ اعوان کی کتاب پر آمنہ زریں کا تبصرہ،
- سالِ نو کے حوالے سے قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

سالِ نو کا یہ پہلا شمارہ ہم نے آپ کے لیے پوری محنت سے ترتیب دیا ہے۔ شعاع آپ کا اپنا پرچا ہے۔ آپ اس کے لیے کوئی تجویز یا مشورہ دینا چاہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ پرچے کے بارے میں ہمیں اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

حمد
باری تعالیٰ

مالک ہے ربِ زمین و آسمان کا
محتاجِ کن ہے ذرہ ذرہ جہان کا

دشت و چمن کے رنگوں میں ہے جلوہ گر وہی
علیم ہے وہ مکان و لامکان کا

عرش و فرش کی ہر شے تسبیح خواں ہے ہر پل
محافظ ہے وہ زبردست ہر سائبان کا

جن و بشر اسی کی جنبش کے ہیں غلام
ہے گواہ پتا پتا اس کی ہی شان کا

نیکی کی آرزو میں کوثر جیے جائے گی
کر بندوبست مولا حشر کے سامان کا

کوثر خالد

یہ دعا ہے زندگانی حرمِ نبیؐ میں گزرے
کبھی مستیوں میں گزرے، کبھی بے خودی میں گزرے

مری زندگی کی راہوں میں ان ہی سے اجالا
وہ خوشی کے چند لمحے جو تری گلی میں گزرے

تری یاد کے تصدق تری یاد بھی کرم ہے
مرے غم کے روز و شب بھی بڑی سرخوشی میں گزرے

اے عرب کے ماہِ تاباں، یہی اب تو آرزو ہے
کہ تمام عمر میری تیری چاندنی میں گزرے

وہ خرد سے ماورا ہیں، وہ ہیں عشق کا مقدر
جو نظر سے کچھ مناظر حرمِ نبیؐ میں گزرے

حافظ مظہر الدین

اخلاص اور حسن نیت

امیر المومنین ابو حفص عمر بن خطاب سے روایت ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"عملوں کا دارومدار نیتوں ہی پر ہے۔ ہر شخص کو اس کی (اچھی یا بری) نیت کے مطابق (اچھا یا برا) بدلہ ملے گا۔ چنانچہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی' اس کی ہجرت ان ہی کی طرف سمجھی جائے گی اور جس نے دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت ان ہی مقاصد کے لیے ہوگی۔" اس روایت کی صحت متفقہ ہے۔ (صحیح بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ بعض روایات میں اس حدیث کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے ام قیس نامی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس نے اس وقت تک نکاح کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ ہجرت نہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کی اس شرط کی وجہ سے ہجرت کرلی اور وہاں جا کر دونوں کا باہم نکاح ہو گیا۔ اس وجہ سے صحابہ میں اس کا نام ہی مہاجر ام قیس مشہور ہو گیا۔

2۔ اس حدیث کی بنیاد پر علماء کا اتفاق ہے کہ اعمال میں نیت ضروری ہے اور نیت کے مطابق ہی اجر ملے گا' تاہم نیت کا محل دل ہے' یعنی دل میں نیت کرنا ضروری ہے' زبان سے اس کا اظہار ضروری نہیں۔ زبان کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ جیسے نماز پڑھتے وقت پاک و ہند میں زبان سے نیت کے اظہار کا عام رواج ہے جو کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے اور دین میں اضافہ ہے تاہم حج کا تلبیہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

3۔ ہر کام کے لیے اخلاص ضروری ہے' یعنی ہر نیک عمل میں صرف اللہ کی رضا پیش نظر ہو۔ اگر کسی نیک عمل میں اخلاص کے بجائے کسی اور جذبے کی آمیزش ہو جائے گی تو عنداللہ وہ عمل مقبول نہیں ہو گا۔ اسی طرح قبولیت عمل کے لیے اخلاص کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہو۔

نیت کے مطابق اجر

ام المومنین ام عبداللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک لشکر خانہ کعبہ پر چڑھائی کرنے کی نیت سے نکلے گا' جب وہ بیداء (کسی چٹیل میدان) میں پہنچے گا تو اس کے اول و آخر (سب کے سب) زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں' میں نے پوچھا۔

"اے اللہ کے رسول! ان کے اول و آخر' یعنی سب کو کیسے دھنسا دیا جائے گا جب کہ ان میں بازاری لوگ ہوں گے (یعنی حکام کے علاوہ عام افراد' یا منڈی کے لوگ اور مطلب ہے کہ وہ جنگجو نہیں ہوں گے) اور وہ بھی ہوں گے جو ان میں سے نہیں ہوں گے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان کے اول اور آخر سب دھنسا دیے جائیں گے پھر وہ اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے (یعنی قیامت والے دن ان سے معاملہ ان کی نیتوں کے مطابق کیا جائے گا)۔" (بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں)

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کے ساتھ روز قیامت اچھا یا برا معاملہ اس کے قصد و ارادے کے مطابق کیا جائے گا۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ظلم و فجور کے مرتکبین کی ہم نشینی نہایت خطرناک ہے۔

3۔ یہ کون سا لشکر ہے اور اس کا وقوع کب ہو گا؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ یہ پیش گوئیاں امور غیب سے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں' جن کے وقوع اور صداقت پر ایمان رکھنا ضروری ہے' اس لیے کہ اس قسم کی پیش گوئیاں وحی الٰہی پر مبنی ہیں۔

4۔ اس سے بیت اللہ کی عزت و حرمت کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہاں فساد برپا کرنا کس قدر شدید جرم ہے۔

جہاد اور نیت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فتح کے بعد ہجرت نہیں' البتہ جہاد اور نیت باقی ہیں۔ جب تمہیں جہاد پر نکلنے کے لیے طلب کیا جائے تو (بلا تامل) نکل پڑو۔" (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب ہے "مکہ فتح ہو جانے کے بعد (جو 8 ہجری میں ہوا) مکے سے ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ وہ دار الاسلام بن گیا ہے۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد کچھ لوگوں نے مکہ سے ثواب کی غرض سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی' اور ہجرت کا ثواب یہ ہے کہ اس سے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں' تو آپ نے فرمایا کہ اب یہاں سے ہجرت کی ضرورت نہیں' البتہ اللہ تعالیٰ نے ثواب کا سلسلہ منقطع نہیں کیا۔ اگر کوئی شخص یہی ثواب لینا چاہتا ہے تو وہ حسن نیت سے یعنی اگر ضرورت پڑی تو ہجرت کروں گا' اور جہاد کر کے یہ ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

2۔ جب کوئی ملک یا علاقہ دار السلام قرار پا جائے تو وہاں سے کسی اور علاقے کی طرف ہجرت کرنا ضروری نہیں' البتہ وہ علاقے جو دار الکفر ہیں وہاں دین پر عمل کرنا یا اس پر قائم رہنا مشکل ہے تو ایسے علاقوں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

3۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی اسلامی ملک سے' کسی دوسرے اسلامی ملک میں ہجرت کر کے جانا ضروری نہیں ہے تو پھر ایک اسلامی ملک کو چھوڑ کر بلاد کفر میں جا کر اس لیے مستقل رہائش اختیار کرنا کہ وہاں دولت کی ریل پیل اور تمدنی سہولتوں کی فراوانی ہے' "شرعاً" اس کی اجازت نہیں ہے' جس میں بدقسمتی سے اس زمانے کے مسلمان مبتلا ہیں۔ بالخصوص ان کے سرمائے کا انتقال اور مفکرین کی ہجرت بہت ہی تشویش ناک ہے۔ جس سے بلاد کفر کی معیشت کو بھی سہارا مل رہا ہے اور ان کی حیا باختہ تہذیب کو فروغ و عروج بھی۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان کے دل میں جہاد کا جذبہ اور ارادہ موجود رہنا چاہیے اور اس کے لیے ہر ممکن تیاری بھی۔ تاکہ جب بھی اسے جہاد کے لیے بلایا جائے تو فوراً" اس پر لبیک کہہ سکے۔ یاد رہے جس شخص نے نہ جہاد کیا اور نہ کبھی اس کے دل میں جہاد کی تڑپ اور ارادہ پیدا ہوا اور وہ اسی طرح مر گیا تو وہ نفاق کے شعبے پر مرا۔

نیت کا اجر

حضرت ابو عبداللہ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوے (جہاد) میں نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یقیناً" مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے جتنا بھی سفر کیا ہے اور جو بھی وادی طے کی ہے' وہ تمہارے ساتھ رہے ہیں' انہیں (مدینے میں) بیماری نے روکے رکھا۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

"وہ تمہارے ساتھ اجر میں شریک رہے ہیں۔" (مسلم)

اور بخاری کی روایت' جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس طرح ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک سے واپس لوٹے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہمارے پیچھے کچھ لوگ مدینے میں رہے' ہم جس گھاٹی یا وادی میں چلے' وہ (اجر و ثواب میں) ہمارے ساتھ تھے (کیونکہ) عذر نے انہیں وہاں روکے رکھا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کے دل میں جہاد کی نیت اور جذبہ صادق موجود ہو' لیکن کسی عذر شرعی کی بنا پر شرکت سے معذور رہا تو اللہ تعالیٰ اسے گھر بیٹھے ہی جہاد کا اجر و ثواب عطا فرما دے گا۔

2۔ اسی طرح نیکی کے تمام امور جنہیں انسان سر انجام دینے کا پختہ عزم رکھتا ہو لیکن انجام نہ دے سکے تو حسن نیت کی وجہ سے ثواب حاصل کرلے گا۔ اس طرح اگر کوئی شخص برائی کا پختہ عزم رکھتا ہے لیکن اپنے برے ارادے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اسے بھی اس کا گناہ ہوگا۔ اس ارادے سے مراد وہ ارادہ نہیں جو صرف زبان سے ہوتا ہے اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ میں نے کون سا یہ کام کرنا ہے۔

صدقہ

حضرت ابو یزید معن بن یزید بن اخنس رضی اللہ عنہ اور یہ معن خود ان کے باپ یزید اور دادا' اخنس تینوں صحابی ہیں' نے بیان کیا۔

میرے باپ یزید نے کچھ دینار صدقے کے لیے نکالے اور وہ انہیں مسجد (نبوی) میں ایک آدمی کے پاس رکھ آئے (تاکہ وہ کسی ضرورت مند کو دے دے) میں مسجد میں آیا تو میں نے وہ دینار اس سے لے لیے (کیونکہ میں ضرورت مند تھا) اور وہ (گھر) لے آیا۔

(جب والد کو معلوم ہوا) تو انہوں نے فرمایا۔

"واللہ! تجھ کو دینے کا تو میں نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔"

چنانچہ میں اپنے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اور یہ جھگڑا آپ کے سامنے پیش کردیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے یزید! تیرے لیے تیری نیت کا ثواب ہے اور اے معن! تو نے جو لیا ہے' وہ تیرے لیے (جائز) ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر صدقہ غیر ارادی طور پر محتاج بیٹے کے ہاتھ میں آگیا تو اسے واپس لینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ باپ نے تو کسی مستحق کو دینے کی نیت کی تھی' اسے اس کی نیت کے مطابق صدقے کا اجر مل گیا' تاہم یہ بات بعض علماء کے نزدیک نفلی صدقے پر محمول ہوگی کیونکہ صدقہ واجبہ (زکوٰۃ) کی رقم انہیں نہیں دی جاسکتی جن کا خرچ انسان کے ذمے واجب ہے۔

2۔ صدقے کے لیے کسی کو وکیل بنانا جائز ہے۔

3۔ شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے باپ کو حاکم مجاز یا عالم دین کے پاس لے جانا' باپ کی نافرمانی نہیں ہے' جیسے شرعی مسائل میں باہم بحث و تکرار گستاخی نہیں ہے۔ (فتح الباری 3/292)

وصیت

ابو اسحاق سعد بن ابی وقاص مالک بن جوان دس صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں جنہیں جنت کی خوش خبری دنیا ہی میں دے دی گئی تھی' فرماتے ہیں۔

"میری بیمار پرسی کے لیے حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے۔ مجھے اس وقت شدید درد تھا۔ میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا درد کیسی شدت اختیار کرگیا ہے' میں صاحب مال ہوں لیکن میری وارث صرف میری ایک ہی بیٹی ہے۔ کیا میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کردوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں۔"

میں نے کہا "آدھا مال؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا "پھر اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ایک تہائی مال صدقہ کردوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تیسرا حصہ (تم خیرات کرسکتے ہو) اور تیسرا حصہ بھی زیادہ یا بڑا ہے' اس لیے کہ تم اپنے وارثوں کو صاحب حیثیت چھوڑ کر جاؤ' یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں کنگال کرکے جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ (یاد رکھو!) تم جو بھی اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو گے تو اس پر تمہیں اجر ملے گا' حتیٰ کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے (اس پر بھی ثواب ہوگا)۔"

میں نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اپنے ساتھیوں کے بعد پیچھے چھوڑ دیا جاؤں گا؟ (یعنی کیا میرے ساتھی مجھ سے پہلے فوت ہو جائیں گے اور میں دنیا میں اکیلا رہ جاؤں گا؟)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اگر ایسا ہوا بھی تو کیا' یہ تمہارے "حق میں اچھا ہی ہے) بلاشبہ ساتھیوں کی وفات کے بعد' جب تم ان کے پیچھے رہ جاؤ گے' تو جو بھی عمل اللہ کی رضا کے لیے کرو گے' اس سے تمہارے درجے میں زیادتی اور بلندی ہی ہوگی نیز شاید تمہیں مزید زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے' حتیٰ کہ کچھ لوگ (اہل ایمان) تم سے فائدہ اٹھائیں اور کچھ دوسرے لوگوں (کافروں) کو تم سے نقصان پہنچے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی' اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو جاری (پورا) فرما دے اور انہیں ان کی ایڑیوں پر نہ لوٹا۔ لیکن قابل رحم سعد بن خولہ ہیں۔"

ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت کی دعا فرماتے تھے' اس لیے کہ وہ مکے میں فوت ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس شہر میں اقامت پذیر ہونا پسند نہیں کرتے تھے' جس سے انہوں نے اس کی محبت کے باوجود محض اللہ کی رضا کے لیے ہجرت کی تھی' اس لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی موت مکے میں نہ آئے۔ چنانچہ ان کے لیے آپ نے ہجرت کے اتمام کی دعا فرمائی اور سعد بن خولہ کی حالت زار پر آپ نے دکھ کا اظہار فرمایا کیونکہ ان کی وفات مکے میں ہوئی جس کی وجہ سے وہ ہجرت کے پورے ثواب سے محروم رہے۔

2۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرض الموت میں انسان ایک تہائی مال (1/3) سے زیادہ صدقہ یا وصیت نہیں کرسکتا۔ لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوت ہونے سے پہلے صدقہ کرنا مستحسن امر ہے۔ سلف صالحین میں سے اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں' اس لیے دور حاضر میں اصحاب ثروت کو اپنی جائیداد کا کچھ نہ کچھ اللہ کے لیے ضرور وقف کرنا چاہیے کیونکہ دینی مدارس اور مساجد کی حکومتی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے شدید مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

3۔ انسان کی اگر نیت صحیح ہو تو بیوی بچوں پر جو کچھ

خرچ کرتا ہے اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔
4۔ کسی صحیح غرض کی خاطر انسان اپنی بیماری یا تکلیف کا اظہار کر سکتا ہے، تاکہ اس کا علاج یا دعا کی جا سکے، یہ اللہ کے خلاف شکوہ نہیں ہے۔
5۔ انفاق و صدقات میں اپنے قریب ترین رشتے داروں کو اولیت اور فوقیت دی جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے تعیشات کے لیے ذکوٰۃ خرچ کی جائے جبکہ عام غربا زیادہ ضرورت مند ہوں جیسا کہ بعض فی زمانہ اس طرح کرتے ہیں۔

راوی حدیث : حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سعد بن مالک بن اہیب قرشی، زہری۔ ان کی کنیت ابو اسحاق ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں یا ساتواں نمبر ہے۔ جب اسلام قبول کیا تو ان کی والدہ نے کھانا پینا ترک کر دیا اور کہا "جب تک تو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف نہیں ہوتا اس وقت تک میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور نہ سائے ہی میں ہوں گی۔ یہ اپنی والدہ کے بہت تابع فرمان تھے لیکن ماں سے کہا کہ میں دین محمدؐ سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ان دس صحابہ کرام میں سے ہیں جنہیں جنت کی بشارت دی گئی ——— یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے سعد! تیر چلاؤ، میرے ماں باپ تم پر قربان۔" اور یہ دعا بھی کی "اے اللہ! ان کا نشانہ سیدھا رکھنا۔"

انہیں ایک بار آتا دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ میرا ماموں ہے، اس جیسا کوئی دکھائے تو سہی۔"

تمام غزوات میں شرکت کی۔ فاتح عراق ہیں اور فتح ایران بھی ان ہی کا عظیم کارنامہ ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے مدینہ سے دس میل دور مقام عقیق میں 55 ہجری میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت کندھوں پر لائی گئی اور انہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ کتب احادیث میں ان سے 270 احادیث مروی ہیں۔

شہید کون ہے؟

حضرت ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"ایک آدمی بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے دوسرا (خاندانی، قبائلی) حمیت کے لیے اور ایک تیسرا ریاکاری کے لیے لڑتا ہے، ان میں سے اللہ کی راہ میں لڑنے والا کون ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص صرف اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ (دین) بلند ہو، وہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے۔"
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ کے ہاں اعمال کا اعتبار چونکہ نیات صالحہ کے مطابق ہو گا، اس لیے عنداللہ مجاہد فی سبیل اللہ بھی صرف وہی ہو گا جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑے گا، تاہم اس کا تعلق چونکہ دل سے ہے، جس کو انسان دیکھنے پر قادر نہیں ہے، اس لیے میدان جہاد میں ہر مسلمان مقتول کے ساتھ شہید والا معاملہ کیا جائے گا اور اس کی نیت اور ارادے کا مسئلہ اللہ کے سپرد ہو گا کیونکہ دلوں کے بھید صرف وہی جانتا ہے۔
2۔ انسان کو چاہیے کہ حلال، حرام اور اپنے دین کی اصلاح کے لیے گاہے گاہے علماء سے استفسار کرتا رہے۔

دوڑتی بھاگتی زندگی نے ایک اور سال کی مسافت طے کر لی ہے۔ ایک اور سال ماضی کے دھندلکوں کا حصہ بننے جا رہا ہے۔ یخ بستہ شامیں اور کہر آلود صبحیں لوٹ آئی ہیں۔ جاتے ہوئے سال کے آخری چند دن بہت بوجھل ہوتے ہیں، چار سو پھیلی دھند میں تنہائی کا گہرا ہوتا احساس، بے نام سی اداسی، کچھ گم گشتہ مسکراہٹیں... کچھ گم گشتہ دن... ماضی کی بکھری تصویریں۔ خواب تعبیریں... زندگی کے نگار خانے میں رنگا رنگی کا یہ طلسم دل پر دستک دیتا ہے اور بہت ساری یادیں جگا دیتا ہے۔

سال نو پر قارئین سے سروے کے لیے ہمارا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔
1۔ سال کے اختتام پر آپ کے ذہن میں کون سی یادیں جاگتی ہیں؟ آپ کے محسوسات کیا ہوتے ہیں؟
2۔ اس سال آپ کے مشاغل اور مصروفیات کیا رہیں... ؟ کوئی نیا احساس، سوچ اور فکر ملی؟
3۔ 2013ء میں شائع ہونے والی کون سی تحریریں آپ کو پسند آئیں... مصنفہ کا نام؟
4۔ 2013ء میں کن شماروں کے ٹائٹل اچھے لگے اور وہ کون سا ٹائٹل تھا جو بالکل پسند نہیں آیا؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالوں کے کیا جوابات دیے ہیں۔

پھر آگیا ہے نیا سال

ادارہ

فرحین اظفر... کراچی

(1) : ہائے... واقعی یہ تو بالکل سچی بات ہے۔ دسمبر کا مہینہ اپنے اندر ایک عجیب سی اداسی سمیٹ کر لاتا ہے۔ یادوں کی پٹاری میں سے جانے کون کون سے بھولے بسرے رنگا رنگ دن دل کے دریچوں میں جھانکتے ہیں۔ ایسے میں لبوں پر مسکراہٹ کے کنول کھل بھی جائیں۔ مگر دل ایک اداس دھند میں ملفوف ہی رہتا ہے۔

اسکول کالج کا زمانہ جب کبھی ہم پارٹ ون اور فائنل والوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ اپنے اساتذہ کے منظور نظر تھے، ان کے لاڈلے اور ہونہار شاگرد ہوا کرتے تھے۔ انمول دن تھے۔ کاش کوئی واپس لا سکے۔
اس کے علاوہ وہ چند مہینے جو اتفاق سے سردیوں کے ہی دن تھے۔ جب میں نے ایک پرائیویٹ اسکول میں بطور سینئر ٹیچر جاب کی۔ حالانکہ وہ جاب میں نے فقط چند مہینے ہی کی تھی۔ مگر وہاں کے اسٹاف نے اپنے حسن سلوک اور دوستی و خلوص کا گہرا رنگ میرے دل پر چھوڑا۔ وہ چند مہینے کی یادیں اور ان کے نقش آج بھی میری یادوں کی سرزمین پر تازہ گلابوں کی طرح مہکتے ہیں۔

(2) : جی جناب اس سال کے مشاغل اور مصروفیات گزشتہ پانچ سالوں کے تمام مشاغل اور مصروفیات سے ہٹ کر تھیں۔ نیا احساس بھی ملا۔ سوچ بھی اور فکریں تو نت نئی پالتے ہی رہتے ہیں۔
خیر سے خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے مابدولت کو تیسری بار اماں جان کے عہدے پر فائز ہونے کا شرف حاصل ہونے جا رہا ہے۔ تمام مصروفیات مشاغل و تفکرات بچوں کی پڑھائی کے بعد اسی ایک نئے احساس تلے پنپتی رہیں۔ اپنے وجود میں دھڑکتی زندگی کو محسوس کرنا، ایک ماں کی ممتا کو کس قدر اچھوتے احساس سے روشناس کراتا ہے۔ یہ صرف ایک ماں ہی جان سکتی ہے۔ یا وہ رب کائنات جس نے بقا کے تسلسل کا یہ انوکھا سلسلہ شروع کیا۔

اس کے علاوہ اسکول و کالج کے زمانے کی دیرینہ دوست ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ہم سے آن ملی۔ اس قدر پرانی دوستی کا بچھڑ کر پھر سے مل جانا۔ اس سال حاصل ہونے والی بے پایاں مسرتوں میں سے ایک تھا۔

(3) : شعاع کی رائٹرز میں سے چند نام ایسے ہیں' جن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس سال پرچے پر ان کا راج رہا تو یہ بات کسی حد تک درست ہی ہوگی۔ اور وہ لکھاری بہنیں ہیں کون؟۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ میں بات کر رہی ہوں' سائرہ رضا' سمیرا حمید اور نمرہ احمد کی۔ "وہ پہلی بار جب ہم ملے' محبت' من' محرم" اور دن اینڈ اولی "جنت کے پتے" سپرہٹ تحریریں تو تھیں ہی۔ لیکن اگر مختصر تحاریر کی بات کی جائے۔ تو سمیرا حمید کے افسانے "بوند بوند تماشا" نے میدان مارا اور سائرہ رضا کی "فرماں بردار" نے۔ لیکن یہاں ایک تحریر اور بھی ہے۔ نم آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ یادوں کے دریچے سے جھانکتی املیہ خان کی "ایک شام کہیں آباد" اس تحریر نے حقیقتاً "میرے دل کو چھوا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میرے اپنے نانا جی اب اس دنیا میں نہیں اور ہم سے ہمارا وہ بچپن کا آبائی گھر جہاں ہمارا ننھیال آباد تھا۔ اندرون سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر "کوٹری" ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی دریائے سندھ کا وہ نارنجی کنارہ بھی۔ جہاں مٹی سے بنائے گئے بند پر کھڑے ہو کر ہم تاحد نگاہ پھیلی فصلوں اور اس کے عقب میں سندھو دریا کے مٹیالے پانی کا نظارہ کرتے تھے۔

(4) : ٹائٹل تقریباً" تمام ہی شماروں کے اچھے تھے۔ اپریل' جولائی اور خاص کر دسمبر کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ نکھرا نکھرا۔ تازگی کا احساس دیتا ہوا۔

ہاں اگر کوئی نہیں پسند آیا تو صرف اگست 2013ء کا۔ اور وہ بھی ماڈل کے کپڑوں کی وجہ سے۔ جس میں انہوں نے بے حد بھاری کامدار غرارہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر اس ٹائٹل کا تاثر کچھ پرانا سا تھا۔

قرۃ العین خرم ہاشمی۔۔۔۔۔لاہور

(1) :

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی !!

وقت کے کشکول میں یادوں کے کتنے ہی سکے ہر لمحہ کھنکتے رہتے ہیں۔ کئی راتیں ایسی جیسے سونے کے چمکتے سکے۔۔۔ کئی دن چاندی کے سکوں کی مانند اور کئی کھوٹے سکوں کی مانند' جب بھی نظروں کے سامنے آتے ہیں بہت چبھتے ہیں۔

کھلی جو آنکھ پس مرگ تو یہ راز کھلا
کہ ایک خواب کے عالم میں' خواب تھے کتنے

ہر گزرتا لمحہ' ہمیں آگے سے آگے لے کر جا رہا ہے۔ خواب در خواب۔۔۔ کبھی کبھی سمجھ میں نہیں کہ اتنے خوابوں کے بعد آخر کیا ہوگا؟

ہر گزرتے سال کے ساتھ ساتھ اور جاتے سال کی ساعتوں میں یہ احساس دگنا ہوتا جاتا ہے۔ کاش من کی دنیا میں بھی' میرے کھوٹے سکے چل جائیں۔ میرے سود و زیاں کا حساب ہی بدل جائے گا!

(2) :

مجھ کو بھی ترکیب سکھا!
کوئی یار' جلاہے۔۔۔!!
اکثر تجھ کو دیکھا ہے کہ تانا بنتے
جب کوئی تاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا
پھر سے باندھ کے
اور
سرا کوئی جوڑ کے اس میں
آگے سے بننے لگتے ہو
تیرے اس تانے میں لیکن
اک بھی گانٹھ گرہ بنتر کی
کوئی دیکھ نہیں سکتا ہے
میں نے تو
ایک بار بنا تھا
ایک ہی رشتہ!

لیکن اس کی ساری گرہیں
صاف نظر آتی ہیں!
میرے یار' جلاہے!!

زندگی میں اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ اپنی ہی نادانی اور جذباتیت کی وجہ سے تعلق کے دھاگوں میں گرہ لگانی پڑتی ہے۔

ایک تبدیلی یہ ضرور آئی ہے کہ کافی ٹائم کے بعد تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کیا ہے۔ یہ کافی بڑی تبدیلی ہے جو ان روز و شب میں آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بس یہ ہنر سیکھنے کی دھن سوار رہی کہ کس طرح رشتوں کے ریشم کو الجھنے سے بچاتے رہیں۔

(3) : اس سوال کے جواب کے لیے پچھلے شمارے چھانٹنے پڑیں گے۔ مگر جو تحریر فی الحال فوراً" ذہن میں آرہی ہے' وہ صائمہ اکرم کی "دیمک زدہ محبت" ہے۔ بلاشبہ بہت اچھی اور خوب صورت تحریر ہے۔ اس کے علاوہ سائرہ رضا کی بھی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔

اب کم ٹائم ملتا ہے ڈائجسٹ پڑھنے کا مگر جو بھی ہے "ساتھ" تو قائم ہے ناں!

(4) :

خواہش وصل کہاں' عشق کہاں باتیں کہاں
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہوتی مجھ کو!

اور مصروفیت یا کشمکش کے ایسے دور میں جہاں خود کو یاد رکھنا بھی اب مشکل لگتا ہے۔ ٹائٹل یاد رکھنا کافی مشکل ہے۔

فی الحال دسمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ اس میں جو چیز سب سے اچھی لگ رہی ہے۔ وہ ماڈل کی مسکراہٹ ہے۔

فروری کے شمارے کا بھی ٹائٹل اچھا ہے۔ ماڈل کی منفرد لک یا انداز کی وجہ سے اگست، مارچ کا ٹائٹل کافی کلر فل تھا بھاری ڈریس اور برائیڈل اسٹائل کی وجہ سے۔

باقی ٹائٹل بھی اچھے تھے۔ اب برا کون سا تھا؟ میرے خیال سے کوئی بھی نہیں۔ سب ٹھیک ہی تھے اپنی اپنی جگہ پر۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ آپ کے ادارے سے شائع ہونے والے سب ڈائجسٹ کے ٹائٹلز بہت اچھے اور ورائٹی لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

اور آخر میں جاتے ہوئے سال کے لیے صرف اتنا ہی کہنا ہے۔

میں تعلق ہوں، ٹوٹ جاؤں گا!
تم حوالہ ہو، یاد آؤ گے!!

اقصیٰ مریم ملغانی...... کاسی اسٹریٹ کوئٹہ

(1) : دسمبر، ہائے بقول ابرار الحق "بھیگا بھیگا سا یہ دسمبر ہے، بھیگی بھیگی سی تنہائی ہے" کے راگ الاپتے رہتے ہیں اور بھیگی، سہانی، مستانی، برستی گھٹاؤں کا مزا لیتے ہیں، پکوڑوں کی مہک اور پودینے کی چٹنی کی کٹوری اٹھائے چوبارے کی راہ لیتے ہیں۔ کانوں میں ہینڈز فری ٹھونسے بارش کے گانے سنتے ماضی کی یادوں میں کھوسے جاتے ہیں۔ ڈوبتے سورج کا منظر، ایک اداس سی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

ڈائری انختتام کی راہوں کی طرف گامزن ہوتی ہے، ہر ہر شے اداس، ویران، بنجر، بوسیدہ، اپنوں کی ستم ظریفی کے نشان ثبت کیے ہوئے لگتی ہے۔ بچھڑے دوستوں کی یادیں ستاتی ہیں، کالج میں گزارے دسمبر کے آخری ایام یاد آتے ہیں تو کہیں اس زمین سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کر جانے والے اپنی بیلی، منگی، بار، عزیز ترین رشتے اپنی بھولی بسری سی تصویریں لیے ذہن کے پردوں پہ بیٹھ جاتے ہیں۔

خالہ کے بیٹے کی منگنی کی دھوم دھام والی رات، دادی جان کے جنازے کے آگے ماتم کناں ہجوم، جنوری 2013ء کے دھماکوں میں شہید ہونے والے میرے پیارے چہرے، ان کے گوشت کے ٹکڑے، سڑک پر خون کی ہولی، اپنی بیماری کے تین ماہ، دل کے نہاں خانوں میں محبتوں کے صحراؤں کی ریت انگارے بھرنے لگتی ہے۔ میں چاند کو تکتی رہتی ہوں۔ خود کو بے بس پا کر نئے سال کے طلوع آفتاب کا انتظار کرتی سو جاتی ہوں۔

(2) : سوال ٹھیک ہی ہے۔ بس، جو بھی نئی سوچ اور فکر ملتی ہے، عملی جامہ پہنے بغیر ٹھپ ہو جاتی ہے۔

مشاغل کیا ہوتے ہیں بھئی۔ وہی شعاع، خواتین، ناول، شاعری مجموعے، ڈرامے، یونیورسٹی، اور ہاں سال 2014ء کی پیاری سی سرخ جلد والی ڈائری، جو آج ہی خریدی ہے۔

(3) : 2013ء میں شائع ہونے والی تحریریں کوئی ایک ہو تو۔۔۔ ہائے ایسے سوال نہ پوچھا کریں۔ کس کس رائٹر کا نام لکھوں، کسے چھوڑوں۔ سب ہی اپنی مثال آپ ہیں۔ اے ون۔ سرفہرست ہیں نمرہ احمد جنت کے پتے، عنیزہ سید "نان بائی کی بیٹی" سحر ساجد کا ایک ناول تھا، نام یاد نہیں۔ سمیرا حمید "محبت من محرم" اعلیٰ ترین شاہکار......!

(4) : مارچ 2013ء کا ٹائٹل بہت بھایا تھا۔ ہائے کیا بتاؤں کتنے ہی دن دیکھتی رہی۔ اگست 2013ء، جولائی 2013ء بہت پسند آئے، اس کے علاوہ باقی ٹائٹلز بس سو سو رہے۔

مسکان قریشی...... بلال کالونی، ملتان

(1) : مجھے ہمیشہ سال کے اختتام پہ اپنے اسکول کے وہ دن یاد آتے ہیں جب لاہور کی دھند بھری صبح، سندس سعید بٹ اور میں بریک میں نان چنے کا ناشتہ کرتے، جو سردی میں ٹھٹھر کر ہمارے دانتوں کے نیچے چیونگم کی طرح پھسلتا رہتا۔ ہمارے اسکول کی بلند و بالا عمارت کے سامنے نان چنے، حلیم، چاول، چھولے کی وہ بڑی سی دکان، مزے دار کھانوں کی للچاتی خوشبو اور سیکنڈ فلور پر ونڈو سے منہ چڑائے ہم دونوں کے سرخ و سفید، یخ بستہ ہاتھ اور اس پر قینچی کی طرح چلتی ہماری زبانیں ناقابل فراموش یادیں ہیں۔ جب بھی لاہور جاتی ہوں، واپس آنے کو بالکل دل نہیں کرتا اور اب جب ہم دونوں جاب کر رہے ہیں وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے، پھر بھی جب ہم دونوں کی فون پر بات ہو، ہم خوب لڑتے ہیں اور ان دنوں کی یادوں کو بہت مس کرتے ہیں اور ہاں! مجھے اپنی فزکس اور میتھ کی ٹیچر مس شازیہ بہت یاد آتی ہیں دعا ہے کہ زندگی ایک دفعہ ان سے ملاقات کروا دے۔

(2) : سائنس ٹیچر ہوں اس حوالے سے پڑھنے اور پڑھانے کی مصروفیات رہیں کچھ آئیڈیاز ہیں جن کو نئے سال پر اپلائی کرنے کا سوچا ہے، جو بچوں کے لیے آسان ہو اور سائنس ان کے لیے پڑھنے کے حوالے سے دلچسپ ہو نہ کہ بوجھ بن جائے۔

(3) : 2013ء میں شائع ہونے والی تحریریں؟ جنوری میں ثوبیہ جبیں گل کا "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" فروری میں ام طیفور کی "ہرجائی قصائی" اور عائشہ نصیر کی "اس راہ طلب میں" مارچ میں سارے ناول، ناولٹ اور افسانے باکمال تھے۔ خصوصاً "صائمہ

اکرم کا شروع ہونے والا ناول "دیمک زدہ محبت" جو اس سال اختتام کو پہنچا۔ اپریل میں بھی کسی ایک کہانی کا انتخاب مشکل ہے چنانچہ آسیہ رزاقی کی "اتنی سی بات" بے حد پسند آئی۔ مئی میں سائرہ رضا کی "فرماں بردار" اور عنیزہ سید کی "تان بائی کی بیٹی" اثر انگیز کہانیاں تھیں۔ جون میں فاخرہ جبیں کا ناول "برف زاروں کی تتلی" سحر انگیز ناول تھا۔ جولائی میں صائمہ بشیر کا ناول "اجالوں کا سفر" بہت اچھا تھا۔ اگست میں سحر ساجد کا "ابھی وقت باقی ہے" اور سائرہ رضا کا "عید 66 میں" سپرہٹ ناول تھے۔ ستمبر میں سمیرا گل کا "اجالوں کا سفر" اور صدف آصف کا "پیا من بھائے" سبق آموز ناول تھے۔ اکتوبر میں شروع ہونے والا ناول سمیرا حمید کا "محبت من محرم" دسمبر میں اختتام پذیر ہوا سپرہٹ ناول تھا۔ نومبر میں عفت سحر پاشا کا "اترن" لا جواب ناول تھا۔ دسمبر کی ایک ایک کہانی نایاب ہے۔ خاص طور پر نزہت شبانہ حیدر کا "تم جان جاؤ گی" بہترین ناول تھا۔

(4) : 2013ء کے اچھے ٹائٹل؟ مارچ، اپریل، اگست اور دسمبر کے ٹائٹل بے حد پسند آئے۔ جولائی کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔

مہوش مشتاق...... چیچہ وطنی

(1) : جاتے سال کے دن بہت ہی بوجھل ہیں۔ پہلے تو زندگی میں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا لیکن اچانک زندگی نے ایسا پلٹا کھایا کہ یہ دن کچھ زیادہ بوجھل لگنے لگے۔

(2) : اس سال میری مصروفیت صرف میرے بچے رہے۔ ان کی فکر ان کا خیال اور ان کا مستقبل ذہن میں رہا اور کچھ لائحہ عمل تیار کیا ذہن میں جو اللہ کرے کہ پورا کر سکوں۔

(3) : اس سوال کے جواب کے لیے پرانے رسالے کھنگالنے پڑے کیونکہ تحریریں یاد رہ جاتی ہیں، لیکن نام نہیں یاد رہتے "جنت کے پتے" بابا کی رانی

محبت من محرم، ابھی وقت ہے، دیمک زدہ محبت" اس سال کی بہترین تحریریں تھیں۔

(4) : جولائی 2013ء کا ٹائٹل اور دسمبر کا بھی اچھا تھا۔ مارچ کا ٹائٹل اتنا خاص نہیں لگا۔

مسرت الطاف احمد...... کراچی

(1) : جاتے سال کے آخری چند بوجھل دنوں میں میرے سب سے چھوٹے ماموں امتیاز کے سعودی عرب جانے سے دسمبر کی ٹھنڈی دوپہر اور شامیں اور بھی اداس اور افسردہ لگ رہے ہیں۔

ابو کے رائٹ ہینڈ ہیں۔ ہر کام میں ابو کے ساتھ ہوتے ہیں ان شارٹ وہ ہمارے ماموں نہیں، بھائی ہیں۔

گزشتہ سال کے ابتدائی دنوں میں ابو کی اچانک طبیعت کی خرابی ہمارے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ جب ابو حج کا فریضہ ادا کر کے واپس آئے تو انہیں ہارٹ پرابلم ہو گئی اور انہیں انجیو گرافی کرانا پڑی۔

(2) : گزشتہ سال کے حوالے سے میرے ذہن کے پردے میں، میں نے ایسا کوئی تخلیقی یا مثالی کام نہیں کیا جو یادگار ہو۔

(3) : شعاع کے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی تحریر ایسی ضرور ہوتی ہے، جو دل کو چھو لینے والی اور متاثر کن ضرور ہوتی ہے۔ صائمہ اکرم کا ناول "دیمک زدہ محبت" نے مجھے بہت شدت سے انسپائر کیا۔

سائرہ رضا کا مکمل ناول "یقین کامل ہی بندگی ہے" جو خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔ عنیزہ سید کا ناول "تان بائی کی بیٹی" عام روایتی اسٹوری سے بالکل ہٹ کر ایک انوکھی منفرد تحریر تھی جس نے مجھے بہت اٹریکٹ کیا۔

(4) : 2013ء میں جس ٹائٹل نے بہت انسپائر کیا وہ اگست کا شمارہ ہے۔ خوب صورت رنگوں سے سجی ماڈل کے کپڑوں نے مجھے بہت اٹریکٹ کیا۔ میک

اپ، جیولری، ہیراسٹائل ہر چیز پرفیکٹ تھی اور مارچ کا ٹائٹل بھی دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ 2013ء میں مئی اور اپریل کا ٹائٹل ایک آنکھ نہیں بھایا۔

ثمینہ اکرم..... بہار کالونی، کراچی

(1) : یہ سچ ہے کہ واقعی ہر دفعہ جاتے سال کے آخری چند دن بہت بوجھل ہوتے ہیں۔ چار سو پھیلی دھند میں تنہائی کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ بے نام سی اداسی، کچھ گم شدہ مسکراہٹیں، کچھ گم شدہ دن دل کو اداسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ ماضی کی بکھری تصویریں جن میں کچھ اچھی یادیں اور کچھ آزمائش بھرے گزرے لمحات دل کے کواڑ پر دستک دیتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم ماضی کی یادوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ 2013ء کا سال میرا کچھ اتنا خوش گوار نہیں گزرا۔ گزرے برس کی تلخ یادیں میرے دل میں انی بن کر گزر جاتی ہیں۔ سال کے اختتام پر میرے دل میں میرے شہزادے معیز اکرم کی یادیں کچھ اس طرح کروٹ لیتی ہیں کہ میرے دل کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے مگر پھر اللہ پاک سے اپنے لیے صبر و قرار مانگتی ہوں۔ میرے محسوسات ناقابل بیان ہوتے ہیں۔

برس کے آخیر دو ماہ میرے لیے بہت صبر آزما گزرے۔ میرے محسوسات میں نئے سال کی آمد پر کسی خوشی کا دور دور تک شائبہ بھی نہیں۔ 11 نومبر کی وہ خوفناک رات، اس کا معمولی سا روڈ ایکسیڈنٹ اور اس کی زندگی کی آس ہی آس میں اس کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ جانا، معیز اکرم کا ہمیشہ کے لیے ہم سب سے جدا ہو جانا اب تک دل کو یقین نہیں آتا۔ مگر یہ سب تو مشیت الٰہی ہے۔ ہم سب کو بھی ایک دن اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

(2) : اس سال میرے مشاغل میں سر فہرست مطالعہ رہا ہے۔ جس میں ڈائجسٹ (کرن، خواتین، شعاع) پڑھنا۔ اس میں تبصرہ لکھنا، اچھی اور دینی کتب کا مطالعہ، قرآن پاک ترجمہ بمعہ تفسیر کے پڑھنا، صحیح بخاری کو پڑھنا اور سمجھنا اور سیرت النبی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ پڑھنا اور ان سب پر عمل کرنے کی کوشش کرنا میرے مشاغل میں شامل رہا ہے۔

فالتو مشغلوں میں اپنا وقت برباد نہیں کرتی اور پرسکون رہتی ہوں۔ اس سال کوئی نیا احساس، سوچ، فکر جو مجھے ملی وہ یہ کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، نہیں معلوم کہ کب زندگی کا سفر تمام ہو جائے۔

(3) : اس سال پڑھے جانے والی شعاع کے بارہ شماروں میں بہت سی تحاریر پسند کے لحاظ سے سر فہرست رہیں۔ جیسے ناول "جنت کے پتے" اور "دیوار شب" اس کے علاوہ مکمل ناول "نان بائی کی بیٹی" مئی میں شائع ہوا۔ مکمل ناول "اترن" عفت سحر طاہر، "جب ہم ملے" سائرہ رضا، "محبت من محرم" سمیرا حمید اور سب سے زیادہ ہاٹ فیورٹ ناول "دیمک زدہ محبت" صائمہ اکرم۔ جس کے سحر میں، میں اب تک گرفتار ہوں۔ پسندیدہ افسانے "بھرم" فوزیہ احسان رانا، "ایک شام کہاں آباد ہوئی" امایہ خان۔

(4) : اس سال شعاع کے جن شماروں کے ٹائٹل اچھے لگے وہ یہ ہیں۔ جنوری 2013ء، مارچ 2013ء، مئی 2013ء، اگست 2013ء، ستمبر 2013ء، اکتوبر 2013ء، دسمبر 2013ء مگر پورے بارہ شماروں میں مجھے جو ٹائٹل سب سے زیادہ پسند آیا۔ وہ دسمبر 2013ء کا ٹائٹل ہے۔ سب سے برا جو ٹائٹل لگا۔ وہ فروری 2013ء کا تھا۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل ----------	انعم
میک اپ ----------	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----------	موسیٰ رضا

بندھن

کرن خان ہمراہ علی ناصر

شاہین رشید

کرن خان سے کون واقف نہیں، بہترین ہوسٹ، بہترین اداکارہ، بہترین شیف اور بہترین شخصیت۔ دھیما اور محبت بھرا لہجہ اور صحافیوں کے ساتھ انتہائی کوآپریٹو۔ آج بندھن میں ہمارے ساتھ موجود ہیں۔

"کیسی ہیں کرن۔ اور آپ کو ہماری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے شادی کی بہت مبارک ہو۔"

"جی الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ آپ کا اور آپ کے ادارے کا۔"

"کیسی گزر رہی ہے زندگی؟"

"بہت اچھی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

"آپ کے بارے میں تو قارئین جانتے ہی ہیں۔ اپنے میاں صاحب کے بارے میں بتائیے۔"

"جی..... میرے میاں صاحب کا پورا نام "علی ناصر" ہے۔ آرمی بیک گراؤنڈ سے ہیں۔ آرمی میں بحیثیت میجر تھے... پھر ریٹائرمنٹ لے لی تھی انہوں نے اور پھر اپنا بزنس شروع کیا۔ میرے سسرالی ممبرز میں میری ساس ہیں جو کہ لاہور میں رہتی ہیں، ایک دیور ہیں۔"

"علی صاحب سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی اور کب آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے شادی کرنی

چاہیے؟"

"فیصلہ کرنے کی بات نہیں ہوتی' جو بات ہونی ہوتی ہے تو وہ ہو کے ہی رہتی ہے اور شادی کا ارادہ تو تھا ہی' کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ نہیں کروں گی مگر سب کچھ خدا پر چھوڑا ہوا تھا۔ تو سب کچھ اچانک ہی ہوا' ان سے کوئی ریلیشن نہیں تھا ہمارا' نہ کوئی جان پہچان۔۔۔ ایک دوست کے ذریعے سے ہی ان سے ملاقات ہوئی۔۔ بات ہوئی' اپنی امی سے انہوں نے بات کروائی' فیملی میں آپس میں بات ہوئی' ایک دو لوگوں سے معلوم کیا' نہ دیکھا تھا اور نہ ہی اتنا جانا تھا۔"

"آپ کی ملاقات تو اچانک ہی ہوئی ہوگی' مگر علی صاحب نے تو آپ کو ٹی وی پروگراموں میں دیکھا ہوگا؟"

"جی جی۔۔۔ بالکل انہوں نے مجھے دیکھا پسند کیا' مگر ٹی وی میں دیکھ کر نہیں کیونکہ انہوں نے مجھے کبھی ٹی وی پروگراموں میں نہیں دیکھا تھا۔ ایک ریسٹورنٹ میں ہی ملاقات ہوئی تھی' میں اپنی دوست کے ساتھ تھی وہاں .... پھر بات بھی ہوئی اور چونکہ وہ بھی یہاں کراچی میں سیٹل ہونا چاہ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ شادی بھی ہو جائے۔۔ بس پھر "فوراً" ہی بڑوں میں بات چلی گئی۔"

"مگر کوئی ایک آدھ ملاقات تو ہوئی ہوگی' کوئی انڈر اسٹینڈنگ وغیرہ وغیرہ"

"بس ایک آدھ بار ہی ملاقات ہوئی مگر اس وقت تو کچھ سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ کیا بات کی جائے۔۔۔ میں نے تو سب کچھ اپنے اللہ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔"

"شادی کے پہلے تجربے کے بعد کوئی ڈر خوف تھا کہ کیا ہوگا' کیسے ہوں گے۔"

"بہت۔۔۔ بہت ڈر خوف تھا۔۔۔ بہت ساری باتوں کے بارے میں سوچنا تھا۔ پریکٹکلی جو چیزیں ہوتی ہیں ان کے بارے میں بات کی' کام کے حوالے سے بات کی کہ جاری رکھوں گی تو انہوں نے ساری باتوں کو سمجھا اور کہا کہ ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"علی صاحب کی بھی تو پہلے شادی ہوئی ہوگی؟"

"جی جی۔۔ بالکل۔ طلاق ہو گئی تھی اور بچے نہیں ہیں ان کے۔"

"آپ کا بیٹا ماشاء اللہ کتنا بڑا ہو گیا ہے اور اسے کوئی اعتراض تو نہیں تھا؟"

"میرا بیٹا ماشاء اللہ سولہ سال کا ہے اور ٹین ایجرکی زندگی تو بالکل مختلف ہوتی ہے وہ اپنی دنیا میں تھوڑے مگن ہی رہتے ہیں۔ تھوڑا ساری ایکشن ہوا مگر پھر سیٹ ہو گیا۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی یا سادگی کے ساتھ؟"

"ارے نہیں۔۔۔ بہت سادگی کے ساتھ ہوئی سب بڑے بڑے شریک ہوئے' نکاح رخصتی ایک ہی دن ہوئی نہ بھاری جوڑا' نہ ہیوی میک اپ' لاہور سے انہوں نے اپنی امی کو بلوایا ان کے تھوڑے سے رشتے دار تھے ادھر ہماری طرف سے بھی میرے بڑے تھے۔ کزنز اور دوست کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت ہی سادگی سے سب کچھ ہوا۔"

"اور خواتین کتنی بھی بہادر ہو جائیں مگر ان کی زندگی ایک لائف پارٹنر کے بغیر ادھوری ہے' کیا ایسا ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے اور بہت ضروری ہے زندگی میں لائف پارٹنر کا ہونا' زندگی سیکیور ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر علی ناصر کو شادی کے بعد کیسا پایا؟"

"الحمد للہ اچھا پایا۔۔ سیکیورٹی ملی ہے اور یہ بات میرے لیے بہت بلیسنگ ۔۔۔ ہے اور اب ہم ایک دوسرے کو تھوڑا بہت جان بھی گئے ہیں کیونکہ شادی سے پہلے تو ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔ تو ماشاء اللہ کافی کوآپریٹو ہیں یہ کوئی رکاوٹ یا پابندی نہیں ہے میرے کام کے سلسلے میں اور میرے کہیں آنے جانے پر۔"

"گھر ڈسٹرب تو نہیں ہوتا؟ اور بزنس کے سلسلے میں کہیں جاتے ہیں تو آپ ساتھ جاتی ہیں۔"

"نہیں گھر ڈسٹرب نہیں ہوتا اور انہیں بزنس کے سلسلے میں کراچی سے باہر کبھار و تک جانا ہوتا ہے جہاں ان کا فارم ہاؤس ہے تو کبھی کبھار میں بھی ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

"12 ستمبر 2013 یہ شادی کی ڈیٹ ہے گویا چار ساڑھے چار ماہ ہوئے ہیں تو مزاج کا کیسا پایا آپ نے میاں صاحب کو؟"

"مزاج کا اچھا پایا' غصے کے تیز نہیں ہیں ابھی تک تو غصہ نہیں دیکھا۔ کافی انڈر اسٹینڈنگ ہیں اور بہت میچور سوچ ہے ان کی اور کھانے پینے کے شوقین ہیں خیر میں تو کوکنگ کرتی ہوں۔ یہ خود بھی بہت اچھی کوکنگ کرتے ہیں شکار کا بھی انہیں شوق ہے ۔ میں ایک دو بار ان کے ساتھ شکار پر بھی گئی تھی۔"

"یہ چاہتے ہیں کہ ایک روایتی بیوی کی طرح تم ان کے سارے کام کرو؟"

"ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں کہا انہوں نے' لیکن ہم بنیادی طور پر ہیں تو مشرقی عورتیں' مشرقیت بھری ہوتی ہے کوئی کہے نہ کہے ہم خود ہی ہر کام کر دیتے ہیں اور خود وہ بھی بہت اچھے ہیں کبھی کبھی مجھے ناشتا بھی بنا کر دے رہے ہوتے ہیں علی بہت براڈ مائنڈڈ ہیں اور ابھی تک تو انہوں نے آرڈر دے کر مجھ سے کوئی کام نہیں کروایا۔"

"علی صاحب کی کوئی بات جو آپ کو بری لگتی ہو؟"

"بس انہیں صفائی کا شوق نہیں ہے بالکل بھی۔ جیسے مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ ادھر چیزیں پھینک دیں ادھر پھینک دیں وہ والی عادت ہے ان میں اور مجھے ان باتوں سے الجھن یا غصہ نہیں آتا شاید اس لیے کہ میرے بیٹے کی بھی عادتیں کچھ ایسی ہی ہیں تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا چیزیں ٹھکانے لگانے میں۔"

"ماشاء اللہ آپ ایک سیلبریٹی ہیں تو جب "ان" کے ساتھ جاتی ہیں لوگ آپ کو پہچان لیتے ہیں تو میاں صاحب گھبراتے ہیں؟"

"نہیں نہیں' بالکل نہیں گھبراتے بلکہ ان کو اچھا لگتا ہے' لوگ آتے ہیں تعریف کرتے ہیں تصاویر بنواتے ہیں تو یہ کچھ نہیں کہتے بلکہ انہیں اچھا لگتا ہے انجوائے کرتے ہیں اور بہت کم گو ہیں ان باتوں کو اتنا محسوس نہیں کرتے لیکن ویسے ان میں حس مزاح بہت ہے شعر و شاعری سے بہت لگاؤ ہے کتابیں پڑھنے کا بھی شوق ہے اور۔۔۔ بس۔۔۔"

"محبت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا ہے یا کمی آتی ہے؟"

"میرے خیال میں دونوں چیزیں ہو سکتی ہیں۔ بہت سی لو اسٹوریز کو ختم ہوتے دیکھا ہے اور شادی ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہت سے ارینج میرج میں محبت کو بڑھتے ہوئے دیکھا ہے تو ایسا ہوتا ہے اور شادی تو ایک جوا ہے کامیاب بھی اور ناکام بھی۔۔۔"

"فضول خرچ کون ہے؟"

"میں ہوں۔ یہ بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہیں بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں۔ بہت دیکھ بھال کر چیزیں خریدتے ہیں' میں اپنے آپ کو فضول خرچ تو نہیں کہوں گی مگر یہ ضرور کہوں گی کہ میں خرچ کرتی ہوں اور بہت زیادہ حساب کتاب نہیں رکھتی اور نہ ہی زیادہ سوچتی ہوں۔ مجھے ہی گھر کو سجانے سنوارنے کا شوق بھی ہے۔"

"جوائنٹ فیملی ہے؟"

"نہیں جی۔۔۔ الگ ہی رہتے ہیں۔ امی جی یعنی میری ساس لاہور میں رہتی ہیں اور بہت محبت کرتی ہیں' میرے میاں سے زیادہ میری ساس مجھ سے محبت کرتی ہیں۔" (ہنستے ہوئے)۔

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟"

"منہ دکھائی میں سونے کا بریسلٹ اور ہنی مون کے لیے ابھی تک تو کہیں نہیں گئے اور ان شاء اللہ جلدی جائیں گے اور ضرور جانا چاہیے ہنی مون پر' کیونکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آپ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ یہاں

جانا ہے یا وہاں جانا ہے تو ہنی مون میں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کافی ٹائم مل جاتا ہے۔"

"نہیں ہوٹلنگ کا شوق ہے یا گھر کا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

"پہلے جب یہ اکیلے رہتے تھے تو ہوٹل کا ہی کھانا کھاتے تھے مگر اب شادی کے بعد انہیں گھر کا کھانا اچھا لگتا ہے' لیکن انہوں نے کبھی فرمائش کر کے نہیں پکوایا جو میں پکا دیتی ہوں کھا لیتے ہیں اور شوق سے کھاتے ہیں۔"

"آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں ٹی وی کے حوالے سے؟"

"آج کل مصالحہ ٹی وی کے لیے کام کر رہی ہوں اور کبھی کبھی مارننگ شو والے بہ حیثیت گیسٹ کے بلا لیتے ہیں تو چلی جاتی ہوں ویسے میرا تو اپنا ہی کام ہوتا ہے۔"

"آج کل مارننگ شو میں شادی بیاہ کے پروگرام تواتر کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں کیسے لگتے ہیں آپ کو؟"

"اچھے مقصد کے لیے ہوں تو اچھے لگتے ہیں اور ویسے بھی آپ چینل پہ بیٹھ کر کتنی ـــ سنجیدہ باتیں کریں گے۔ بریک دینے کے لیے یہ پروگرام ہوتے ہیں اور ہمارے عوام دیکھنا بھی چاہتے ہیں تو چینل والے دکھاتے بھی رہتے ہیں۔"

"علی صاحب فیشن پسند ہیں یا سادگی پسند ہیں؟"

"بالکل بھی فیشن پرست نہیں ہیں بہت سادگی پسند ہیں' میں ان کو بغیر میک اپ کے اچھی لگتی ہوں اور ڈریسنگ کچھ بھی کرلوں انہیں اچھی ہی لگتی ہوں۔ چاہے شلوار قمیص ہو' جینز ہو کوئی پابندی نہیں ہے کہ یہ نہ پہنو وہ نہ پہنو وغیرہ وغیرہ۔"

"بیٹا ساتھ ہی رہتا ہے؟ کیا بنانے کا ارادہ ہے؟"

"جی بیٹا ساتھ ہی ہے ماشاء اللہ سے اور "اے لیول" میں پڑھ رہا ہے اور کیا بنانا ہے یہ میرا کام نہیں ہے میرا کام تو اچھی تعلیم دینا ہے اب جو اس کا دل چاہے وہ بن جائے بس ماں کی تو اتنی ہی خواہش ہوتی ہے کہ کامیاب رہے زندگی کے ہر موڑ پر۔"

"آپ چاہیں گی کہ وہ شوبز کی فیلڈ میں آئے۔"

"اس کا شوق میتھ' اکاؤنٹ اور فنانس کی طرف ہے میرا نہیں خیال کہ وہ میری فیلڈ میں آئے گا وہ اپنی مرضی سے فیلڈ کا انتخاب کرے گا۔"

"آج کل آپ ڈراموں میں نظر نہیں آرہیں؟"

"میرا میاں مجھے چھیڑتا رہتا ہے کہ آپ لائف میں جو ڈرامے کر رہی ہیں تو پھر ٹی وی ڈرامے کی کیا ضرورت ہے۔" قہقہہ۔ "خیر یہ تو مذاق کی بات' مگر مسئلہ سارا ٹائم کا ہے۔ ڈرامے میں بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔ روزانہ جانا آنا روز کام کرنا۔ سچی بات ہے کہ اب میں مسلسل کام سے تھک جاتی ہوں پھر مجھے اپنی لائف ادھوری لگ رہی ہوتی ہے کہ دوسروں کے لیے تو ٹائم دور کی بات ہے اپنے لیے بھی ٹائم نہیں ملتا۔ ویک اینڈ پہ کام بھی کرتی ہوں اور اپنی زندگی بھی سکون کے ساتھ گزارتی ہوں۔ کم کماؤ مگر اپنی زندگی کو انجوائے بھی کرو۔"

"وہ لوگ جن کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی' ان کے لیے کوئی نصیحت کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟"

"نہیں۔ ایسا کچھ خاص تو کہنا نہیں چاہوں گی۔ اپنے میاں کی ایک بات ضرور کوڈ کرنا چاہوں گی' وہ کہتے ہیں کہ "انسان شادی کرتا ہے زندگی کو بہتر بنانے کے لیے تو اس سوچ کے ساتھ شادی کریں اور وہ باتیں اور وہ کام کریں جس سے آپ کا ریلیشن شپ بہتر ہو' زندگی بہتر ہو۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں' لیکن پیار کو اور عزت کو اپنی جگہ سے نہیں ہلنا چاہیے۔"

"آپ اور آپ کی بہن امبر دونوں ماشاء اللہ بہت اچھی پرفارمر ہیں۔"

"بس اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں اور میرے بھائی ڈاکٹر ہیں اور ای این ٹی اسپیشلسٹ ہیں پھر امبر ہیں اور میں آخر میں ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے کرن خان سے اجازت چاہی۔

لہو رنگ فلسطین

مصنف: سلمیٰ اعوان
تبصرہ: آمنہ ذہین

مسلم اُمہ خود کو ایک وجود سمجھے یا نہ سمجھے۔ دشمن کا ہدف اس کو یکجائی کے حسن و ادراک سے محروم رکھنا ہی ہے اور ایک طویل عرصے سے دشمن اپنے ہدف کو کامیابی سے پورا کرنے میں مصروف عمل ہے اور یہ طویل عرصہ مسلم اُمہ کے لیے غم کی طویل رات ہے۔ جس کی سحر ہونے کی بس امید ہی باقی ہے۔ آثار ابھی تک نمودار نہیں ہوئے۔

جغرافیائی طور پر علاقوں سے دوری وابستگی کو کسی طور کم نہیں کرتی۔ البتہ معاملات سے کم آگاہی کا امکان ضرور رکھتی ہے۔ کفن میں لپٹی معصوم بچوں کی لاشیں گولیوں کی بوچھاڑ کے جواب میں پتھر اچھالتے نوجوان۔۔۔ راستہ روکے اسرائیلی فوجیوں سے الجھتی فلسطینی عورتیں۔۔۔ تباہ شدہ گھروں کے ملبے پر بیٹھے افسردہ فلسطینیوں کی تصویریں دیکھنے کی عادی ہماری آنکھیں۔۔۔ درد کے گہرے احساس سے مشروط ہی سے بھی مانوس ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے موجودہ حالات کو ماضی کے تناظر میں پیش کرنے کے لیے "لہو رنگ فلسطین" سلمیٰ اعوان کی بہترین کاوش کے طور پر یاد رکھے جانے کے لائق ہے۔ ان کے معتدل مزاج قلم نے انتہائی ذمہ داری سے یہودیوں اور مسلمانوں کے تاریخی جھگڑوں، اسباب اور نتائج کا بہ نظر غائر جائزہ لیا ہے اور دونوں طرف کے انتہا پسند اور اعتدال پسند نظریات کو مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس طرح کہ ایک عام آدمی کا فہم اس احساس میں خود کو شریک سمجھ سکے جو اپنا وطن گھربار غاصبانہ قبضے میں دیکھ کر ہر فلسطینی کے دل میں رستے ہوئے زخم کی طرح جاگزیں ہے!

اکیس ابواب پر مشتمل یہ کہانی تین نسلوں کے ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرتی ہے۔ یائل اور منصور کے بچپن سے شروع ہونے والی اس کہانی کا انجام ان کے بچوں میں منتقل ہونے والی وطن پرستی، مشکل مگر امید بھرے راستے پر چلتے رہنے کی دھن، منتقل ہونے کا خوب صورت پیغام چھوڑتی ہے!

جرمنی سے نکالے جانے کے بعد فلسطین میں یہودی آبادکاری کے نتیجے میں آنے والی یائل، پرڈینا کی بیٹی ہے جو حادثات میں اپنے پیاروں کو کھو چکی ہے۔ یوسف ضیا، منصور کے دادا سے ان کی پرانی سلام دعا ہے۔ مصیبت کے وقت کام آنے کی عادت نے رواداری اور محبت و یگانگت کو پنپتے رہنے کا موقع دیا اور قدرتی طور پر یائل اور منصور ان کہے، ان دیکھے تعلق میں بندھتے چلے گئے، مگر یہ کہانی ذہنی غلامی سے مبرا، آزاد ذہنوں کی فکر نو کی کہانی ہے۔ جنہوں نے اپنے وطن، اپنے لوگوں کی محبت میں اپنی انتہائی ذاتی خوشیوں کو خوشی خوشی قربان کردیا۔

"تمہاری میری شادی تو ایک دھماکا ہوگی۔ سو، پچاس، دو سو یا تین سو یا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ فلسطینی جانوں کے نذرانے پر؟ کیا ہم اسے ہضم کرسکیں گے۔ اگر ہم باہر چلے جاتے ہیں تو میرا اور تمہارا فلسطین آنا جانا ہوجائے گا۔ کیا میں اسے برداشت کرسکوں گا؟ نہیں۔۔۔ محبت کی اتنی بڑی قیمت دے کر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ فلسطین لہو کی طرح میری رگوں میں گردش کرتا ہے۔"

یہ اس معاشرتی شعور کا بہت خوب صورت پہلو ہے کہ ہمارے ہاں شادی اور خواہشات سے دستبرداری چونکہ جبر کا نتیجہ ہوتی ہے، لہٰذا وہ پژمردگی اور انتشار کو جنم دیتی ہے، مگر وہاں شعوری فہم نے توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔۔۔!

دیکھیے منصور کا حساس شعور۔

"ہم فلسطینی تو بڑی بے خانماں سی قوم بن چکے ہیں۔ ہم کسی کی ترجیح نہیں۔ اب یہ لڑائی تو خود ہمیں لڑنی ہے۔ ہاتھوں میں امن کے جھنڈے پکڑ کر یا بندوقیں اٹھا کر۔ وقت کا انتظار کہ شاید اس کے دامن سے ہمارے لیے محبت اور امن کے پھول گر جائیں۔ تمہیں میں نے اسی لیے بلایا تھا کہ تمہیں اس کرب سے نکالوں۔"

اور منصور نے میڈیکل کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یائل نے بھی چپ چاپ والدین اور مسلک کی رضامندی اختیار کرلی۔۔۔ مگر بغیر کسی رنجش اور خفگی کے۔۔۔!

منصور اور یائل کے خیالات سے آگاہی ہمیں ان کے خطوط کے ذریعے ملتی ہے، جو وہ باقاعدگی سے ایک دوسرے کو لکھتے ہیں۔

پڑھتے ہیں یائل کا ایک خط۔۔۔

"انسانی رویوں کے تضادات اب بھی ہمیشہ کی طرح مجھے بہت متاثر کرتے ہیں اور میں اپنے بچپن کی طرح اب بھی مما کے سمجھانے کے باوجود خاموش رہنے کے بجائے ان پر خوب بولتی ہوں۔ گزشتہ دنوں میری پھوپھی پولینڈ سے یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔ مغربی یروشلم کی ماملا کالونی میں انہیں گھر ملا ہے۔ وہی ماملا جہاں یروشلم کے مسلمانوں کا قدیمی تاریخی قبرستان تھا۔ بے شمار علماء اور صوفیاء سے بھرا ہوا۔ جن پر بلڈوزر چلے اور شان دار بستی تعمیر ہوگئی۔

ممی، ڈیڈی تو خیر بڑے لبرل اور سیکولر لوگ ہیں۔ پر ہماری پھوپھی جن کا ایمان اس بات کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ دنیا بھر کے یہودیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ارض موعود پر یورش کریں۔ یہ ان کے باپ، دادا کی میراث ہے اور جب میں نے ان سے بحث کرنا چاہی تو انہوں نے تین ہزار سال پرانی تاریخ کا میرے سامنے ڈھیر لگادیا۔"

اب جانیے انتہا پسند یہودی موقف۔

"ارے یہ فلسطین کب ہے؟ یہ تو کنعان ہے۔ ہم اسرائیلی جنہیں یہ فلسطینی عبرانی کہتے ہیں، یہ تو مسیح سے بھی کہیں پہلے آکر آباد ہوئے تھے۔ کتنا دربدر پھرے ہم۔ کس کس قوم نے ہماری نسل کشی نہیں کی؟ صدیوں پر پھیلی تاریخ کھول کر دیکھ لو۔ نہری دوم اور سوم نے ہم سے لاکھوں پونڈ بھی لیے اور ہمارے ماتھے پر شناخت کا ٹیکا لگوا کر ہمارا عام لوگوں کے ہاتھوں پیڑا بھی رکوایا۔ یہی اس کمینے فرانس کے شاہ فلپ نے بھی کیا۔ یہودیوں کو جیلوں میں بھی ٹھونسا، ان سے پیسہ بھی لیا اور انہیں دیس بدر بھی کیا۔ جرمنوں نے سب ہی کو مات دے دی۔ ان کے عیسائی پادری تو حلفاً" یہ اقرار کرواتے

"میں نجس یہودی ہوں۔ میرے آباء نے سچے مسیح کو صلیب پر چڑھایا۔"

اب سنیے وہ امتیازات جن کی بنا پر یہودی خود کو افضل سمجھنے کا حق فائق سمجھتے ہیں۔

"کاروباری فراست ہماری قوم کو قدرت نے ودیعت کی ہے۔ جوڑ توڑ اس کی گھٹی میں ہے غیر معمولی ذہانت و فطانت یہودی قوم کے انعام ہیں۔ من و سلویٰ جیسا تحفہ بھی یہودی قوم کے لیے ہی آسمانوں سے اترا۔ اب قومیں جلتی ہیں تو بھئی جلو۔ سچ تو پھر یہی ہے کہ ہم ہیں ہی خدا کے لاڈلے۔"

تمام خوبیاں سچ ہیں۔۔۔ مگر ان پر اترانے کا فعل یہودیوں کا پسندیدہ اور قدیم شوق ہے!

یائل کے جوابی دلائل۔

"حقیقت یہ ہے یروشلم تو نہ آپ کا ہے اور نہ مسلمانوں کا۔ ہاں آپ اسے عیسائیوں کا کہہ سکتی ہیں۔ یہودیت نے صحرائے سینا میں جنم لیا۔ اب کوہ صیہون کیسے مقبرہ ہوگیا؟ کوہ سینا کیوں نہیں جہاں کتاب ملی اور خدا سے کلام بھی یہیں ہوا۔ مسلمانوں کا

تو براہ راست تعلق حجاز سے ہے۔ بس ایک یاد کا واسطہ ضرور ہے۔ البتہ عیسائیت یہاں پیدا ہوئی۔

منصور! مجھے تو دکھ کے ساتھ ہنسی بھی آتی ہے۔ تین مذاہب کے پیروکار جن کے دین انہیں پہلا سبق انسان سے محبت کا دیتے ہیں اور وہ ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور ایک دوسرے کا تخم مارنے میں جی جان سے مصروف ہیں۔"

یائل کے جوابی ولائل نے پھپھی کو مشتعل کر دیا' دہریہ قرار دے کر انھوں نے سارا الزام ماں کی تربیت پر ڈال دیا۔

پڑھیے منصور کا ایک خط!

"صرف ایک اعلان فوری قانون اور مسلم علاقہ بلڈوزروں کی نذر... حرم شریف کی املاک' البراق سارا جعفری محلہ اور باب سلسلہ کے سامنے کا علاقہ اسی زور زبردستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔"

ان کا اہم ترین ٹارگٹ یروشلم کے چہرے سے عرب خدوخال کو نوچ ڈالنا اور اسے نئی صورت دینا ہے۔ انسان کتنا وحشی ہے اس کے ہاتھ میں طاقت آجائے تو یہ آپ میں ہی نہیں رہتا۔ کیا یہ اس رد عمل کا نتیجہ ہے کہ زمانوں کی تپیاں اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے بعد کہیں غالب آنے اور اسی تاریخ کو دوہرانے کا موقع تو ملا ہے۔ شہر تباہ کے اس دروازے سے منہ زور فوجیوں کا ایک اور دوسری جانب باب دمشق سے دوسرا ریلا بندوقیں لہراتا ہوا اندر داخل ہوا ہے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ 2000 سال بعد یہ وقت انہیں نصیب ہوا۔"

"دراصل انسانی فطرت کا یہ المیہ ہے کہ لمحہ موجود میں جو کامیابی اس کے حصے آتی ہے اس کے خیال میں وہ صرف اسی کا مقدر ہے۔ یائل مجھے تو اس کی بھی سمجھ نہیں آرہی ہے کہ چلو غلبے کی جبلت انسانی فطرت میں ہے لیکن کیا غالب آنے والوں کے لیے بربریت اور وحشی پن کے مظاہرے ضروری ہیں؟

ہاں ایک بات اور بھی ہے کہ بہرحال اس کامیابی کے لیے محنت کی گئی۔ بہترین تربیت' بہترین منصوبہ بندی' سخت جفاکشی اور دعائیں... قدرت کے فیصلے میرٹ پر ہوتے ہیں۔ انفرادی معاملات میں اس کی عنایات ٹل سکتی ہیں' مگر اجتماعی معاملات میں نہیں۔

اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نما سینائی' غزہ کی پٹی' شام سے گولان کی پہاڑیاں' اردن سے ویسٹ بینک اور مشرقی یروشلم سب اپنے قبضے میں لے کر تقریباً" ساڑھے تین لاکھ لوگوں کو پناہ گزین بنا دیا ہے۔"

ان ہی خطوط میں تاریخ کے اوراق کھلتے ہیں اور حقائق بتائے جاتے ہیں!

یائل اور منصور کے علاوہ ابراہم ایلان جو پیشے کے اعتبار سے دیانت دار صحافی اور سیکولر یہودی تھا' کے ذریعے ہم اس ایشو پر سیاسی محاذ آرائیوں' جنرلز اور راہنماؤں کی حقیقت جانتے ہیں۔ صحافی تجزیہ کر سکتے ہیں' صورت حال کو قابو کرنا یا غلطی سے روکنا ان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ایسے ہی اس کے ذریعے ہم جانتے ہیں

"وقت اور مصلحت کی فراست یاسر عرفات میں نہیں ہے۔ اردن ایجنٹ ہے برطانیہ اور امریکا کا۔ آخر اس سے الجھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ شامی حکومت بھی شہ دے رہی تھی کہ موقع مت گنواؤ۔ اردن پر قبضہ کرو۔ اب 3000 فلسطینی مروا کر لبنان منتقل ہونا پڑا ہے۔ ہزار منتوں سے کہیں لبنان میں پاؤں دھرنے کی جگہ ملی۔ یو این او نے بڑے بڑے کیمپ صابرہ اور شتیلہ بنا دیے ہیں۔ ایک دن ان پر بھی بمباری ہوگی اور اس آگ میں خواب' آرزوئیں اور خواہشیں سب جل کر راکھ ہو جائیں گی۔"

یائل اور ابراہم ایلان کی شادی فقط پندرہ سال کا سفر طے کر سکی... کہ بے باک اور بہادر صحافیوں کو قتل کروانا دنیا بھر میں رائج ہے!

فلسطینی تہذیب میں رچے بسے منظر' شادی کی رسوم' کھانے اور ان کی دریا دلی کہاں کہاں آپ کی آنکھیں نم کرتی ہے... یہ صرف آپ کو پتا ہے!

یائل کے گھرانے سے روز مرہ کی مذہبی رسومات' شادی کے طور طریقے ہمیں یہودی کلچر سے آگاہ کرتے ہیں' جو بہر طور دلچسپی کا باعث ہے۔ عبرانی میں خالہ' چچی کو ڈھوڈا اور نانی دادی کو کار میلا سپوتا کہتے ہیں اور اسی طرح دیگر مقدس مقامات' رسومات اور ان کی تاریخ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں!

ناول نگار کو اس بابت نہایت تحقیق اور جستجو کرنا پڑی ہوگی' جس کے لیے وہ لائق تحسین ہیں!

چلیے کچھ منظر دیکھتے ہیں۔

"اوائل ستمبر کی سہ پہر کے سورج کی سونا بکھیرتی روشنی میں درختوں کے جھرمٹوں میں گھرے گھر نگینوں کی مانند لشکارے مارتے تھے۔ پہاڑی چٹانوں سے پھوٹتے چشموں اور پہاڑی ڈھلانوں پر زینہ در زینہ پھیلے کھیتوں پر فصلوں کا پھیلاؤ جیسے کسی نے بڑے عالیشان محل تک جانے کے لیے سیڑھیوں پر قالین بچھا دیے ہوں۔ ضالیہ بتاتی تھی چشموں سے پھوٹنے والا یہ پانی کاریزوں کی صورت میں پورے نابلوس شہر کو زندگی دیتا ہے۔"

آپ ایک گھر کا حسن دیکھیے۔

"اس کا تعمیراتی حسن قدامت وجدت کے رنگوں کے ساتھ مرعوب کرتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سفید اور سرخ چھتوں والے ان کے ملازمین کے گھروں کے جھرمٹ' وسیع و عریض لان' زیتون' کھجور' سنگتروں اور خوبانی کے پیڑوں سے سجے پائیں باغ۔ گھر کیا تھا' رنگوں میں لشکارے مارتا' خوشبوؤں میں بسا' ہریالیوں میں تیرتا اور مصنوعی آبشاروں میں بھیگتا آنکھوں کو کسی ارضی جنت کا سا تاثر دیتا تھا۔"

دکھاتے ہیں آپ کو ایک سجا ہوا دسترخوان۔

"پیتل کی بڑی پلیٹ میں گوبھی کے پھول' بینگن کے قتلے' گاجروں کی قاشیں' توریوں کی پھانکیں عمدگی سے فرائی ہو کر سجی تھیں۔ پودینے اور سلاد کے پتوں کے ساتھ ہر سبزی اپنی اصلی رنگت کے ساتھ بہار دکھاتی تھی۔ دوسری پلیٹ میں سبزیاں اچار میں بنائی گئی تھیں۔ چاندی کی بڑی سی ڈش' جس کی کندہ کاری بغدادی کاریگروں کی مرہون منت تھی۔ مقلوبے سے سجی تھی۔ قبیلے کی صورت لیے چاولوں اور گوشت کا یہ چوکور پہاڑ بھی اپنی صورت گری میں ایک انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ سب ہی سینی کے گرد بیٹھے تھے۔"

اپنے وطن میں رہ کر اپنے گھربار' اپنے شہروں سے دستبرداری کیسا تجربہ ہے؟

کیسا درد والم ہے جو فلسطینیوں کے مقدر میں ٹھہرے ہوئے وقت کی طرح لکھ دیا گیا ہے؟

"یہ میرا حیفہ ہے یہ میرے پرکھوں کا حیفہ۔ یہ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فتح یاب ہونے والا خوب صورت شہر' صدیوں سے عرب تہذیب و تمدن کا عکاس۔ اس نے کیسے ہم سے آنکھیں پھیرلی ہیں؟ یہ کیسے غیروں کا بن گیا ہے؟ ہمارا تو اب یہاں رہنا ایسے ہی ہے جیسے بھوکے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے لاغر' بے بس اور مریل سے بھیڑ بکریوں کے بچے جن پر وہ بہانے بہانے سے جھپٹتے ہیں۔"

یہ منصور کی دادی سارہ' اپنے علاقے کو دیکھ کر افسردہ ہو رہی ہیں!

سارہ کے شوہر یوسف ضیا یروشلم کے میئر تھے' جنہیں ان کے گھر میں گھس کر گولیوں سے بھون دیا گیا جبکہ وہ مطالعے میں مشغول تھے... گھر کے تمام ملازمین سمیت! حالانکہ وہ نہایت پرامن سیاسی کیریر رکھتے تھے!

وقت نے بدلنے کا عہد کیا ہو یا نہ کیا ہو... نہ ٹھہرنے کا ضرور کر رکھا ہے... سو وقت گزر تا گیا اور منصور کامیاب ہارٹ سرجن بن کر اسپتالوں کے ساتھ اپنے کٹے پھٹے ہم وطنوں کی خدمت میں حاضر رہا... اور یائل نے بھی ابراہم کے قتل کے بعد امریکا سے وطن واپسی اختیار کی۔

ڈاکٹر منصور کی بیٹی ایمان نوعمری کے جذبات کی یورش سے مغلوب فدائی بننا چاہتی ہے۔ ایسے میں اپنے والد کی وساطت سے اس کی ملاقات شہرہ آفاق شاعر محمود درویش سے ہو جاتی ہے... ہم ان کی خوب صورت نظموں اور خیالات تک رسائی پاتے ہیں۔

"لفظ لکھو فلسطینیوں کے متحد ہونے کے لیے...

ہر نظریے اور ہر سوچ سے اوپر اٹھانے کے لیے۔ لفظ لکھو دنیا کو بتانے کے لیے۔۔۔ ان کا سویا ہوا ضمیر جگانے کے لیے۔۔۔ لفظ لکھو ذہنوں کو متاثر کرنے کے لیے۔ تمہارا بس یہی کام ہے۔"

اور ایمان نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ کا سفر اختیار کرلیا۔۔۔ جہاں اس نے تحقیق' رابطہ رکھنے' چندہ جمع کرنے' مضامین لکھنے' احتجاج کرنے اور اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھانے میں پانچ سال کا وقت گزارا۔۔۔

ڈاکٹر بشار البشر سے ملاقات بھی ان ہی مصروفیات کے دوران ہوئی۔ جو تارک وطن 'اعلا تعلیم یافتہ اور خداداد مسیحائی طاقت سے سرفراز تھا۔ کوئی فلسطینی ایسا ہوگا کہ جس کا دل آبلہ پائی کے سفر کا گواہ نہ ہو؟

بشار البشر بھی ایک ایسا ہی فلسطینی تھا!

اس کی انگلیوں میں معجزاتی طور پر بیماری تشخیص کرنے کی صلاحیت تھی اور اپنے پیشے سے دیانت دارانہ وابستگی اسے یہودیوں کا علاج کرنے سے بھی نہیں روکتی تھی۔ مہذب' سادہ دل بشار کو بھی کسی لاپروا گولی کا نشانہ بنا دیا گیا جبکہ ایمان کے ساتھ اس کی شادی کو چند ماہ ہی گزرے تھے۔

مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گھرنا انسان کو قدرتی سا عمل لگتا ہے۔۔۔ مگر دوام کسی چیز کو نہیں۔۔۔

ایسی ہی غم زدہ کیفیت میں ایمان' دمشق میں صلاح الدین ایوبی کے مزار پر چلی گئی۔

احاطے سے اندر گیا آئی جیسے اس کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔

صلاح الدین! تم سو رہے ہو' تم نے کب تک سوتے رہنا ہے؟ تم تب بھی سو رہے تھے جب مال غنیمت کے طور پر فرانس کو ملنے والے ملک شام کا ایڈمنسٹریٹر دمشق میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے تمہارے مزار پر آیا تھا۔ اس نے اپنا جوتا کھینچ کر مزار پر مارا تھا اور بلند آواز سے کہا تھا۔

"صلاح الدین ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔ دیکھو ہم نے سبز ہلالی پرچم کو سرنگوں کردیا ہے۔ صلیب ایک بار پھر بلند ہے۔ دیکھو بہت سولیا' اٹھ جاؤ۔ جانتے ہو فلسطین کے بیٹے اور بیٹیاں کتنی بے آبرو ہوگئی ہیں۔"

اور بہتا ہوا نمکین سیال آپ کو بھی اس بے بسی میں شریک کرلیتا ہے کہ یہ درد مشترک ہے!

شامیش ابراہیم۔۔۔ جو یہودی رسمی تعلیم پانے کے دوران انتہا پسند نظریات کا حامل ہوچکا تھا۔۔۔ مگر نانا' نانی اور ماں باپ کے ذہنی ورثے نے خود بخود اسے دوسرا راستہ بھی دکھا دیا اور وہ بہترین راستے پر چپ چاپ گامزن ہوگیا۔۔۔ شامیش مسلمان ہوچکا تھا!

ایمان کے ساتھ وابستگی کو سب سے چھپائے ہوئے۔۔۔!

زندگی کو سمجھوتوں کے ساتھ بسر کرنا' نظام کو رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔۔۔ سو۔۔۔ پھر یائل نے ایمان کی زندگی کو غم کے گہرے اندھیرے سے نکالنے کے لیے۔۔۔ ابراہیم کو شریک سفر بنانے کے لیے قائل کرلیا اور غم زدہ یادوں کو دفن کرکے' ایمان نے اپنے پیاروں کی زندگی سے کرب کا کانٹا نکال دیا۔۔۔

اور یائل نے کہا "ایمان! میں بہت تھک گئی ہوں تمہارے اور ابراہم کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ بہت تنہائی اور سناٹا جھیلا ہے میں نے۔۔۔"

اور فلسطین کے کچھ لوگوں کی زندگی میں جھانکتی کہانی اپنے امید بھرے پیغام کے ساتھ انجام کو پہنچی۔۔۔

اگر آپ اخبار کے قاری ہیں۔۔۔ تو فلسطین کے حوالے سے چھپنے والی تصویریں اب زیادہ بامعنی ہو جائیں گی۔۔۔

خوشگوار معلومات میں سے یہ کہ زندہ ضمیر کسی بھی معاشرے کا اثاثہ ہوتے ہیں اور وہ بلالحاظ مذہب' جنس' قوم لائق تحسین ٹھہرتے ہیں۔۔۔ نوم چومسکی جیسے یہودی۔۔۔ جنہوں نے حق گوئی کو شیوہ بنایا اور خود اسرائیل سے' ریاست مخالف آوازوں کا اٹھنا۔۔۔ دنیا کے لیے جرات اور امید کا پیغام ہے!

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا" کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتہذیبی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اُسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی

ہوجاتا ہے۔فارہ دل سے خوش نہیں ہوپاتی۔عزت، تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ماورا عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہوجاتی ہے۔عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کردیتی ہے۔ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

ساتویں قسط

انہوں نے ایک دم جھٹکے سے سر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی ماورا کی طرف دیکھا تھا اور یوں دیکھا تھا جیسے اس کی دماغی حالت پہ شبہ گزرا ہو۔

"ماورا... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہارے ہوش و حواس ٹھکانے پہ تو ہیں نا؟" بی گل نے اپنے شک کا اظہار بھی کردیا تھا۔

"میرے ہوش و حواس بھی ٹھکانے پہ ہیں اور میری عقل بھی ٹھکانے پہ ہے، یہ جھوٹ نہیں ہے اور نہ ہی یہ مذاق ہے، یہ ایک سچ ہے، میری زندگی کا حیران کن سچ، جس کا مجھے خود بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر پھر بھی قدرت کا ایک تلخ اور سنگین اتفاق سمجھ کر یقین کرنا ہی پڑا اور اس حقیقت کو ماننا پڑا کہ دنیا واقعی گول ہے۔ زندگی میں ایک بار ہر چیز گھوم کر انسان کے سامنے آہی جاتی ہے اور انسان اس اتفاق پہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔" ماورا کے لب و لہجے میں تلخی اور بلا کی سنجیدگی تھی۔

مگر بی گل اس سچ اور اس حقیقت کو اتنی آسانی سے کیسے قبول کرلیتیں؟

"ملی کہاں ہو؟" اب وہ تفصیل کی طرف آئی تھیں۔

"اپنی دوست فارہ کے گھر۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"وہ فارہ کے گھر کیسے آیا؟" بی گل کی الجھن سلجھ نہیں رہی تھی۔

"وہ فارہ کا کزن ہے۔فارہ، رضا حیدر کی بھانجی ہے۔" ماورا نے ایک اور انکشاف کیا تھا۔

"کیا...؟" بی گل کو ایک اور کرنٹ لگا تھا۔

"جی ہاں... فارہ، رضا حیدر کی سگی بھانجی ہے۔ منزہ رحیم کی بیٹی اور مجھے اس حقیقت کا پتا ہی نہیں تھا۔ میں ہمیشہ انجان ہی پھرتی رہی... لیکن اب جب اس حقیقت سے آشنا ہو ہی گئی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ شاید اس میں بھی اللہ کی طرف سے کوئی بہتری ہی ہوئی ہے۔"

ماورا بہت سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

"لیکن اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو ہمیں کوئی نقصان بھی تو ہوسکتا ہے نا؟" بی گل اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے اس منہ زور سمندر میں پاؤں ڈالنے والی نہیں تھیں۔

"اس بار ایسا کچھ نہیں ہوگا بی گل... اس بار بہتری اس طرف ہی ہوگی۔" ماورا مضبوط اور بے لچک سے انداز میں کہتے ہوئے ان کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قدم اپنے کمرے کی طرف موڑ دیے تھے۔

"مگر اس بات کا تمہاری ماں کو پتا چل گیا تو مجھے یقین ہے کہ موت سے پہلے ہی مرجائے گی... کھڑے قدے

گرے گی وہ اور دم نکل جائے گا اس کا۔" بی گل نے انتہائی ہولناک قسم کا نقشہ کھینچا تھا۔

اور ماورا کے اندر کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔اس نے ایک دم گردن موڑ کر بی گل کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں... انہیں اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے، تب تک جب تک میں اپنے پیروں پہ کھڑی نہیں ہوجاتی۔ جب تک میرے ارادے کامیاب نہیں ہوجاتے جب تک میں کراچی شفٹ نہیں ہوجاتی اور جب تک مجھے کچھ حاصل نہیں ہوجاتا... آپ نے اس راز کو راز ہی رکھنا ہے اور انہیں یہ بھی بھنک نہیں پڑنی چاہیے کہ فارہ، رضا حیدر کی بھانجی ہے، ورنہ کچھ سنورنے سے پہلے ہی سب کچھ بگڑ جائے گا۔"

ماورا نے بے حد سختی سے کہتے ہوئے بی گل کو منع کیا تھا اور بی گل اس کے تیور دیکھ کر چپ ہوگئی تھیں۔ آخر کہتیں بھی تو کیا؟ اس کے خیالات سے تو وہ پہلے ہی بہت اچھی طرح واقف تھیں۔

اب تو کچھ کہنے سننے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔اسی لیے وہ دل ہی دل میں پریشان ہوتی اور اللہ سے خیر کی دعا مانگتے ہوئے برآمدے میں بچھے تخت سے برتن سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کچھ اتا پتا ملا؟" ولید نے جوس کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے استفسار کرہی لیا تھا۔

"ابھی اس کا نام اور اس کا تعارف ملا ہے، اتا پتا نہیں۔" تیمور نے جوس کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا تھا اور ولید اس کی ایک ایک حرکت کو بڑے غور اور بڑے دھیان سے نوٹ کررہا تھا۔

"ہوں... پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے، جہاں سے اس کا نام اور اس کا تعارف ملا ہے۔وہاں سے تمہیں اس کا ایڈریس بھی پتا چل سکتا ہے، منزل دور نہیں ہے تم سے۔" ولید نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے یار... لیکن جہاں سے مجھے اس کا نام اور تعارف ملا ہے۔وہاں سے اس کا اتا پتا معلوم کرتے ہوئے ایک جھجک، ایک شرم سی محسوس ہورہی ہے مجھے، کیونکہ میں اس ٹائپ کا ہوں نہیں۔"

تیمور بہت عجیب سے انداز میں بولا تھا اور ولید بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔جس پہ آس پاس کی ٹیبلز پہ بیٹھے کئی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"اگر تم اس ٹائپ کے نہیں ہوتا تو پھر میری مانو اور یہ دل اور نظر کا قصہ یہیں رہنے دو، یہیں ختم کردو اسے... کیونکہ ایسے کاموں میں تو انسان کو ہمیشہ اسی ٹائپ کا ہونا پڑتا ہے۔جس ٹائپ کا وہ نہیں ہوتا۔قیس کو مجنوں بننا پڑ جاتا ہے۔دھیدو کو رانجھا بننا پڑ جاتا ہے اور تیمور حیدر کو کیا بننا پڑ جاتا ہے؟ یہ تو اب کچھ دنوں بعد ہی پتا چلے گا۔ویسے اب فیصل آباد کا چکر کب لگے گا تمہارا؟ تمہاری کزن کی شادی کب ہے؟" ولید اب اس کی اگلی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"اس مہینے کی بیس تاریخ کو..." تیمور نے آہستگی سے بتایا۔

"اور آج ہوئی پانچ تاریخ... یعنی پندرہ دن تو ابھی ہیں جناب کی ملاقات کو؟" اس نے پورا حساب کتاب کیا۔

"پندرہ دن بہت زیادہ ہیں یار۔" تیمور نے بڑی بے قراری سے کہا تھا اور ولید کا دوسرا قہقہہ بھی بہت جان دار تھا۔

"ولید... کچھ ہوش سے کام لو یار... آس پاس کے لوگ ادھر ہی دیکھ رہے ہیں، کیوں خوامخواہ تماشا بنا رہے ہو؟" اس نے ولید کو سرزنش کی تھی، مگر وہ بھلا کب باز آنے والا تھا۔

"تو پھر فیصل آباد سے آئے کیوں ہو؟ یہ پندرہ دن بھی وہیں گزار لیتے۔کچھ تو قرار آتا؟"

ولید مسلسل ہنس رہا تھا' بلکہ تیمور کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"مجبوری تھی یار... آنا تو تھا ہی... آخر پندرہ دن آفس کون سنبھالتا؟" تیمور نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"ارے... آفس سنبھالنے کے لیے تمہارے بابا جو تھے۔ اتنے کامیاب اور منجھے ہوئے بزنس مین ہیں وہ' ان کے لیے یہ آفس سنبھالنا کون سا مشکل کام تھا؟" ولید نے کندھے اچکائے۔

"یار پلیز... تم کام کی بات کرو' کوئی حل بتاؤ کہ یہ پندرہ دن کیسے گزاروں؟" تیمور اپنے مطلب کی بات کی طرف آ ہی گیا تھا۔

"ہوں... یہ ہوئی نا کام کی بات... رہا نہیں گیا شہزادے سے۔" ولید نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

"تو اور کیا کروں؟ اتنے دن سے بس فضول ہی سوچے جا رہا ہوں... کوئی حل تو سمجھ میں آیا ہی نہیں۔" وہ جھنجلا رہا تھا۔

"او کے... او کے... حل بھی مل جائے گا۔ پہلے مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس کا نام کیا ہے؟" ولید اب اس کے حل کی طرف آ گیا تھا۔

"ماورا... ماورا مرتضیٰ..." تیمور نے اس کے نام کو بھی جیسے بڑے دل سے چھوا تھا۔

"ہوں... ماشاء اللہ... نام تو بہت ہی پاور فل ہے' لگتا ہے پرسنالٹی بھی ایسی ہی ہوگی؟" ولید نے سچ مچ دل سے سراہا تھا۔

"تھینک یو یار۔"

"اور ملی کہاں تھی؟"

"میری کزن فارہ کے گھر۔" وہ جیسے کسی روبوٹ کی طرح اس کے سوالوں کے جواب دیتا جا رہا تھا۔

"تمہاری کزن کے گھر؟" ولید کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں... وہ میری کزن کی دوست ہے۔ جب ہم آفاق کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے گئے تو وہ بھی وہاں آئی ہوئی تھی۔" تیمور کے بتانے پہ ولید حیرت سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"ارے... تو تمہیں اور کیا چاہیے؟ تمہاری کزن ہے نا تمہارا راستہ صاف کرنے کے لیے... اتنے ایزی معاملے کو تم اتنا مشکل کیوں سمجھ رہے ہو۔"

"یار... مشکل اس لیے سمجھ رہا ہوں کہ فارہ میری کزن ہے۔ لیکن ہم لوگوں میں کبھی بھی اتنی بے تکلفی نہیں رہی کہ ہم کسی ایسے مسئلے کو ایک دوسرے کے ساتھ ڈسکس کریں یا ایک دوسرے سے اس قسم کی ہیلپ لیں۔ اس لیے مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ میں فارہ کو فون کر کے اس کی دوست کے متعلق انفارمیشن لوں اور اسے یہ بتاؤں کہ میں اس کی دوست میں انٹرسٹڈ ہوں۔ وہ بھلا کیا سوچے گی کہ ایک ملاقات میں ہی میں اس کی دوست پہ لٹو ہو گیا ہوں اور مجھ سے رہا نہیں جا رہا۔"

تیمور بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا' جبکہ ولید تیسری بار بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"ہاہاہا... یہ جھوٹ بھی تو نہیں ہے۔ تم سے رہا تو واقعی نہیں جا رہا۔"

"ولید..." تیمور نے دانت پیسے۔

"سوری یار... مجھ سے بھی رہا نہیں جا رہا ہے' کیا کروں۔" ولید نے ہنستے ہوئے اپنے پیٹ پہ ہاتھ رکھا تھا' جس میں ہنس ہنس کر بل پڑ رہے تھے۔

"واقعی تمہاری کمینگی ان لمیٹڈ ہے۔" تیمور کہہ کر کرسی دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ارے رکو نا یار... کوئی حل ڈھونڈتے ہیں' اب مس ماورا کے عشق میں میرا یار آہیں بھرتا پھرے' میں یہ بھی تو نہیں دیکھ سکتا نا؟" ولید بھی اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا تھا۔

اور تیمور بل پے کر کے ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا تھا۔

"تم نے جو دیکھنا تھا' وہ دیکھ لیا ہے' اب اور نہیں... جو کرنا ہوا میں خود کر لوں گا۔"

تیمور بڑبڑاتا ہوا اپنی گاڑی کا لاک کھول کر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا تھا۔

"کچھ اور کرو یا نہ کرو' مگر اپنی کزن سے رابطہ ضرور کرو' تمہارا مسئلہ اس کی ہیلپ کے بغیر حل نہیں ہو سکتا اور اگر نہ بھی حل ہو تو کم از کم مس ماورا کے بارے میں کچھ انفارمیشن تو ملے گی نا۔ اس کی پسند' ناپسند' اس کی نیچر' اس کا رہن سہن' اس کے خیالات' آخر کچھ تو معلوم ہو گا ہی؟" ولید نے فرنٹ سیٹ سنبھالتے ہوئے اسے اک مفید مشورہ دیا تھا اور تیمور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے رک گیا۔

"اب رک کیوں گئے ہو؟ میں نے جو مشورہ دیا ہے اس پہ مجھے گھورنا مت' بلکہ اس پہ غور کرنا... کیونکہ یہی وہ پوائنٹ ہے جو تمہیں اس کی طرف بڑھنے میں مدد دے گا اور تمہیں آسانی بھی رہے گی۔" ولید بڑی لاپروائی سے اسے اپنے مشورے پہ عمل کرنے پہ اکسا رہا تھا۔

"لیکن پھر وہی مسئلہ کہ فارہ سے کیسے۔" تیمور نے جھنجلاتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"پیار' عشق اور محبت میں انسان کو ہزاروں لوگوں کے سامنے شرمندہ اور خوار ہونا پڑتا ہے' تم اگر ایک کزن کے سامنے شرمندہ ہو جاؤ گے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی اور ویسے بھی کسی رازدار کے بغیر گزارا نہیں ہوتا' تم ایسا کرو' اپنی کزن کو رازداں کر لو... ورنہ پھر تمہاری کزن کی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر کراچی آ گئی تو تمہارے لیے یہ کام واقعی مشکل ہو جائے گا۔"

ولید نے اک اور پوائنٹ نوٹ کروایا تھا اور تیمور سچ مچ اس پوائنٹ پہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"اگر میرا مشورہ مفید ثابت نہ ہوا تو پیسے واپس..." اس نے خالصتاً "دکان داروں کا سا انداز اپناتے ہوئے کہا تھا اور اس بار اس کے انداز پہ تیمور بھی قہقہہ لگا کر ہنسنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آفاق..." وہ ابھی ابھی آفس سے واپس آیا تھا۔ اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ثمینہ یزدانی کی آواز پہ اسے ڈرائنگ روم کے سامنے ہی رکنا پڑ گیا تھا۔

"جی مما!" وہ اندر نہیں آیا' بس وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا تھا۔

"اندر آؤ..." وہ چاہتی تھیں کہ وہ اندر آئے اور ڈرائنگ روم کا پھیلاوا دیکھے۔

"میں تھکا ہوا ہوں' فی الحال آرام کرنا چاہتا ہوں' بعد میں آ جاؤں گا۔" وہ کترا رہا تھا۔

"او کے... ٹھیک ہے' تم جاؤ آرام کرو۔" ثمینہ یزدانی اس کے انکار پہ دھیمی پڑ گئی تھیں اور آفاق کا دل ایک بار پھر پسیج گیا تھا۔

وہ سر جھٹکتے ہوئے بریف کیس سمیت اندر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے اپنے دل سے ساری خفگی پیچھے جھٹک کر انہیں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" ثمینہ یزدانی نے بہت سرسری اور خفا خفا سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" آفاق اپنا بریف کیس صوفے کی سائیڈ پہ رکھتے ہوئے ان کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہوں بالکل۔۔۔" آفاق نے گردن موڑ کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا تھا اور پھر بڑے لاڈ اور بڑے پیار سے اپنا بازو ان کے کندھوں کے گرد لپیٹ دیا تھا۔

"کیا بات ہے۔ مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں؟" اس نے بہت ہی معصوم اور بچکانہ سے انداز میں پوچھا۔

"تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں تمہاری ماں ہوں اور مائیں ناراض نہیں ہوتیں۔ اس لیے تم جیسے ہزاروں بیٹے اپنی ماؤں کے دل اپنے قدموں تلے روند کر گزر جاتے ہیں۔" ثمینہ یزدانی کا لہجہ شکوہ کناں ہوا تھا۔

"اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو اور آپ جانتی ہیں کہ میں ایسا کر بھی نہیں سکتا۔ آپ میرے لیے بہت اہم ہیں۔" آفاق نے اپنے دوسرے ہاتھ سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"اور میرے لیے فارہ بہت اہم ہے، جس کو تم اگنور کر رہے ہو۔" ثمینہ یزدانی کی سوئی ہمہ وقت فارہ پہ ہی اٹکی رہتی تھی۔ انہیں اسی کا غم کھائے جا رہا تھا کہ آفاق اس میں دلچسپی نہیں لے رہا۔

"کیا وہ میرے اگنور کر دینے سے اگنور ہو جاتی ہے؟" آفاق کا سوال بڑا عجیب تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ان کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگوں کو ہم اگنور کر کے بھی اگنور نہیں کر پاتے وہ، پھر بھی ہماری توجہ کا مرکز وہی رہتے ہیں، ان ہی کی ذات اور ان ہی کی بات دل و دماغ پہ چھائی رہتی ہے، کیونکہ وہ لوگ دلوں میں بسنے والے لوگ ہوتے ہیں اور دلوں میں بسنے والوں کو اگنور کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔" آفاق نے سنجیدگی سے کہا۔

"یعنی تم فارہ کو اگنور نہیں کر سکتے؟" ثمینہ یزدانی کے چہرے پہ خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ نہ فارہ کو۔۔۔ نہ آپ کو۔۔۔" اس نے دوبارہ ثمینہ یزدانی کے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگایا تھا اور ثمینہ یزدانی پل میں کھل اٹھی تھیں۔

"سچ۔۔۔" انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"بالکل سچ۔۔۔" آفاق ان کی اتنی بے یقینی اور اتنے اشتیاق پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

اور ثمینہ یزدانی نے بے اختیار اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"اچھا بتایئے۔۔۔ کس لیے بلا رہی تھیں آپ؟" اس نے اب بہت ہی اچھے طریقے سے استفسار کیا تھا۔

"یہ دیکھو۔۔۔ یہ فارہ کے کچھ ڈریسز بنوائے ہیں ابھی تک سے، ابھی کچھ باقی ہیں، اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو بتا دو، میں فارہ کے ڈریسز ویسے ہی بنوالوں گی۔" انہوں نے ٹیبل اور کارپٹ پہ رکھے مختلف بیگز میں سے انتہائی قیمتی اور فینسی ڈریسز نکال کر آفاق کے سامنے پھیلا دیے تھے اور آفاق اتنے کلر فل اور برائٹ ڈریسز دیکھ کر بے اختیار ہی مسکرا دیا تھا۔

"اب ان ڈریسز میں کیا کمی ہے بھلا، جو میں اپنی پسند بتاؤں گا؟ ویسے ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے گا کہ فارہ بہت نازک مزاج لڑکی ہے، وہ اتنے فینسی ڈریسز برداشت نہیں کر پائے گی۔ آپ اس کے کچھ ہلکے پھلکے ڈریسز بھی لیں، اب شادی کے بعد بندہ ہر وقت فینسی ڈریس میں ہی تو نہیں رہ سکتا نا؟" آفاق کے مشورے پہ ثمینہ یزدانی کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ آپ اس طرح مسکرانے پہ مجبور ہو گئی ہیں۔" آفاق نے ان کے چہرے پہ بکھری مسکراہٹ بڑی دلچسپی سے نوٹ کی تھی۔

"بس۔۔۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسا ہمیشہ ہی کہتے رہو اور میں اس طرح ہمیشہ ہی مسکراتی رہوں، مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمہیں فارہ کی کتنی فکر ہے؟ اس کے ڈریسز کا بھی خیال ہے کہ زیادہ فینسی نہ ہوں۔" ثمینہ یزدانی نے

مسکراتے ہوئے کہا اور ان کی بات پہ آفاق بھی مسکرا دیا تھا۔

"اک اور بات پوچھوں آپ سے؟" اس کے دل میں کوئی تجسس بیدار ہوا تھا۔

"سو بسم اللہ بیٹا۔ جو جی چاہے پوچھو۔" وہ تو بڑی خوشی خوشی اور جی جان سے متوجہ ہوئی تھیں۔۔۔ کیونکہ یہی تو ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی کسی کام میں اور کسی بات میں دلچسپی لے اور اپنی پسند اور ناپسند بتائے۔

"جب آپ لوگ شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے گئے تھے تو وہ کیسی لگ رہی تھی؟"

آفاق کے سوال پہ تو ثمینہ یزدانی کے دل کی مراد بر آئی تھی۔

"بہت پیاری بہت خوب صورت لگ رہی تھی، بالکل کسی باربی ڈول کی طرح۔۔۔ گلے لگا کر اسے پیار کیا تو دل کو جیسے سکون آگیا تھا۔" انہوں نے دل کی گہرائیوں سے بڑے بھرپور طریقے سے اسے فارہ کے متعلق بتایا تھا۔

"وہ خوش تو تھی نا؟" یہ سوال بڑے دنوں سے اس کے دل میں کلبلا رہا تھا، مگر وہ اس سوال کو زبان پہ نہیں لا پا رہا تھا، مگر آج اس سے رہا نہیں گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ خوش تھی، مگر اتنی ہی جتنے کہ تم ہو۔" ثمینہ یزدانی نے جو محسوس کیا تھا وہی اسے بتایا تھا۔

"کیوں؟ ایسا کیوں ہے؟" آفاق کو بے چینی ہوئی۔

"اس کیوں کا جواب تم سے بہتر کون جانتا ہے بھلا؟" ثمینہ یزدانی نے اسے احساس دلایا تھا کہ جو کچھ وہ فارہ سے فون پہ کہہ چکا ہے۔ اس کے بعد وہ پوری طرح سے خوش کیسے ہو سکتی ہے بھلا۔

"ہوں۔۔۔ آئی انڈر اسٹینڈ۔" وہ بے حد آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

"اگر ہو سکے تو ذرا فرصت سے اسے کال کر لینا اور اسے نرمی اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کرنا، ورنہ وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی پہ بھی پورے دل سے خوش نہیں ہو پائے گی۔" انہوں نے آفاق کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے، کوشش کروں گا۔" وہ پرسوچ سے انداز میں کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان سے اجازت لے کر اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ولید رحمان کو دوبارہ کال نہیں کرے گی اور اپنی اس سوچ اور اس ارادے پہ عمل پیرا ہونے کے لیے اس نے ولید رحمان کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی بھی بارہا کوشش کی تھی۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی۔

اس کی سوئی دن رات ولید رحمان کے نام کے گرد ہی گھومتی رہتی تھی، مگر پھر بھی وہ اس سے رابطہ کرنے سے گریز ہی کر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کر رکھا تھا کہ اب اگر پہل کرے گا تو ولید رحمان ہی کرے گا، وہ نہیں کرے گی۔

اور اسی کشمکش اور اسی عہد کے ہاتھوں وہ اندر سے خاصی چڑچڑی اور جھنجلاہٹ کا شکار بھی ہو رہی تھی، لیکن اپنی یہ کیفیت کسی کو بتا نہیں پا رہی تھی، جس کی وجہ سے اس کے دل و دماغ پہ اک عجیب سا بوجھ اور غصہ سا سوار رہنے لگا تھا۔

اور وہ کسی سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

اسی لیے اس وقت ساشا اس سے بات کرتے ہوئے خفگی سے جھنجلا اٹھی تھی۔

"آخر بات کیا ہے عزت۔۔۔؟ تم ہر وقت اتنی چڑچڑی سی کیوں رہنے لگی ہو؟ ایک تو تم فون نہیں کرتیں اور اگر ہم خود کرلیں تو تم سے ٹھیک سے بات ہی نہیں ہوتی' تمہارا دھیان نہ جانے کہاں رہنے لگا ہے؟ کچھ خبر ہی نہیں ہے تمہاری۔" ساشا نے انتہائی خفگی کا اور ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

"پلیز ساشا۔۔۔ میں خود بہت ڈسٹرب ہوں' مجھے مزید ڈسٹرب نہ کرو' پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔۔۔" عزت اس سے بھی زیادہ خفگی اور جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی تھی اور ساشا چند ثانیے کے لیے چپ سی ہوگئی تھی اور کچھ دیر کے توقف کے بعد ہی قوت گویائی کا استعمال کیا تھا۔

"کیوں؟ تم کیوں ڈسٹرب ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے آخر۔ کچھ پتا بھی تو چلے۔" ساشا یہی تو جاننا چاہتی تھی کہ عزت آج کل کن سوچوں اور کن خیالوں میں گم ہے آخر؟

"ساشا پلیز۔۔۔ کیا جاننا چاہتی ہو تم؟ تو پھر سنو مجھے محبت ہوگئی ہے' یہ حقیقت ہے' مجھے ولید رحمان سے محبت ہوگئی ہے' محبت ہوگئی ہے مجھے۔"

وہ کہتے کہتے پھٹ پڑی تھی' کیونکہ وہ جس ذہنی کشمکش کا شکار تھی' اس جذبے کو نام ہی نہیں دے پارہی تھی۔ مگر ساشا کے اصرار پہ اسے اپنے اندر کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

"اسے پتا ہے؟" ساشا کا اگلا سوال کافی دھیما تھا۔ حالانکہ ایسے ہی چند سوالات وہ پہلے بھی اس سے کرچکی تھی' مگر پھر بھی وہ ایک پکی تصدیق چاہ رہی تھی۔

"پتا ہے یا نہیں ہے' مگر اسے اندازہ ضرور ہے کہ عزت حیدر' عزت حیدر نہیں رہی' ولید رحمان ہوچکی ہے' وہ بس چکا ہے مجھ میں' آباد ہوچکا ہے میری ذات میں' اب میں کروں تو کیا کروں؟ کیسے نکالوں خود کو اس کے سحر سے؟ کیسے آزاد کروں اپنا آپ' بتاؤ مجھے۔ ہے کوئی حل اس کا؟" عزت نے انتہائی شدت سے کہتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ "اور میری بدنصیبی یہ ہے کہ دوسری طرف سے جواب ہی نہیں آرہا ہے۔"

عزت زچ ہورہی تھی' پاگل ہورہی تھی' اس کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جس جذبے کی دلدل میں اتری ہے' اس سے بچاؤ کا اور سنبھلنے کا طریقہ کیا ہے؟

"اگر جواب نہیں آرہا تو سمجھ لو کہ دوسری طرف بھی یہی کچھ چل رہا ہے' کیونکہ اگر دوسری طرف ایسا کوئی جذبہ یا ایسے کوئی جذبات نہ ہوتے تو تمہیں کب کا انکار میں جواب آچکا ہوتا۔"

ساشا اپنی عقل اور اپنے تجربے کے مطابق اسے جواب دے پائی۔

"لیکن اس نے انکار کرنے میں کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی؟ وہ تو انکار کرہی چکا ہے' میں کیسے مان لوں کہ دوسری طرف بھی یہی کچھ چل رہا ہے؟ اگر دوسری طرف بھی یہی کچھ چل رہا ہوتا تو دوسری طرف بے چینی بھی اتنی ہی ہوتی جتنی اس طرف ہورہی ہے۔ جتنی مجھے ہورہی ہے' جتنی میں پاگل ہورہی ہوں۔"

بات تو اس کی بھی سچ تھی' مگر ساشا ایک سمجھ دار لڑکی تھی' عزت کو سمجھانے کے لیے مثبت سوچ دکھائی تھی۔

"ہر انسان کی نیچر میں فرق ہوتا ہے' ہر انسان کا مزاج اور فطرت الگ الگ پائے جاتے ہیں' کچھ تمہاری طرح محبت کا یہ اٹیک برداشت نہیں کرپاتے اور بلبلانے لگتے ہیں اور کچھ اس اٹیک کو سہہ کر چپ سادھ لیتے ہیں' ولید رحمان کی طرح۔۔۔" ساشا نے اسے مثال دی تھی۔

"میں جان بوجھ کر نہیں بلبلا رہی' میرا دل مجھے مجبور کررہا ہے' اس کو بھی مجھ سے محبت ہونی چاہیے۔ صرف مجھ سے۔"

وہ بہت ہی جنونی ہورہی تھی۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو؟" اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"تو یا خود مرجاؤں گی' یا اسے ماردوں گی۔" عزت نے آخری فیصلہ سناتے ہوئے بات ہی ختم کرڈالی تھی اور ساتھ ہی یکدم فون بند کرکے بیڈ پہ اچھال دیا تھا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ولید رحمان' عزت حیدر سے محبت نہ کرے۔ ہونہہ۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو جان لے لوں گی اس کی۔"

عزت دل ہی دل میں تلملاتی ہوئی لب بھینچ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر نہ جانے اندر جنون کے کیسے ابال اٹھے کہ وہ بیڈ سے ایک جھٹکے سے اپنا موبائل اٹھا کر بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔

"عزت۔۔۔ کہاں جارہی ہو میری جان؟ ادھر میرے پاس آؤ۔" ڈرائنگ روم میں بیٹھے رضا حیدر نے اسے سیڑھیوں سے اتر کر کاریڈور کی طرف بڑھتے دیکھ کر آواز دی تھی۔

"سوری بابا۔۔۔ میں اس وقت کسی کام سے جارہی ہوں' واپسی پہ آؤں گی آپ کے پاس۔" عزت کا موڈ بے حد آف تھا' اس لیے اس نے رضا حیدر کو بھی بڑے ضبط سے جواب دیا تھا۔

"یہ ان دونوں بہن' بھائی کو کیا ہوگیا ہے آج کل' دونوں کے تیور ہی بدلے ہوئے ہیں؟ پہلے جیسی کوئی بات ہی نظر نہیں آرہی۔"

رضا حیدر بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں اپنے دونوں بچوں کے موڈ کی تبدیلی نظر آگئی تھی۔ مگر اس تبدیلی کی وجہ کیا تھی؟ ابھی یہ نظر نہیں آیا تھا' آجاتا تو یقیناً وہ اب تک قیامت اٹھا چکے ہوتے۔

لیکن اس وقت وہ مکمل طور پہ لاعلم تھے۔ مگر سوچ ضرور رہے تھے۔ ان کا صوفے پہ رکھا موبائل بج اٹھا تھا۔ انہوں نے اپنے ذہن سے سوچ کا انبار جھٹکتے ہوئے موبائل اٹھا کر کال ریسیو کرلی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" ان کی آواز پہ ابھی بھی سوچ کا غلبہ تھا۔

"السلام علیکم رضا حیدر۔۔۔ کیسے ہو؟" دوسری طرف ایک مانوس سی آواز ابھری تھی۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں' مگر آپ کی تعریف؟" رضا حیدر اس آواز کو پہچان نہیں سکے تھے۔

"مجھے پتا تھا۔۔۔ تم یہی سوال کروگے۔۔۔ لیکن مجھے دیکھو' پاکستان آتے ہی سب سے پہلے تمہارا نمبر حاصل کیا ہے اور تم سے رابطہ کیا ہے۔" دوسری طرف کی بات سن کر رضا حیدر کے ذہن میں اک جھماکا ہوا تھا۔

"ارے قیام مرزا تم؟" وہ فوراً" ہی پہچان گئے تھے اور دوسری طرف اک قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"چلو۔۔۔ یہ بھی شکر ہے کہ تم نے پہچان تو لیا ہے نا۔"

"ارے۔۔۔ تم پاکستان کب آئے۔" رضا حیدر کو حیرت ہوئی تھی۔

"ابھی لاسٹ ویک ہی آیا ہوں' چند دن گھر کی سیٹنگ وغیرہ میں لگ گئے' آج فارغ تھا تو سوچا تم سے رابطہ کرلوں۔" قیام مرزا بہت پرجوش لہجے میں بات کررہے تھے۔

"تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ تم اطلاع کردیتے' گھر کی سیٹنگ وغیرہ کون سا مشکل کام تھا؟ خیر یہ بتاؤ فیملی کے ساتھ آئے ہو؟"

"ارے یار۔۔۔ میری فیملی بھلا کتنی ہے؟ دونوں بیٹیوں کی ایک سال پہلے ہی شادی کرچکا ہوں اور بیٹا تو ظاہر ہے میرے ساتھ ہی آیا ہے' ملواؤں گا تمہیں بھی اس سے۔" قیام مرزا کا اپنے بیٹے کے لیے پیار ان کے لہجے سے ہی جھلک رہا تھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ ان شاءاللہ ضرور ملیں گے' بھابھی کا سناؤ' وہ بھی ساتھ آئی ہیں۔" رضا حیدر' قیام مرزا کی آواز سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔

"ہاں بھئی۔۔۔ وہ بھی ساتھ ہی آئی ہے' اس نے کہاں جانا ہے بھلا؟ تم اپنی بات کرو۔ رابعہ بھابھی' تیمور اور عزت کیسے ہیں؟"

دونوں دوستوں کا بہت عرصے بعد رابطہ ہوا تھا۔ اس لیے دونوں ہی بہت خوش تھے اور یوں ہی کافی دیر ان کی اس خوشی اور ایک دوسرے سے گزرے ماہ و سال کا حال احوال پوچھنے میں ہی گزر گئی تھی۔ بہت دیر بعد فون بند ہوا تھا۔ مگر فون بند کرنے کے بعد بھی وہ دونوں کسی سوچ میں گم تھے۔

☼ ☼ ☼
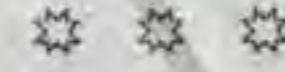
میں نعرۂ مستانہ
میں نعرۂ مستانہ
میں شوخیٔ رندانہ
میں نعرۂ مستانہ
میں شوخیٔ رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں؟
میں تشنہ۔۔۔
میں تشنہ کہاں جاؤں؟

پی کر بھی کہاں جانا؟
میں نعرۂ مستانہ

آج پھر اس کی دیوانگی اور اس کا جنون عروج پہ تھا۔
اور وہ آج پھر سڑکوں پہ آوارگی کی کیفیت میں گاڑی دوڑا رہی تھی۔
اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے؟
بس اک عابدہ پروین کی آواز تھی جو اسے سنائی دے رہی تھی اور اک اپنا دل تھا جو کسی جانب ہمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا' ان دو چیزوں کے علاوہ کوئی تیسری چیز اسے محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی اور وہ اسی بے خودی کے عالم میں شہر کی حدود سے بھی شاید دور نکل آئی تھی۔

میں طائر لاہوتی
میں جوہر ملکوتی
ناسوت نے کب مجھ کو
ناسوت نے کب مجھ کو
اس حال میں پہچانا
میں نعرۂ مستانہ
میں شوخیٔ رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں

پی کر بھی کہاں جانا۔۔۔؟

وہ لب بھینچے اپنی ہی تڑپ میں تڑپتی اور اپنی ہی آگ میں جلتی ہوئی گاڑی فل اسپیڈ پہ رکھے بہت دور نکل آئی تھی جب اچانک اسے گاڑی کا پچھلا ٹائر پھٹنے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے بے ساختہ چونکتے ہوئے گاڑی کو فوراً ہی کنٹرول کر لیا تھا' گاڑی اک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"اف۔۔۔! یہ بھی ولید رحمان کی طرح نکلی ہے' میری دیوانگی اور میرا جنون برداشت نہیں کر سکی۔۔۔!" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی اور پھر پیچھے آ کر گاڑی کا ٹائر دیکھا تھا۔

اس نے اپنے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا' مگر اسے دور دور تک کسی بھی ذی روح کا نام و نشان نظر نہیں آیا تھا۔

موسم گرما کی ایک موسم سرما جیسی شام تھی۔۔۔
جو اپنے آنچل میں خنک ہواؤں کا وجود سمیٹے سبک رفتاری سے چلتی لمحہ بہ لمحہ ماحول کے حواسوں پہ سوار ہوتی جا رہی تھی اور ان خنک ہواؤں کی شرارت سے عزت کے شولڈر کٹ بال اڑ رہے تھے۔ جن کو وہ بار بار پیچھے ہٹا رہی تھی اور بار بار کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی مگر ہواؤں کی شرارتیں ہنوز جاری تھیں۔ جب اچانک اس کے قریب ہی کسی نے اپنی بائیک کو بریک لگائے تھے۔

"ہیلو میم۔۔۔! اینی سروس فار می۔۔۔؟" اس کے عقب سے آواز ابھری تھی اور اس نے بڑے ہی ناگوار سے انداز میں پلٹ کر اس آدمی کو دیکھا تھا جس نے خوامخواہ ہی ہیرو بننے کی کوشش کی تھی۔

"نو تھینکس۔۔۔!" اس نے بہت سخت لہجے میں انکار کر دیا تھا۔

لیکن اس کے انکار کے باوجود اس آدمی نے عزت کو سرتاپا بہت ہی گہری اور جائزہ لیتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا کسی اور کے انتظار میں ہیں؟" اس آدمی نے بہت ہی گہرے لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں۔۔۔! آپ کو کوئی پرابلم؟" وہ کون سا کسی سے دبنے والی لڑکی تھی۔ الٹا تنک کے پوچھ رہی تھی۔

"مجھے تو کوئی پرابلم نہیں ہے' لیکن اگر آپ یونہی اس کے انتظار میں کھڑی رہیں تو آپ کو پرابلم ضرور ہو جائے گی۔" وہ بھی بہت ہی عجیب آدمی تھا بات کرتے کرتے معنی خیز سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"اے مسٹر۔۔۔! مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش فضول ہے' اس لیے اپنا ٹائم ویسٹ کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ اپنی راہ لو' شام ڈھل رہی ہے' گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"یہی عرض تو میں کر رہا ہوں کہ آپ اپنا ٹائم ویسٹ نہ کریں اور اپنی راہ لیں' شام ڈھل رہی ہے آپ کے گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے' آخر کب تک انتظار کریں گی اس کا؟ اتنی جلدی آنے والا نہیں ہے وہ۔۔۔ اسے ابھی گھنٹہ آدھا گھنٹہ لگ جائے گا واپسی میں۔۔۔"

وہ آدمی بڑے ہی اطمینان سے بات کر رہا تھا' جس پہ عزت کو حیرت ہوئی تھی کہ وہ آخر کس کی بات کر رہا ہے؟

"کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"ولید رحمان کی اور کس کی؟" اس آدمی نے عزت کے پیروں میں پٹاخے پھوڑ دیے تھے' وہ اچھل پڑی تھی۔

"ولید رحمان؟" اسے یقین نہیں آیا تھا جو کہ کچھ اس نے سنا ہے وہ سچ سنا ہے۔ وہ ایک اجنبی آدمی اس کے دل کی گہرائیوں تک کیسے پہنچ گیا؟

وہ آدمی ہی تھا یا کوئی جن بھوت۔۔۔؟
عزت تو غش کھا کے گرنے کو تھی اگر وہ دوبارہ مخاطب نہ کر لیتا۔
"کیوں۔۔۔؟ میں نے کچھ غلط کہا ہے کیا؟"
"نن نہیں۔۔۔ مگر۔ آ۔۔۔ آپ کو کیسے پتا کہ میں ولید رحمان۔۔۔؟"
عزت مارے حیرت کے اپنی بات بھی مکمل نہیں کر سکی تھی اور وہ آدمی ایک بار پھر مسکرا اٹھا تھا۔
"کرائم رپورٹر ہوں' بات کو پاتال سے بھی نکال لاتا ہوں یہ تو پھر بھی آپ کا دل ہے جو آپ کی آنکھوں میں دھڑک رہا ہے۔" اس آدمی نے عزت کی آنکھوں میں جھانکا جو حیران پریشان نظر آ رہی تھیں۔
"کرائم رپورٹر۔۔۔؟" عزت کے آس پاس خطرے کی گھنٹیاں سی بجی تھیں۔
"جی ہاں۔۔۔! کرائم رپورٹر۔۔۔ حارث زیدی۔۔۔ ولید رحمان کا کولیگ۔۔۔ یونیورسٹی میں بم بلاسٹ کے روز ولید کو آپ کے ساتھ دیکھا تھا' وہ اتنے ہجوم میں بھی صرف آپ کو ہی سنبھالتا پھر رہا تھا' بتا رہا تھا کہ آپ اس کی رشتہ دار ہیں' شاید کزن ہیں اس کی؟ اس لیے ابھی آپ کو یہاں اس روڈ پر دیکھ کر مجھے یہی لگا ہے کہ آپ اس کے انتظار میں ہیں کیونکہ میرے بعد اس روڈ سے وہی ادھر آنے والا ہے' یہاں سے بہت دور ایک حادثہ ہوا تھا جس کا پولیس نے بھی کوئی نوٹس نہیں لیا' اس لیے ہم اس حادثے کی چھان بین کے لیے گئے ہوئے تھے۔"
حارث زیدی نے تفصیل سے سب کچھ بتا کر عزت کو اور بھی حیرت کے سمندر میں دھکیل دیا تھا اور وہ ہکا بکا سی حارث زیدی کی شکل دیکھ رہی تھی۔
"ٹھیک ہے میم۔۔۔! میں چلتا ہوں' آپ ولید رحمان کا انتظار کریں' وہ آتا ہی ہو گا۔"
حارث زیدی نے اپنی بائیک دوبارہ اسٹارٹ کی اور جانے کے لیے پر تولے تھے۔
"اور ہاں۔۔۔! ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اس کی رشتہ دار نہیں ہیں۔ آپ اس کے دوست تیمور حیدر کی بہن ہیں۔۔۔ عزت حیدر۔۔۔

اور ایک بات اور کہ اگر مجھے ان چیزوں کا علم نہیں ہو گا تو مجھے کرائم رپورٹر کون کہے گا؟ کیونکہ محبت بھی آج کل کسی کرائم سے کم نہیں ہے' اب یہی دیکھ لیں کہ آپ اس ڈھلتی شام کے گہرے اندھیرے میں بھی یہاں روڈ پہ نڈر کھڑی ہیں اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ کیا بنے گا آخر۔۔۔؟ وہی نا۔۔۔؟ کرائم۔۔۔؟"
حارث زیدی نے بہت ہی پتے کی بات کہی تھی اور وہاں سے ہوا ہو گیا تھا جبکہ عزت پیچھے کھڑی دیکھتی رہ گئی تھی۔
اور ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور بائیک کی ہیڈ لائٹس کی روشنی قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی عزت نے پلٹ کر اپنے عقب سے ابھرنے والی روشنی کی جانب دیکھا تھا۔
اور رفتہ رفتہ وہ روشنی عین اس کے چہرے پہ پڑتی یکدم ایک ہی جگہ پہ ساکت ہو گئی تھی۔
"عزت۔۔۔؟" ولید اسے یوں سنسان اور ویران سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا تھا۔
اور فوراً" اپنی بائیک سے نیچے اتر آیا تھا جبکہ عزت جہاں کھڑی تھی وہاں ہی کھڑی رہی' وہاں سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
"عزت۔۔۔! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اس وقت؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" ولید کی تشویش دیدنی تھی' وہ بے پناہ پریشان ہوا تھا۔
"میں یہاں جو بھی کر رہی ہوں آپ کو اس سے مطلب۔۔۔؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی تھی اور ولید اس کے لہجے پہ

چونک گیا تھا۔
"لیکن عزت۔۔۔!" بات کرتے کرتے ولید کی نظر اس کی گاڑی پہ پڑی تھی اور پھر اس نے اپنے بیگ کے ساتھ لٹکتی ہوئی ٹارچ پکڑتے ہوئے اس کو آن کر کے عزت کی گاڑی کا معائنہ کیا تھا جس کا پھٹا ہوا ٹائر صاف بتا رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔
ولید اس سے کچھ بھی کہے بغیر اس کی گاڑی کی سمت بڑھ آیا تھا۔
"اسٹاپ اٹ۔۔۔! میری گاڑی کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے یکدم غصے سے چیختے ہوئے ولید کو ٹائر تبدیل کرنے سے روک دیا تھا۔
"وجہ۔۔۔؟" ولید نے اس کی گاڑی سے چابی نکال کر ڈگی کھولتے ہوئے پوچھا۔
"وجہ یہ کہ مجھے آپ کی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بہت ہی بے مروتی دکھائی تھی۔
"تو پھر کس کی ہیلپ کی ضرورت ہے؟ جس کی ضرورت ہے اسے بلا لیں۔۔۔" ولید بھی آخر ولید ہی تھا' اس نے بھی بڑی سہولت سے کندھے اچکائے تھے۔
"بلا لوں گی۔۔۔ کسی کو بھی بلا لوں گی۔۔۔ مگر آپ کی ہیلپ نہیں لوں گی۔" وہ مزید تنگ کر بولی تھی۔
"تو پھر یہاں کھڑی کیوں ہیں؟ کسی کی بھی ہیلپ لے لیتیں؟"
"تو کیا میں آپ کے لیے کھڑی ہوں؟" عزت نے ابرو اچکائے تھے۔
"آف کورس۔۔۔! جب کوئی ایک بار ہماری ہیلپ کرتا ہے تو ہم دوسری بار خود بخود ہی یہ امید باندھ لیتے ہیں کہ اس بار بھی وہی ہماری ہیلپ کرے گا۔" ولید نے دلچسپی سے کہا تھا۔
"لیکن مجھے آپ سے اس قسم کی کوئی امید نہیں ہے۔" وہ تلملا اٹھی تھی۔
"لیکن میں آپ کی امید کے بغیر بھی آپ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ میرا فرض ہے' میں آپ کو اس طرح اگنور کر کے نہیں گزر سکتا۔" ولید نے کہتے ہوئے ڈگی سے ٹائر اور رینچ وغیرہ نکال لیے تھے۔
"آپ کو گزرنا پڑے گا۔" عزت نے آگے بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے رینچ جھپٹ لیا تھا اور ولید اس کی اس حرکت پہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔
کیونکہ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ ایسی کوئی حرکت کرے گی' بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی

تھی جس کو چھپانے کی غرض سے وہ ذرا سا رخ موڑ گیا تھا۔

"کس بات کا غصہ ہے آپ کو؟" ولید نے اپنی مسکراہٹ کنٹرول کرنے کے بعد بڑے ہی پرسکون سے انداز میں دریافت کیا تھا۔

"کیا۔۔۔؟ مجھے کیوں غصہ ہوگا آپ پہ؟ میرا آپ سے کیا تعلق؟" وہ ایک دم ہی ہر بات سے انکاری ہو گئی تھی اور ولید اثبات میں سرہلاتے ہوئے ذرا سا اس کے قریب آیا اور اس کے ہاتھ سے دوبارہ رینچ لے لیا تھا۔

"یہی بات تو میں بھی آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ ——— غصہ کرنے کے لیے تعلق کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے پلیز مجھ پہ غصہ کرنے سے پرہیز کریں' میری جان کو ویسے بھی ہزاروں روگ ہیں۔"

ولید نے بڑے ہی پرسکون سے لہجے میں کہتے ہوئے ٹارچ اس کی سمت بڑھائی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹارچ لے کر کھڑی رہے اور وہ گاڑی کا ٹائر بدل لے۔

"ہزاروں روگ۔۔۔؟ کیا پوچھ سکتی ہوں کہ کیسے روگ ہیں آپ کی جان کو؟" اس نے ٹارچ کی روشنی سیدھی ولید کے چہرے پہ فوکس کی تھی۔

"یہ پوچھنے کے لیے بھی تعلق کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔" وہ اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتے ہوئے نیچے بیٹھ گیا تھا اور رینچ سے ٹائر کے اسکرو کھولنے لگا تھا۔

"اسی لیے تو تعلق بنانا چاہتی ہوں ولید رحمان!" عزت کا لہجہ پل میں ہی محبتوں اور چاہتوں کے بوجھ سے بوجھل ہو گیا تھا اور جہاں اس کی چاہت کے پھول کھلنا شروع ہوتے تھے' وہیں پہ ولید کے مزاج کی شوخ رنگ کلیاں مرجھا جاتی تھیں وہ دھیما پڑ جاتا تھا۔

"اتنی دور نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کوئی اور پرابلم ہو جاتی تو؟" ولید نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"انسان جب اپنی حدود سے باہر نکلتا ہے تو پرابلم تو بنتی ہی ہے اور مجھے تو اس معاملے میں ہر پرابلم قبول ہے' ہر قیامت کے لیے تیار ہوں میں۔۔۔" عزت نے بڑے ہی پرسکون انداز میں کہا تھا۔

اور ولید کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی اس معاملے سے ڈرا ہوا تھا' اب مزید بدک گیا تھا۔

"قیامت ایک لفظ نہیں ہے جسے ہم بڑی آسانی سے بول دیتے ہیں بلکہ قیامت وہ چیز ہے جو پوری کائنات کو الٹ سکتی ہے' پوری کائنات کا الٹ جانا قیامت کہلاتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ قیامت کچھ بھی نہیں محض ایک لفظ تک محدود ہے۔"

ولید نے اس کی سرکشی کو دلیل دینے کی کوشش کی تھی مگر کچھ لوگ دلیلوں سے سمجھتے ہیں نہ وکیلوں سے اور عزت حیدر کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

"کائنات کا الٹ جانا اگر قیامت کہلاتا ہے تو میرے خیال میں انسان کی ذات کا الٹ جانا بھی قیامت ہی کہلاتا ہے اور میری ذات الٹ چکی ہے اس لیے آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ میں آج کل قیامت کی زد میں ہوں۔ میرے لیے اس سے بڑی قیامت اور کوئی بھی نہیں ہوگی۔"

عزت بے حد لاپروا نظر آ رہی تھی اور ولید نے بے اختیار اس کی سمت دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر عزت نے ٹارچ عین اس کے چہرے پر فوکس کر رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کے چہرے کی سمت دیکھنے سے محروم رہ گیا تھا۔

"عزت پلیز۔۔۔! میں نے آپ کو ٹارچ اس لیے دی ہے کہ آپ ٹائر پر روشنی ڈالیں تاکہ میں اسے چینج کر سکوں۔" ولید نے ایک بار پھر بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن میں آپ پہ روشنی ڈال رہی ہوں تاکہ میں آپ کو دیکھ سکوں اور اچھی طرح دیکھ سکوں۔" عزت نے بڑے ہی موڈ اور بڑے ہی مزے سے کہتے ہوئے ولید کے چہرے اور بالوں کو ٹارچ کی روشنی سے چھوا تھا۔

ولید بڑے ضبط سے اس کی اس حرکت کو نظرانداز کر کے اپنے کام میں لگا رہا اس نے مزید کچھ نہ بولنے کی جیسے قسم کھائی تھی۔

"کبھی کسی لڑکی نے کہا تم سے کہ تم کتنے اٹریکٹیو ہو؟"

"عزت پلیز! ایک لڑکی کو یہ زیب نہیں دیتا۔ اپنی عزت کا خیال رکھیں۔"

ولید سے برداشت نہ ہوا تو اس نے یک دم اٹھ کر عزت کے ہاتھ سے ٹارچ چھین لی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی۔ کیونکہ وہ بات ہی ایسی کہہ گیا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ آپ "عزت" کا خیال رکھیں تو؟" وہ بہت فریش اور معنی خیز سے انداز میں کہتی ہوئی اس کے سامنے ذرا اسٹائل سے کھڑی ہو گئی تھی تاکہ وہ اسے ٹارچ کی روشنی میں اسی طرح دیکھ سکے جیسے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

لیکن اسے یوں اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر ولید کی نظریں اس کے وجود کی خوب صورتی اور رعنائی کے بوجھ سے خود بخود ہی جھک گئی تھیں وہ اسے نظر بھر کے دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور ٹارچ کا رخ بھی نیچے کر لیا تھا اور نفی میں سرہلایا تھا۔

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔" اس نے کہتے ہوئے رخ موڑ لیا تھا۔

"لیکن کیوں؟ وجہ جان سکتی ہوں؟" وہ تڑپ کے اس کے سامنے آئی تھی۔

"عزت۔۔۔! آپ مجھے اور اپنے آپ کو آزمائش میں ڈال رہی ہیں' پلیز باز آجائیں اس کھیل سے۔ بہت خطرناک انجام نکلنا ہے اس کا۔" اس نے پھر اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"جب میں نے کہہ دیا ہے کہ میں ہر انجام کے لیے تیار ہوں تو پھر آپ کو کیا مسئلہ ہے آخر؟ یا پھر مجھ میں کوئی کمی نظر آتی ہے اگر ایسا ہے تو بھی صاف صاف بتائیں۔ دامن کیوں بچا رہے ہیں آپ۔۔۔؟" عزت نے اس سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

"نہیں۔۔۔! ایسا نہیں ہے' آپ میں کوئی کمی نہیں ہے' آپ ماشاء اللہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہیں۔ بس بات یہ ہے کہ میں پرفیکٹ نہیں ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر مجھے کیوں پرفیکٹ نظر آتے ہیں آپ۔۔۔؟"

وہ الٹا اس پہ سوالیہ ہوئی تھی۔

"کوئی کمی ایسی بھی ہوتی ہے' جو بظاہر نظر نہیں آتی' مگر انسان کو خود پتا ہوتا ہے کہ مجھ میں یہ کمی ہے اس لیے مجھے بھی پتا ہے کہ مجھ میں کیا کمی ہے؟ اور کہاں کمی ہے؟"

ولید کافی آہستگی اور تحمل سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اور اگر میں آپ کی کسی کمی کو کمی نہ مانوں تو۔۔۔؟" وہ بھلا کب بہلنے والی تھی۔

"تو یہ آپ کی کم عقلی ہوگی' نادانی ہوگی۔" ولید نے استہزائیہ سا انداز اپنایا تھا۔

"اور کم عقل اور نادان لوگ کچھ بھی کر جاتے ہیں' اس لیے یہ بھی ذہن میں رکھیے گا کہ میں بھی کچھ بھی کر سکتی ہوں وہ بھی صرف ولید رحمان کی چاہ میں۔۔۔"

عزت نے صاف گوئی پر اعتراف کیا تھا اور ولید ٹھٹک کے رہ گیا تھا۔

اس نے فوراً" عزت کی طرف دیکھا تھا مگر وہ پلٹ کر چند قدم دور چلی گئی تھی اور پھر اس کی چپ پہ چپ ہو کر ولید نے اگلے چند منٹوں میں ٹائر چینج کیا۔ ڈگی بند کی اور گاڑی کی چابی عزت کی طرف بڑھا دی تھی جسے عزت نے خاموشی سے تھام لیا تھا۔

"میرے دل میں داخل ہو چکے ہیں آپ۔۔۔ میرے لیے آپ کے دل کے دروازے کھلے ہیں یا نہیں۔ یہ آپ کو سوچنا ہے۔ اب فیصلہ اگلی ملاقات پہ رہا۔"

وہ اسے نپے تلے الفاظ میں آگاہ کرتی آگے بڑھی اور گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اڑا لے گئی تھی اور اس کے پیچھے ولید کو بھی اپنی بائیک اسٹارٹ کرنا پڑی تھی، وہ دونوں روڈ پہ آگے پیچھے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼
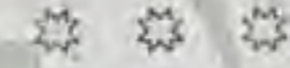
"آپ کی بارات کہاں سے آ رہی ہے مس فارہ۔۔۔؟"

فارہ آج اپنی اسکن ٹریٹ منٹ کے لیے پارلر آئی ہوئی تھی اور بیوٹیشن اس کے فیشل اور مساج وغیرہ میں مصروف تھی جب ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی ایک لڑکی نے اس سے گپ شپ کے لیے سوال اٹھایا تھا۔

"کراچی سے۔۔۔" فارہ نے بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔

"ارے واہ۔! میں بھی کراچی سے ہی ہوں، آج کل اپنی ننھیال اپنے نانا اور نانی سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہوں، بس ایک دو روز میں واپس جانے کی تیاری ہے۔"

وہ لڑکی بہت ہی ہنس مکھ اور خوش اخلاق سی لگ رہی تھی، مگر فارہ کو ماورا کے سوا کسی کے ساتھ بھی پینگیں بڑھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

"ہوں۔۔۔! اچھی بات ہے۔" اس نے محض اتنا سا جواب دیا تھا۔

"ویسے لڑکے کا نام کیا ہے؟ کیا کام کرتا ہے وہ؟" فارہ بے زار ہو رہی تھی کہ وہ خوامخواہ دلچسپی لے رہی ہے اس میں۔۔۔

"آفاق یزدانی نام ہے اس کا۔۔۔ اپنا بزنس کرتا ہے وہ۔۔۔" فارہ نے بڑے لٹھ مار قسم کے انداز میں بتایا تھا۔

"آفاق یزدانی۔۔۔؟ انیق یزدانی کا بھائی۔۔۔؟" وہ لڑکی زیر لب دہرا کے رہ گئی تھی اور اس کا رنگ ذرا سا متغیر ہوا تھا مگر پھر اس نے فوراً" ہی اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا تھا۔ وہ سنبھل گئی تھی شاید۔۔۔

لیکن نجانے کیسے فارہ بھی اس کے چہرے کی سمت دیکھ بیٹھی تھی اور اسے بھی اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات میں اک عجیب سا احساس محسوس ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ نام سن کر چپ کیوں ہو گئی ہیں؟ کیا آپ جانتی ہیں آفاق یزدانی کو؟"

"نہیں۔۔۔! میں جانتی نہیں ہوں، مگر مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے یہ نام کہیں سنا ہوا ہے۔" وہ لڑکی صاف ٹال گئی تھی لیکن فارہ کا ذہن مطمئن نہیں ہوا تھا۔

اس کے دماغ میں اک عجیب سی ٹک ٹک ہونے لگی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" اب فارہ کی باری تھی سوال کرنے کی۔

اور اب وہ لڑکی کترانے کی کوشش میں تھی۔

کیونکہ فارہ انجان تھی اور وہ لڑکی سب کچھ جانتی تھی۔۔۔ سب کچھ۔۔۔!!!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

جب زہرہ بتول، میر مکرم کے سنگ رخصت ہو کر بڑی حویلی پہنچی تو اس کی پھوپھی یعنی میر مکرم کی ماں نے اسے حجلہ عروسی میں بٹھاتے ہوئے پہلی جو بات ذہن نشین کروائی، وہ یہ تھی کہ اس کا اور میر مکرم کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور زہرہ بتول کا سر زندگی بھر میر مکرم کے سامنے جھکا رہنا چاہیے۔

"تو میری بھتیجی ہے زہرہ! مجھے پیاری بھی ہے لیکن تو حقیقت میں کتنی پیاری ہے۔ یہ تو سامنے دیوار پر لگا آئینہ بھی تجھے بتا سکتا ہے۔ میں نے اپنے مرحوم بھائی کو زبان دے رکھی تھی، اس لیے تو آج میری بہو کی حیثیت سے یہاں بیٹھی ہے۔ ورنہ میرے شہزادوں جیسے بیٹے کا تیرے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں۔ وہ آسمان ہے اور تو زمین، وہ تجھے اپنی پہلی اور خاندانی بیوی بنا کر یہاں لایا ہے، اس کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھنا اور زندگی میں وہ جو کچھ کرنا چاہے اس پر کبھی سوال نہ کرنا۔"

پھوپھی زینب نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا اور یہ بات زہرہ کے لیے نئی نہ تھی۔ وہ پھر اس کی پھوپھی تھی، اس کی تو اپنی ماں نے بھی اسے یہ ہی کچھ سمجھا کر بھیجا تھا۔

"یہ تیری پھوپھی کی اعلا ظرفی ہے زہرہ! کہ اس نے اپنی زبان کا پاس رکھا، ورنہ میر مکرم کے لیے وہ برادری کی حسین ترین لڑکی پر بھی انگلی رکھتی تو لڑکی والے سوچنے کے لیے دو منٹ کی مہلت بھی نہ مانگتے۔ ظاہر ہے وہ اپنے باپ کا بڑا بیٹا ہے۔ قبیلے کی سرداری بھی اسے ملے گی اور درگاہ کی گدی بھی۔ میر شہباز کا سیاسی جانشین بھی میر مکرم ہی ہے۔ پھر ایسا خوبرو، ولایت کا پڑھا ہوا بندہ۔ تیرا اور اس کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں زہرہ بتول!"

"پڑھی لکھی تو میں بھی ہوں اماں! خاندان کی پہلی لڑکی ہوں، جس نے یونیورسٹی کی شکل دیکھی ہے۔" زہرہ نے دھیمے لہجے میں ماں کو مخاطب کیا تھا۔ ہاجرہ نے اس کی کم عقلی پر اسے تاسف بھرے انداز میں گھورا۔

"اپنے سولہ جماعت پاس کرنے پر گھمنڈ کرنے کی ضرورت نہیں زہرہ بتول! اگر تو صرف آٹھ جماعت پاس ہوتی لیکن رنگ روپ اور نین نقش اپنے ددھیال کے چرائے ہوتے تو شاید تیرا اور میر مکرم کا رشتہ اتنا بے جوڑ نہ لگتا۔"

ہاجرہ ماں تھی پھر بھی سچ بولتے ہوئے سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ مقصد یہی تھا کہ زہرہ اپنی حیثیت کو پہچان کر میر مکرم کی زندگی میں شامل ہو۔

"اپنی تعلیم پر گھمنڈ میں کیوں کروں گی اماں! ایسا شخص پڑھا لکھا، جاہل کہلانے کا حق دار ہوتا ہے، تعلیم تو شعور دیتی ہے، باطن کو اجلا کرتی ہے۔"

زہرہ بتول نے ماں کو مخاطب کیا۔ ہاجرہ اس بار چپ رہی تھی، جانتی تھی اس کی بیٹی کا اندر کتنا اجلا ہے، لیکن دنیا والے کب اندر جھانک کر دیکھتے ہیں۔ انہیں تو ظاہری خوب صورتی سے سروکار ہوتا ہے اور ان کی زہرہ اسی چیز سے محروم تھی۔ سانولی رنگت، درمیانہ قد اور واجبی سے نین نقش۔۔۔ یہ تھی ان کی اور میر سجاول کی لاڈلی زہرہ بتول۔

☼ ☼ ☼

میر سجاول خاندان کے دوسرے مردوں سے بہت مختلف تھے۔ بیٹی پر بیٹوں سے بڑھ کر جان چھڑکتے۔ خاندان کی مخالفت مول لے کر انہوں نے زہرہ کو اعلا تعلیم دلوائی تھی۔ زہرہ نے بھی باپ کے مان اور بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ بہت عزت اور وقار سے اس کا تعلیمی سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ اب وہ اپنی تعلیم کو بروئے کار لاتے ہوئے علاقے کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقامی سطح پر کوئی مناسب بندوبست کرنا چاہتی تھی۔

میر سجاول اس کار خیر میں اس کے ساتھ تھے لیکن ان کی زندگی اب ان کا مزید ساتھ دینے کو تیار نہ تھی۔ کینسر جیسے موذی مرض نے جانے کب سے ان کے جسم میں پنجے گاڑ رکھے تھے اور جب تشخیص ہوئی تو وہ بے فائدہ رہی کہ اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کی مہلت بس ختم ہوا چاہتی تھی۔ تب میر سجاول کو بیٹی کے مستقبل کی فکر ستائی تھی۔ زینب ان کی بڑی بہن تھی جو سگے تایا زاد سے بیاہی گئی تھی۔ قبیلے کے سردار کی بیوی تھی۔ مزاج میں بہت طنطنہ اور غرور تھا، لیکن جب معاملہ بھائی کا ہو، بلکہ قریب المرگ بھائی کا تو بہن کا دل پسیج کر اتنا نرم پڑ جاتا ہے کہ وہ اپنے شہزادوں جیسے بیٹے کا رشتہ زہرہ جیسی معمولی شکل و صورت والی لڑکی سے جوڑنے میں ذرا ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتی۔

میر سجاول کے سرہانے بیٹھی زینب ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے بھائی کو دیکھ کر اپنے آنسو اپنے اندر اتار رہی تھی، جب میر سجاول نے نقاہت بھری آواز میں بہن کو مخاطب کیا۔

"میرے بعد میری زہرہ کا خیال رکھنا ادی! کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اسے گھر بار کا کر دینا۔ زرینہ دوسرے قبیلے کی ہے۔ اتنے برسوں بعد بھی ہماری برادری نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ بیٹی کا بر کیسے

ڈھونڈے گی۔" میر سجاول نے بیوی کا نام لیتے ہوئے بہن سے اپنی پریشانی بانٹی تھی۔

زینب کا دل بھر آیا۔ ان کا بھائی کیسی آن بان والا تھا۔ جوانی میں اس نے ہر کام اپنی مرضی سے اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا تھا۔ خاندان، برادری کی ناراضی کو قطعی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دوسرے قبیلے سے تعلق رکھنے والے اپنی دوست کی بہن سے بیاہ رچایا تھا۔ اسے بھرپور عزت احترام سے اپنی زندگی میں شامل کیے رکھا۔ زہرہ پہلوٹی کی بیٹی تھی۔ کالی کلوٹی سی بیٹی کے وہ اتنے چاؤ اٹھاتا کہ ماں بہنوں کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگتا۔ بیٹی کو اسکول داخل کروایا تو خاندان میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ زہرہ کالج جانے لگی تو ایک اور ہنگامہ ہوا اور پھر یہ میر سجاول کی ہمت ہی تھی کہ اس کی بیٹی نے یونیورسٹی تک کی شکل دیکھ لی۔ ایک عرصے تک خاندان والے اس سے ناراض رہے تھے لیکن اب معاملہ ایسا تھا کہ سب ناراضی بھلائے اس کے آس پاس جمع رہتے اور اس کے چہرے کو نگاہوں میں جذب کرتے رہتے۔ زینب بھی ماضی میں بھائی کو سخت سست سناتی تھی لیکن آج جب بیٹی کے لیے پریشان ہوتے بھائی کی نحیف آواز سنی تو اس سے رہا نہ گیا۔

"سجاول! کیوں پریشان ہو رہا ہے۔ میں میر مکرم کی دلہن بناؤں گی تیری زہرہ کو اور تو اس کی ڈولی اٹھنے تک سلامت رہے گا۔"

میر سجاول کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میر مکرم خاندان کا سب سے لائق فائق اور خوبرو لڑکا تھا۔ ابھی حال ہی میں وہ باہر سے تعلیم کا سلسلہ مکمل کر کے وطن لوٹا تھا۔ میر سجاول بہن کی بات سن کر بہت خوش اور مطمئن ہو گئے تھے لیکن زینب کی بات پوری نہ ہو سکی تھی۔ زہرہ کی ڈولی اٹھنے سے پہلے میر سجاول کا جنازہ اٹھ گیا تھا۔

میر سجاول کے گزرنے کے بعد زینب کو بہت لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ میر مکرم کے لیے زہرہ کے بجائے کوئی اور لڑکی ڈھونڈے، مرتے بھائی کو دو حرفی تسلی ہی دی تھی نا کون سا بالکل رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ زہرہ اور میر مکرم کا کوئی جوڑ ہی نہ تھا۔ زینب کو بھی یہ حقیقت تسلیم تھی کہ میر مکرم اور زہرہ کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ لیکن وہ میر سجاول کی آنکھوں کی چمک کیسے بھلا دیتی۔ اس کی تسلی کے بعد اس کا ماں جایا کیسا مطمئن ہو کر دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

زینب نے بھائی سے کیا ہوا وعدہ نبھایا تھا۔ زرینہ کی عدت ختم ہونے کے بعد وہ زہرہ کو میر مکرم کے سنگ رخصت کروا کر بڑی حویلی لے آئی۔ زرینہ ساری عمر نند کے رویے سے شاکی رہی تھی۔ لیکن اب اس کا احسان اتنا بڑا تھا کہ زرینہ کے ذہن میں شکریے کے الفاظ نہ آپاتے۔ وہ زہرہ کی ماں تھی۔ زہرہ کے لیے اس کے دل میں چھپی محبت بے پایاں تھی لیکن وہ یہ جانتی تھی کہ زہرہ خوب صورت تو دور کی بات قبول صورت بھی نہیں ہے۔ میر مکرم جیسا لڑکا اس کی زہرہ کا جیون ساتھی بنا، یہ بڑے نصیب کی بات تھی۔ اس نے زہرہ کو باور کروا دیا تھا کہ وہ کبھی میر مکرم کے سامنے گردن نہ اٹھائے اور یہی بات سہاگ رات میر مکرم نے بھی زہرہ کو جتا دی تھی۔

"تم پڑھی لکھی لڑکی ہو اور پڑھائی دماغ میں کیسا خناس بھر دیتی ہے، میں جانتا ہوں۔ میرے سامنے کبھی زبان چلانے کی کوشش نہ کرنا، مجھے زیادہ بولنے والی عورتیں زہر لگتی ہیں۔"

زہرہ نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر شوہر کو دیکھا۔ تیکھی مغرور نگاہیں، کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، بے تحاشا وجاہت رکھنے والا یہ شخص۔۔۔ مگر اس کا لب و لہجہ۔۔۔ کیا یہ واقعی باہر سے پڑھ کر آیا تھا۔ زہرہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہ پائی۔ ابھی اس نے چند لمحوں پہلے ہی تو جتایا تھا کہ اسے زیادہ بولنے والی عورتیں زہر لگتی ہیں۔ کم گو تو وہ پہلے بھی تھی، صرف اپنے مرحوم باپ سے دنیا جہان کی باتیں کرتی تھی۔ باپ کے بعد تو جیسے اس کی گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اب اس نے اپنے لب مزید سی لیے۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑی حویلی کی بڑی بہو نہ تھی ایک روبوٹ تھی۔ پندرہ بیس دن بعد میں مکرم کو بیوی کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ بیوی کا فریضہ نباہ دیتی۔ جب اس کی پھوپھی اسے کوئی ذمہ داری سونپتی تو وہ بہو کا فریضہ سرانجام دے دیتی۔ اس کے خواب اس کے تصور سب جیسے اس کے باپ کے ساتھ مٹی میں مل گئے تھے۔ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ زندگی میں کیا کر دکھانا چاہتی تھی سب کچھ بھلائے نئی زندگی سے مانوس ہونے کی لاحاصل کوشش کرتی رہتی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی بھی خوب صورت نہیں رہی لیکن پہلے اسے زندگی خوب صورت لگا کرتی، لیکن جب اس زندگی میں خوب صورت جیون ساتھی شامل ہوا تو جیسے زندگی کی خوب صورتی اڑن چھو ہو گئی۔ حویلی کی ملازمائیں اسے میر مکرم کی سرگرمیوں کے متعلق چپکے چپکے رپورٹ دیتی رہتی تھیں۔ پروین کا میاں میر مکرم کا ڈرائیور تھا۔ شہر میں میر مکرم کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ پروین کو اس کے ہر پل کی آگاہی تھی اور وہ زہرہ تک یہ ساری معلومات پہنچانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

زہرہ شروع شروع میں چپ چاپ سن لیتی تھی پھر اس نے پروین کو ٹوک دیا۔ اسے اپنے خوب صورت مگر رنگین مزاج شوہر کی داستانوں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ شوہر سے اس کا تعلق اتنا مضبوط ہی کب تھا کہ اسے اس کے ہرجائی پن سے تکلیف ہوتی۔

زہرہ نے اللہ سے اپنا تعلق استوار کر لیا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس تعلق میں مزید گہرائی اور مضبوطی آتی جا رہی تھی۔ مطالعے سے اسے پہلے بھی بہت دلچسپی تھی لیکن اب اس دلچسپی کو ایک جہت مل گئی تھی۔ اس کے بیڈ روم میں کتابوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ اس مشغلے پر کوئی اعتراض کر سکتا تھا لیکن احادیث اور تفسیر کی موٹی موٹی کتابیں دیکھ کر اعتراض کرنے والے متاثر، مرعوب اور خاموش ہو جاتے۔ میر مکرم بھی جب ایک دن شہر سے لوٹا تو کمرے میں کتابوں کا انبار دیکھ کر چڑ گیا۔

"بیڈ روم کو بیڈ روم ہی رہنے دو تو بہتر ہے زہرہ بتول صاحبہ! مطالعے کا اتنا شوق ہے تو اسٹڈی روم کو اپنا بیڈ روم بنا لو۔"

اس نے تو شاید طنز ہی کیا تھا مگر جب وہ اگلی بار آیا تو بیڈ روم شفٹ ہو چکا تھا۔ میر مکرم نے بازپرس کرنا ضروری نہ سمجھا۔ ویسے بھی مہینے میں محض دو یا تین بار وہ اس کے ساتھ بیڈ روم شیئر کرتا تھا۔ اسے اس تبدیلی سے چنداں فرق نہ پڑا لیکن اس کی ماں کو اب زہرہ کی سونی گود سے فرق پڑنے لگا تھا۔

"ایک تو تیری شکل کسی قابل نہیں۔ اوپر سے میاں کو لبھانے کے کوئی گر نہیں آتے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو شوہر کو قابو کر لیتی۔ تو نے تو شوہر کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ تیرے پاس تو وہ پھٹکتا بھی نہیں گود کیسے ہری ہوگی۔"

زہرہ نے پھوپھی کو دیکھا۔ اس نے اسے پہلے دن نصیحت کی تھی کہ کبھی میر مکرم کے کسی کام پر اعتراض نہ کرنا اور اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے شوہر کو قابو میں کیوں نہیں کیا۔ اگلے ہی پل اسے پھوپھی پر پیار بھی آیا۔ تھی تو وہ اس کی بھتیجی ہی نا۔ بھلے زبان سے پھوپھی جو مرضی کہے، لیکن اسے زہرہ کی فکر تھی۔

اگلی بار میر مکرم گاؤں آیا تو واپسی پر زہرہ اور پھوپھی بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔ پھوپھی زینب نے شہر کی مشہور گائنا کولوجسٹ سے اس کا معائنہ کروایا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چند دوائیں کھانے کو دیں۔ میر مکرم کے منع کرنے کے باوجود پھوپھی چند دن کے لیے زہرہ کو اس کی شہر والی کوٹھی میں چھوڑ کر واپس گاؤں روانہ ہو گئی تھی۔ میر مکرم کے دوستوں کی شہری بیویاں بہت شوق سے زہرہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ ایک تو وقت رخصت بہت بے تکلفی سے میر مکرم کو فرنگیوں کی زبان میں مخاطب کرتے ہوئے جتا دیا تھا کہ اسے میری بیوی کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ اتنا بے جوڑ کپل اس نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ جواباً" میر مکرم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"انگلش میں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ممتاز بھابھی! ان محترمہ نے بھی انگلش میں ہی ماسٹرز کر رکھا ہے۔" شاید وہ یہ بات نہ کرتا تو زہرہ کو اتنی خفت محسوس نہ ہوتی۔ کاش وہ عورتیں یہی سمجھتی رہتیں کہ وہ اس گفتگو سے لاعلم ہے۔ احساس ذلت اور توہین سے اس کا سانولا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اس نے پھوپھی کو فون کر دیا کہ وہ واپس آنا چاہتی ہے۔

"ایک مہینے وہیں ٹکی رہ زہرہ! اگلے مہینے ڈاکٹرنی سے پھر چیک اپ کروانا ہے اور اس نے جو دوائیاں دی ہیں۔ شوہر کے پاس رہنا ضروری ہے۔ تو بچی تو نہیں جو میں بار بار بے شرم بن کر ایک ہی بات سمجھاؤں۔"

پھوپھی زینب نے اسے جھڑک دیا تھا اور شکر ہے اس کی آزمائش طویل نہیں ہوئی۔ اگلے ماہ مثبت رپورٹ لے کر پھوپھی زینب خوشی خوشی اسے ساتھ لیے گاؤں واپس آگئیں۔ اب ان کی بلا سے میر مکرم بیوی کے پاس پھٹکے یا نہ پھٹکے۔ انہیں کیا فرق پڑتا تھا اور فرق تو زہرہ بتول کو بھی نہ پڑتا تھا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب میر مکرم نے باقاعدگی سے اس کے پاس چکر لگانا شروع کر دیے تھے۔

"کتنی کمزور ہو تم۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ دودھ، فروٹ، جوس، جس چیز کا دل کرے، ملازماؤں سے کہہ کر فوراً" منگوا لیا کرو۔ شہر سے کچھ منگوانا ہوا کرے تو مجھے بتایا کرو، میں آتے ہوئے لے آیا کروں گا۔" نرم لہجے میں بات کرتا ہوا یہ میر مکرم ہی تھا یا کوئی اور۔۔۔ زہرہ نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اس کی حیرت بھانپ گیا تھا۔

"مجبوری ہے، میری خاندانی بیوی بننے کا اعزاز تمہیں حاصل ہے، میری نسل تم سے ہی چلنی ہے۔ تمہارا نہیں اپنے ہونے والے بچے کا خیال ہے۔ کوئی خوش فہمی پالنے کی ضرورت نہیں۔"

زہرہ نے پھر سر جھکا لیا تھا۔ نو ماہ بعد اس کی کوکھ سے نورالعین نے جنم لیا تو وہ کچھ متوحش ہو گئی۔ پھوپھی زینب نے ساری تیاری لڑکے کے لیے کی تھی۔ جیسے انہیں ایک سو ایک فیصد یقین ہو کہ میر مکرم کے ہاں پہلوٹھی کا بیٹا ہی پیدا ہوگا مگر بچی کا سن کر پھوپھی زینب کا واقعی منہ بن گیا تھا، لیکن بچی کے ڈھیروں ڈھیر سامان سے لدا پھندا میر مکرم شہر سے گاؤں آن پہنچا۔ وہ بیٹی کو گود میں لیے والہانہ پیار کر رہا تھا۔ زہرہ کے دل میں سکون اتر گیا۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے متعلق قطعی اور حتمی اندازہ کیسے لگا سکتا ہے۔ اس کے دل میں میر مکرم کے لیے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ بیٹی سے اس کا پیار دیکھ کر اس کی ماں کچھ چڑ گئی تھی۔

"اس خاندان میں پہلی بہو کے پاس ہمیشہ پہلوٹھی کا بیٹا ہوتا آیا ہے۔ جانے اس بار۔۔۔" آگے کا فقرہ پھوپھی زینب منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

"اچھا تو کیا واقعی اس خاندان نے اللہ سے ایگریمنٹ طے کر رکھا ہے کہ ہمیشہ پہلوٹھی کا بیٹا ہی ہوگا ہو سکے تو اس ایگریمنٹ کی ایک فوٹو کاپی مجھے بھی عنایت کر دیں۔" اس کی بھوری آنکھیں شرارتی انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ ماں کو دیکھ رہا تھا اور زہرہ اسے۔ شادی کے بعد اس نے پہلی بار دل میں تسلیم کیا کہ میر مکرم واقعی بلا کا خوب صورت ہے۔

"تم نے اس کا کیا نام سوچا ہے؟" اس نے اچانک زہرہ کی طرف دیکھا اور زہرہ جو اسے ہی تک رہی تھی گڑبڑا کر رہ گئی۔

"نورالعین۔۔۔ میرے ذہن میں اپنی بیٹی کو دیکھ کر یہ ہی نام آیا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔" وہ زہرہ سے پوچھ رہا تھا۔ زہرہ نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"بس پھر آج سے یہ ہم سب کی نورالعین ہے۔ میری، زہرہ کی اور ماں کی۔" اس نے بچی کو زینب کی گود میں دے دیا۔ بچی نہ تو پوری طرف مکرم پر پڑی تھی نہ زہرہ پر۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ نہ وہ میر مکرم جتنی خوب صورت تھی، نہ زہرہ جیسی کم صورت، لیکن جیسی بھی تھی۔ زینب کی پوتی تھی۔ گود میں آئی تو زینب نے بے ساختہ ماشاءاللہ کہہ کر اس کی پیشانی پر لب رکھ

لیے۔

نورالعین میں میر مکرم کی جان تھی۔ پہلے وہ مہینے میں ایک دوبار گاؤں آتا تھا۔ اب ہفتے میں دو چکر لگالیتا۔ زہرہ سے بھی اس کا رویہ قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ نورالعین کے حوالے سے دونوں ایک دوسرے کو مخاطب کر کے باتیں کر لیتے تھے۔

زہرہ کو لگنے لگا کہ وہ بھی چپکے چپکے اپنے بے پناہ وجیہہ شوہر کو چاہنے لگی ہے۔ اسے اس کا انتظار رہنے لگا اور زندگی بھی خوب صورت لگنے لگی ہے۔ تب ایک دن میر مکرم نے نورالعین کے ساتھ مل کر بلاکس کا گھر بناتے ہوئے سرسری سے لہجے میں زہرہ کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اگلے مہینے شہر میں دوسری شادی کر رہا ہے۔

زہرہ نے کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے مگر پھر۔۔ بند کر لیے۔ شدید غصے کے عالم میں اس نے نورالعین کو مکرم کے پاس سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھایا۔ وہ اس سے جھگڑنا چاہتی تھی۔ ابھی تو اس نے میر مکرم پر اپنا حق سمجھنا شروع کیا تھا۔ وہ میر مکرم کی بیٹی کی ماں تھی۔ کچھ عرصے بعد اس کے ہاں دوسری ڈیلیوری متوقع تھی۔ بے تاب پھوپھی زینب نے اس بار ڈاکٹرنی سے الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے ذریعے معلوم کر لیا تھا کہ اس بار نورالعین کا بھائی آنے والا ہے۔ زہرہ اسے وارث بھی دینے والی تھی۔ پھر اسے بیٹھے بٹھائے دوسری شادی کی کیا سوجھی۔ شہر میں وہ جو کچھ بھی کرتا تھا۔ زہرہ نے کبھی اس پر اعتراض تو نہ کیا تھا۔ پھر وہ اس پر سوتن کیوں لا رہا تھا۔ زہرہ کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔ کیونکہ میر مکرم نے اس کے قریب آ کر بہت نرمی سے اس کی گود سے نورالعین کو لیتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

"مجھے شوہروں سے سوال جواب کرنے والی بیویاں بالکل اچھی نہیں لگتیں زہرہ بتول! زیادہ بولنے والی عورتیں مجھے کتنی بری لگتی ہیں، یہ بات میں پہلے بھی کئی بار تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"کئی بار؟" زہرہ بتول کی آنکھوں میں شکوہ ابھرا تھا۔

اس نے محض ایک بار یہ بات کہی تھی اور زہرہ نے پلو سے باندھ لی، پھر جانے کیوں آج وہ یہ بات بھول گئی تھی۔ غلطی اس کی تھی۔ اس نے میر مکرم کو شوہر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ وہ دونوں بھی اچھے میاں، بیوی بن کر ایک دوسرے کے ساتھ خوش گوار ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہ بھول گئی تھی کہ میر مکرم اور اس کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں۔

☼ ☼ ☼

میر مکرم شادی کے کچھ دنوں بعد اپنی دوسری بیوی کو حویلی لے کر آیا تھا۔ وہ لڑکی واقعی اس کے جوڑ کی تھی۔ بے تحاشا حسین، بے تحاشا فیشن ایبل اور بے تحاشا باتونی۔ پھوپھی زینب سے، میر مکرم سے، نورالعین سے، حویلی کی ملازماؤں سے حتیٰ کہ خود زہرہ بتول سے بھی وہ خوب گپیں لگاتی۔ زہرہ تو خیر اس کی باتیں سننے پر ہی اکتفا کرتی۔ وہ اس سے ایک بار بھی یہ نہ پوچھ پائی کہ کیا میر مکرم نے سہاگ رات اس سے یہ نہیں کہا کہ اسے زیادہ بولنے والی عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔

خیر۔۔ حیرت انگیز طور پر زہرہ کو فاریہ بری نہ لگی۔ اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ میر مکرم پر اس کا کوئی حق نہیں۔ یہ میر مکرم کی اعلا ظرفی تھی کہ وہ ایک بے جوڑ رشتہ نبھا رہا تھا، ورنہ اسے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ جب فاریہ جیسی حسین و جمیل لڑکی نے اس کی دوسری بیوی بننا قبول کر لیا تھا تو وہ پہلی شادی کے لیے بھی جس لڑکی کو منتخب کرتا، وہ خوشی خوشی اس کی زندگی میں شامل ہو جاتی۔ زہرہ کی خوشی کے لیے فقط یہی بات کافی تھی کہ میر مکرم اس کی کوکھ سے جنے بچوں پر جان چھڑکتا تھا۔

نورالعین اس کے بعد میر سبط اور پھر میر شاہ زر۔۔ تینوں بچوں کی باپ میں اور باپ کی ان میں جان تھی۔ بیٹوں سے بھی وہ والہانہ پیار کرتا، مگر جو حیثیت نورالعین کی تھی وہ تو شاید اس کے دونوں بیٹوں کی بھی نہ تھی۔ زہرہ کو لگتا کہ فقط اس معاملے میں میر مکرم اپنے مرحوم ماموں یعنی زہرہ کے باپ میر سجاول پر گیا ہے۔ وہ بیٹی کو بیٹوں سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

پھوپھی زینب اور اس کے دوسرے سسرال والوں کی مرضی کے خلاف اس نے نورالعین کو چھوٹی عمر میں بورڈنگ میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ وہ بیٹی کی پڑھائی پر کوئی سمجھوتا نہ کرنا چاہتا تھا۔ زہرہ پر بیٹی کی جدائی بہت گراں گزرتی مگر اس کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے وہ میر مکرم کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہ کرتی۔ نورالعین ماں کی نسبت باپ سے زیادہ بے تکلف تھی۔ باپ ہنسی خوشی اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ نورالعین کو باپ کی طرح گھڑ سواری کا شوق تھا۔ میر مکرم نے بیٹی کے خالص مردانہ شوق پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس نے اسے خود رائیڈنگ سکھائی۔ باپ شکار پر جاتا تو میر سبط اور میر شاہ زر کے ساتھ نورالعین بھی باپ کے ہمراہ ہوتی۔ جب اس کی چھٹیاں ہوتیں تو وہ آدھی چھٹیاں ماں کے ساتھ گاؤں گزارتی تو باقی آدھی شہر میں میر مکرم اور فاریہ کے ساتھ۔ فاریہ شاید میر مکرم سے بہت پیار کرتی تھی، جب ہی اس کے تینوں بچے بھی اسے بہت پیارے تھے۔

وہ تینوں بہن بھائی، زہرہ کو ماں کہہ کر مخاطب کرتے تو فاریہ کو ممی کہتے تھے۔ فاریہ، زہرہ بتول کو آپا کہتی تھی۔ نہ صرف آپا کہتی تھی، بلکہ بڑی بہنوں والا مقام اور مرتبہ بھی دیتی تھی۔ وہ واقعی عجیب لڑکی تھی۔ شہر سے زہرہ کے لیے ڈھیروں شاپنگ کر کے بھجواتی رہتی۔ جدید تراش خراش کے سوٹ، میک اپ کا ڈھیروں سامان، ہینڈ بیگ، جوتے، غرض میر مکرم کے ہر چکر پر فاریہ، زہرہ کے لیے کچھ نہ کچھ بھجواتی رہتی۔

"جب تمہیں پتا ہے کہ میں یہ سب چیزیں استعمال نہیں کرتی تو کیوں بھجواتی ہو اتنا کچھ، میرے پاس تمہاری بھجوائی ہوئی چیزوں کا ڈھیر جمع ہو چکا ہے۔ پلیز آئندہ کچھ مت بھجوانا۔" زہرہ نے ایک بار فون کر کے اسے منع ہی کر ڈالا۔

"پلیز زہرہ آپا! اپنے لیے نہیں تو میرے لیے اپنا خیال رکھا کریں۔ یہ جو آپ کے میر مکرم ہیں نا، یہ ایک عورت کے قابو میں آنے والے نہیں۔ جیسے جیسے موصوف کی عمر ڈھل رہی ہے۔ وجاہت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اکیلی کب تک ان کی چوکیداری کروں۔ سچ زہرہ آپا! اب تھکنے لگی ہوں۔ اگر آپ بھی کمر کس کر میدان میں آ جائیں تو مجھے کچھ ریلیف ملے۔ یہاں شہر میں ایک سے بڑھ کر ایک بیوٹی سیلون موجود ہے۔ عورتیں کچھ کی کچھ ہو کر نکلتی ہیں وہاں سے۔ میں اس بار آپ کو زبردستی اپنے ساتھ شہر لے کر آؤں گی۔ یقین کریں آپ میں اتنا چینج آ جائے گا کہ میر مکرم آپ کو پہچان ہی نہ پائیں گے۔" وہ عجیب سوکن تھی جو شوہر کو اس کی پہلی بیوی کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھی۔

"اس سب سے کیا حاصل فاریہ؟" زہرہ مسکرائے بنا نہ رہ پائی۔

"ارے واہ! آپ کو کچھ حاصل ہو نہ ہو، مجھے تو ہو گا۔ آپ تو ازلی بے نیاز ہیں۔ اتنی آسانی سے میر مکرم کو میرے ساتھ شیئر کر لیا۔ میں تو ان کی زندگی میں کسی تیسری عورت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ہم دونوں کو مل کر اپنے شوہر کو قابو کرنا ہو گا زہرہ آپا! وہ آپ کے اور میرے علاوہ کسی اور طرف نگاہ ہی نہ اٹھا پائیں، ہمیں مل کر یہ کوشش کرنی ہے۔"

"میر مکرم پر اعتبار نہیں تمہیں؟" زہرہ کو تعجب ہوا۔

"آپ کے اور میرے میر مکرم محبت کے تو لائق ہیں زہرہ آپا! مگر اعتبار کے لائق ہرگز نہیں۔ محترم کتنے دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ حیرت ہے آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہوا۔"

فاریہ کچھ آزردگی سے بولی تھی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کے خدشے بے جا نہیں تھے۔ میر مکرم کی زندگی میں تیسری عورت شامل ہو گئی تھی۔ وہ ایک نجی ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس تھی، جو شوقیہ ماڈلنگ بھی کرتی تھی۔ حسن میں شاید فاریہ سے بھی بڑھ کر تھی لیکن فاریہ حسب نسب کے لحاظ سے میر مکرم سے کم تر نہ تھی۔ جبکہ یہ عورت تو شاید اس جگہ سے تعلق رکھتی تھی جس کا نام لینا بھی شرفا گناہ تصور کرتے ہیں۔

اخباروں میں کئی دن تک میر مکرم اور اس ایر ہوسٹس کے اسکینڈل کا چرچا رہا۔

☼ ☼ ☼
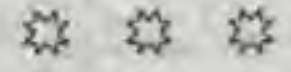
میر مکرم اب اسمبلی کا ممبر اور قبیلے کا سردار تھا۔ وہ کوئی عام بندہ نہ تھا جو چوری چھپے کچھ بھی کرنا چاہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اس نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ میڈیا کی ان "جھوٹی" خبروں کو جھٹلا تا رہے، لیکن ایک ٹی وی چینل نے اس کے نکاح کی ویڈیو اپنے ذرائع سے حاصل کرکے آن ایر کردی۔ شاید اس کے پیچھے میر مکرم کی سیاسی مخالفین کی سرتوڑ کوششیں تھیں۔ وہ الیکشن سے پہلے اس کی کردار کشی کرنا چاہ رہے تھے یہ اور بات کہ میر مکرم نے اپنی آبائی نشست بھاری ووٹوں سے دوبارہ جیت لی تھی، لیکن وہ فاریہ کو منانے کے محاذ پر ہار گیا تھا۔ فاریہ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ حالانکہ میر مکرم نے اسے منانے کی سرتوڑ کوشش کرڈالی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر وہ زہرہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

"تم ہی سمجھاؤ زہرہ اسے۔ یہ میری محبت میں کہاں کمی محسوس کررہی ہے۔ میں پہلے سے کہیں زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتا ہوں۔ میری زندگی میں اس کا مقام اور مرتبہ اپنی جگہ برقرار ہے، پھر یہ کیوں مجھے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کررہی ہے۔"

"کر نہیں رہی ہوں میر! کرچکی ہوں۔ کل میری نیو یارک کی فلائٹ ہے، میں اپنی ممی اور بھائی کے پاس امریکہ جارہی ہوں، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ طلاق کے کاغذات مجھے وہیں بھجوا دینا، ورنہ میرے وکیل کی طرف سے تمہیں خلع کا نوٹس مل جائے گا۔" فاریہ کا انداز بہت سرد اور بے لچک تھا۔

"مہ جبیں سے شادی میری مجبوری بن گئی تھی فاریہ! وہ بہت شاطر عورت ہے۔ پہلے خود میرے قریب آئی، پھر مجھے بدنام کرنے کے لیے قربت کے لمحات کے ثبوت اکٹھے کرلیے۔ یقین کرو! میں بہت مجبور ہوگیا تھا۔"

"میں بھی مجبوری کے عالم میں یہ فیصلہ کررہی ہوں میر! میں تمہاری زندگی میں کسی اور کی شراکت برداشت نہیں کرسکتی۔"

"زہرہ نے بھی تو تمہیں قبول کیا تھا فاریہ! ویسے تم زہرہ کا دم بھرتے نہیں تھکتیں۔ پھر اس معاملے میں زہرہ سے سبق کیوں نہیں لیتیں۔ اس کی طرح تم بھی اپنے دل میں کسی اور عورت کے لیے تھوڑی سی گنجائش پیدا کرو۔"

زہرہ بتول نے زندگی میں پہلی بار میر مکرم کو یوں کسی کی منت کرتے دیکھا تھا۔ وہ یہاں فاریہ کو سمجھانے آئی تھی لیکن فاریہ اور میر مکرم کی گفتگو میں اس کی حیثیت خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔

"پلیز مکرم! مجھے زہرہ آپا کے ساتھ کمپیئر مت کرو۔ تم خود جانتے ہو کہ تمہاری اور زہرہ آپا کی شادی کتنی بے جوڑ شادی تھی۔ تم نے مجھے اپنی زندگی میں کیوں شامل کیا۔ یہ بات ہر کسی کو آسانی سے سمجھ میں آگئی لیکن مجھ میں کیا کمی نکل آئی، جس کو بنیاد بنا کر تم نے ایک بازاری عورت کو اپنی زندگی میں شامل کیا۔"

فاریہ اس سے کھلے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔ میر مکرم نے تو جانے اس بات کا کیا جواب دیا تھا مگر زہرہ بتول اپنی کم مائیگی پر پانی پانی ہوگئی۔ بہت عرصے بعد اس نے میر مکرم اور اپنی بے جوڑ شادی کا تذکرہ سنا تھا۔ پھوپھی زینب کا کچھ عرصے پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ وہی تھی ایک، جو اس سے بیک وقت محبت بھی کرتی تھی اور طعنے بھی دیتی تھی۔ اس کے بعد جیسے یہ ذکر تمام ہوگیا تھا۔

وہ میر مکرم کی خاندانی بیوی تھی۔ اس کے بچوں کی ماں تھی۔ اب اس کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں احترام ہوتا تھا۔ سب بہت عزت سے اس سے مخاطب ہوتے۔ بے شک یہ عزت اور مرتبہ اسے میر مکرم کی بیوی ہونے کی وجہ سے حاصل تھا۔ بھلے سے وہ اس کے جوڑ کی نہ تھی۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت پر بہت مطمئن اور قانع تھی لیکن اب اچانک فاریہ کی بات سن کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ فاریہ سے بھی اس

کے چہرے کے تاثرات چھپے نہ رہ پائے۔

"آئی ایم سوری زہرہ آپا! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہ تھا۔" اس نے شدید پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے زہرہ کے ہاتھ تھام کر معذرت کی۔ وہ واقعی بہت اچھی لڑکی تھی۔ زہرہ کو گزرے برسوں میں اس سے بے تحاشا انسیت ہوگئی تھی اور اب بھی بے چاری بلاوجہ شرمندہ ہوگئی تھی۔ حالانکہ اس نے جو کہا وہ سچ ہی تو تھا۔

"نور العین، سبط اور شاہ زر... تینوں تمہارے جانے کے فیصلے سے بہت ڈسٹرب ہیں فاریہ! پلیز ان کی خاطر رک جاؤ۔" زہرہ نے اسے دل کی گہرائیوں سے روکنا چاہا تھا۔ فاریہ نے بے بسی سے اپنے لب کچل ڈالے۔

"میر نے مجھے ماں بننے کا اعزاز نہیں دیا زہرہ آپا! لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی ممتا انہی کے بچوں پر لٹائی ہے۔ میں انہیں اتنا ہی مس کروں گی جتنا کوئی ماں اپنے بچوں کو کرتی ہے لیکن اگر انہوں نے میری کوکھ سے بھی جنم لیا ہوتا تو میرا فیصلہ بدل نہ سکتا تھا۔ ایک ہرجائی کے ساتھ زندگی بسر کرنا آپ کے لیے آسان ہوگا مگر میرے لیے یہ ناممکن ہے۔" فاریہ کے انداز میں قطعی لچک نہ تھی اور وہ واقعی میر مکرم کی زندگی سے دور چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

زہرہ بتول اس عجیب و غریب مزاج اور عادتوں والی لڑکی کو تنہائی میں مسلسل یاد کیے جاتی۔ گزشتہ زندگی سے متعلق یادیں اور سوچیں ہی اب اس کی تنہائی کی رفیق تھیں۔ بچے بڑے ہوگئے تھے اور بے تحاشا مصروف بھی۔ ماں کو دن میں ایک بار ضرور ٹیلی فون کرتے۔ اس سے پیار کا اظہار کرتے اور اپنا خیال رکھنے کی تلقین بھی۔ وہ بشاش لہجے میں بچوں کی تسلی کراتی رہتی لیکن بات ختم ہونے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ ملول اور دل گرفتہ ہوجاتی۔ اس کے اعصاب تنہائی برداشت کرتے کرتے تھکنے لگے تھے، پھر میر مکرم اپنی تیسری بیوی کا بچہ زہرہ بتول کو سپرد کرنے آگیا۔

"میں نے اسے فارغ کردیا ہے۔ بہت پیسہ دے کر اس سے جان چھڑوانی پڑی لیکن شکر ہے ہمیشہ کے لیے وہ دفعان ہوگئی۔ پیپرز سائن کروالیے ہیں، زندگی بھر بچے پر کوئی حق نہ جتا سکے گی۔ مسئلہ بچے کا ہے۔ کیا میں تم سے یہ امید رکھوں کہ تم اسے پال لوگی زہرہ!"

میر مکرم اس سے بہت آس سے پوچھ رہا تھا اور وہ اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اگر خاندانی بیوی کے علاوہ کسی اور سے بچہ پیدا کروانا ہی تھا تو پھر اس بے چاری فاریہ کا کیا قصور تھا لیکن شاید یہ میر مکرم کا نہیں قدرت کا فیصلہ تھا۔ انسان جتنے بھی بڑے بول بول لے، خدائی فیصلوں کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ ایک بازاری عورت میر مکرم کے بچے کو جنم دے کر ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے رخصت ہوچکی تھی۔ بچے نے نین نقش بالکل میر مکرم کے چرائے تھے۔ ورنہ ہوسکتا ہے زہرہ بتول کسی شک میں گرفتار ہوکر بچے کی پرورش کا اقرار نہ کرتی۔ لیکن وہ ننھا میر قلقاریاں مارتا ہوا بار بار زہرہ کی جانب لپک رہا تھا۔ شاید اس نے پہلی نگاہ میں ہی زہرہ کو ماں کے روپ میں قبول کرلیا تھا۔ زہرہ نے بھی اسے سینے سے لگالیا۔ اس کی تنہائیوں کو ایک رفیق مل گیا۔ تینوں بچے بڑے ہوچکے تھے اور اپنی پڑھائیوں کی وجہ سے دور رہتے تھے۔ وہ ممتا کے خزانے میر بلند بخت پر لٹانے لگی۔

میر مکرم کی اب بھی وہی روٹین تھی۔ مہینے میں ایک بار وہ گاؤں کا چکر لگا کر اپنا فرض ادا کردیتا۔ ہاں جن دنوں نور العین چھٹیوں میں گاؤں آئی ہوتی، میر مکرم ہر ویک اینڈ اس کے ساتھ گزارتا۔ وہ جیسا مرضی سہی مگر بہت اچھا باپ تھا۔ خصوصاً" نور العین میں تو اس کی جان تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن نور العین... ماں کی پیاری، باپ کی لاڈلی اور اب وہ وقت قریب آیا چاہتا تھا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو دوسرے کے سپرد کردیا جائے۔

نور العین کی پڑھائی تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔ اس کے لیے دھڑا دھڑ رشتے آرہے تھے۔ میر مکرم کی ذاتی

خواہش تھی کہ نورالعین کا رشتہ اس کے چچازاد بھائی کے بیٹے سے طے ہوجائے۔ میر تیمور بلا کا خوب صورت تھا۔ بے تحاشا تعلیم یافتہ اور قابل اور اپنے باپ کا اکلوتا وارث۔۔۔ جب میر تیمور کے باپ نے میر مکرم سے نورالعین کا رشتہ مانگا تو میر مکرم نے محض رسمی طور پر سوچنے کی مہلت مانگی تھی۔ وہ ایک بار نورالعین کی رضامندی پوچھ کر میر اکبر کو ہاں کرنے والا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر نورالعین نے باپ کی بات سنتے ہی دو ٹوک انکار کردیا تھا۔

"مجھے تیمور بہت پسند ہے بیٹا! اور میرا خیال تھا کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہوگی۔ تم دونوں ایک زمانے میں کلاس فیلو بھی رہے ہو۔۔۔ اور تم دونوں میں تو اچھی خاصی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے۔" میر مکرم نے نورالعین کا انکار سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھے لائف پارٹنر کے طور پر میر تیمور ہرگز پسند نہیں بابا! آپ نے میری رضامندی جاننے کے لیے مجھے فون کیا۔ میں اس رشتے پر رضامند نہیں ہوں، میں نے آپ کو آگاہ کردیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک میری اسٹڈیز کمپلیٹ نہیں ہوتی، میں شادی کا ٹاپک ڈسکس تک نہیں کرنا چاہتی۔" نورالعین نے باپ کو سنجیدگی سے باور کروادیا تھا۔ میر مکرم یہ جواب سن کر الجھ کر رہ گیا۔ اس نے نورالعین سے مزید کچھ پوچھنے کے بجائے زہرہ سے پوچھنے کو ترجیح دی۔

"میں نے نورالعین پر روایتی باپوں کی طرح کوئی روک ٹوک نہیں کی اور وہ بھی مجھے باپ سے بڑھ کر اپنا دوست سمجھتی ہے۔ آج تک اس نے زندگی کا ہر معاملہ مجھ سے بے تکلفی سے ڈسکس کیا ہے لیکن آج میں اس کا جواب سن کر الجھ گیا ہوں۔ اس نے میر تیمور جیسے شان دار شخص کے لیے انکار کردیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نورالعین کی زندگی میں کوئی اور شخص داخل ہوگیا ہو اور میں اس سے بے خبر ہوں۔ تم تو اس کی ماں ہو اور بیٹیاں ایسی باتیں ماؤں سے آسانی سے کرتی ہیں۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ نورالعین کے انکار کے پیچھے کیا وجہ ہوسکتی ہے۔" میر مکرم نے پرسوچ نگاہیں زہرہ بتول کے چہرے پر گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا نہیں خیال کہ نورالعین کسی کو پسند کرتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ سب سے پہلے آپ سے ہی ذکر کرتی۔ وہ کتنی اسٹریٹ فارورڈ ہے، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔" زہرہ نے رسانیت سے جواب دیا۔

"پھر میر تیمور جیسے آئیڈیل بندے کو ٹھکرانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ میں تو میر اکبر کو ہاں کرنے ہی والا تھا۔ نورالعین کے جواب نے مجھے پریشان کرکے رکھ دیا۔" میر مکرم نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

"حیرت ہے۔ آپ بیٹی کی شادی کو لے کر اتنا پریشان ہورہے ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ اپنی چوتھی شادی کے چکر میں ہیں۔ بیٹی کی شادی کی طرف آپ کی توجہ مجھے مبذول کروانی پڑے گی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زہرہ کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا تھا۔

میڈیا میں آج کل میر مکرم اور ایک خاتون پارلیمنٹرین کے افیئرز کے چرچے تھے۔ اگرچہ دونوں طرف سے پرزور تردید کی جارہی تھی مگر میڈیا والے شور مچارہے تھے کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ زہرہ بتول نے اپنی شادی شدہ زندگی کے چوبیس برسوں میں پہلی بار میر مکرم کی سرگرمیوں پر طنز کرنے کی جسارت کی تھی اور آج بھی یہ جسارت اسے مہنگی پڑگئی۔

میر مکرم نے تیکھے تیوروں سے اسے دیکھا تھا۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا عین اس کے سامنے آن رکا۔ چند لمحے خاموشی سے سرکے۔ زہرہ کو اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہوا۔ وہ کیوں بھول گئی تھی کہ میر مکرم کو بولتی ہوئی عورت کتنی بری لگتی ہے۔ شاید جوان ہوتے بچوں کا زعم تھا، جس نے اسے یہ جرات بخشی کہ وہ میر مکرم کے تازہ افیئر پر طنز کرگئی۔ میر مکرم نے اس کا سرد ہوتا ہاتھ پکڑا اور اسے لے جاکر آئینے کے سامنے کھڑا کردیا۔ زہرہ نے کچھ سہمی ہوئی سوالیہ نگاہیں آئینے میں موجود دوسرے عکس پر گاڑیں۔

"میری زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں اور گئیں۔۔۔ لیکن میں نے تمہیں مستقل اپنی زندگی کا حصہ بنائے رکھا۔ اس بات پر تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے۔ ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو اور میری برداشت کی داد دو کہ میں نے اتنے برس یہ بے جوڑ بندھن کتنی کامیابی سے نبھایا ہے۔"

وہ کٹیلے انداز میں اس سے مخاطب تھا۔ زہرہ نے بے ساختہ نگاہیں چرالیں۔ میر مکرم نے اسے اس کی اوقات یاد دلادی تھی۔ وہ ذرا دیر پہلے کی ہوئی بات پر دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی۔

"بہر حال۔۔۔ میں تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ اس بار جب نورالعین گھر آئے تو اس سے کھل کر بات کرنا۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتی ہے تو بغیر جھجکے مجھے اس کے بارے میں بتائے، میں اس کی پسند کو دیکھے بغیر رد نہیں کروں گا لیکن اگر ایسی کوئی بات نہیں تو اسے تیمور کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں یہ رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا۔" میر مکرم نے سنجیدگی سے زہرہ سے کہا۔ وہ اس بار محض سرہلا کر رہ گئی۔ پھر چند دنوں بعد نورالعین گاؤں آئی۔ زہرہ نے موقع پاتے ہی اس سے یہ بات چھیڑی۔

نورالعین ماں کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"میں اگر کسی کو پسند کروں گی تو ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان بھی کروں گی ماں! بائی دا وے آپ کے ذہن میں یہ اچھوتا خیال کیسے آیا۔"

"پھر تم نے اپنے بابا کو میر تیمور کے لیے انکار کیوں کیا۔ تمہارے بابا کو تمہارے لیے میر تیمور بہت پسند ہے نور!"

"پلیز ماں! کوئی اور بات کریں، یہ بتائیں میں نے پچھلی بار سبط کے ہاتھ آپ کے لیے جو بکس بھجوائی تھیں۔ وہ آپ نے پڑھ لیں، کیسی لگیں آپ کو؟"

نورالعین نے بک ریک میں کتابیں ترتیب دیتے ہوئے زہرہ کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں اس وقت اسٹڈی روم میں موجود تھیں۔ اسٹڈی روم، بیڈ روم سے ملحق تھا۔ برسوں پہلے میر مکرم کے مشورے پر زہرہ نے یہاں اپنا بیڈ روم شفٹ کیا تھا۔ اب بھی اس کا زیادہ وقت اسی اسٹڈی روم میں گزرتا تھا۔ ننھا میر بلند بخت بھی ماں کی ممتا سے پورا پورا حق وصول کرکے بورڈنگ سدھار چکا تھا۔

"ایک زمانے میں میر تیمور اور تمہاری اچھی خاصی دوستی تھی نور! ہمارا خیال تھا کہ تم اس رشتے پر فوراً رضامندی ظاہر کردوگی۔"

زہرہ نے نورالعین کے موضوع بدلنے کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اور وہی وقت تھا جب میر مکرم بھی نورالعین سے ملنے زہرہ کے بیڈ روم میں داخل ہوا تھا۔ زہرہ کی آواز سن کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بیٹی کا جواب جاننے کے فطری تجسس نے اسے وہیں دم سادھے کھڑے رہنے پر مجبور کردیا۔

"پلیز ماں! آئندہ میرے سامنے میر تیمور کا نام مت لیجئے گا۔ آپ کیا چاہتی ہیں۔ آپ کی اور بابا کی تاریخ پھر دہرائی جائے۔ آپ لوگ ساری عمر ایک بے جوڑ بندھن میں بندھے رہے اور اب میں بھی ویسی ہی زندگی گزاروں؟ نہیں ماں یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

نورالعین سے بھی مزید ضبط نہ ہوسکا تھا، سو اس نے زہرہ کو انکار کی صاف صاف وجہ بتادی۔

زہرہ نے گزشتہ چوبیس برسوں میں میر مکرم اور اپنے بے جوڑ رشتے کے متعلق بہت لوگوں سے طعنہ سنا تھا لیکن اسے آج سے پہلے کسی کے منہ سے یہ بات سن کر اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ بیٹی کے منہ سے یہ بات سن کر اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے وجود کے پرخچے اڑادیے ہوں۔ چند لمحے لگے تھے اسے خود کو سنبھالنے میں پھر ماں کی ممتا دوسرے تمام جذبات پر حاوی آگئی۔

اس کی بیٹی کیوں خود کو میر تیمور کے جوڑ کا نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ ماں سے اپنا موازنہ کس لیے کررہی تھی۔ بے شک میر تیمور بہت وجیہہ شخص تھا۔ اس کی خوب صورتی سے کوئی انکار نہ کرسکتا تھا اور اس کی نورالعین خوب صورتی میں میر تیمور کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی، لیکن وہ زہرہ بتول جیسی کم صورت نہ تھی۔ پھر اسے خود کو سنوارنے کا ڈھنگ آتا تھا اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میر مکرم کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے باپ کا سایہ اس کے سر پر موجود تھا۔ اس کی شخصیت کا اعتماد اور تمکنت مقابل کو زیر کردینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں میر مکرم کی بیٹی کے لیے رشتوں کی لائن لگ چکی تھی۔ پھر وہ کیوں اپنی بدنصیب ماں سے اپنا موازنہ کر رہی تھی۔۔۔ زہرہ بیٹی کو سمجھائے بنا نہ رہ پائی۔

"دیکھو بیٹا! مجھے یہ حقیقت تسلیم ہے کہ میر مکرم اور میرا واقعی کوئی جوڑ نہ تھا۔ حالانکہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ مجھے اپنی ذات پر بے تحاشا اعتماد تھا۔ لیکن میرے باپ کے ساتھ ہی میرا اعتماد بھی رخصت ہوگیا تھا پھر ایک احسان کے طور پر تمہاری دادی نے مجھے اپنے لائق فائق اور خوبرو بیٹے کی زندگی میں شامل کیا۔ بغیر چاہ کے کسی کی زندگی کا حصہ بننے کے بعد میں ساری عمر ایک عجیب سے پچھتاوے اور احساس ندامت میں مبتلا رہی ہوں۔ لیکن تم اپنا موازنہ مجھ سے ہرگز مت کرو۔ نورالعین اور زہرہ بتول میں بہت فرق ہے بیٹا! تمہاری تعلیم اور تمہارے پس منظر نے تمہاری شخصیت میں جو خوب صورتی اور نکھار پیدا کیا ہے تمہاری ماں اس سے محروم تھی۔ بے شک میر تیمور بہت ڈیشنگ اور اسمارٹ ہے۔ لیکن میری پراعتماد سی نور بھی کسی سے کم تو نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میر اکبر نے تیمور کی خود کی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ تمہارا اور تیمور کا رشتہ کیوں بے جوڑ ہونے لگا۔ تم کسی کی چاہ پر اس کی زندگی کا حصہ بنوگی۔ میری طرح زبردستی کسی کے سر پر مسلط نہیں کی جاؤ گی۔ یہ وہم ذہن سے جھٹک دو کہ تیمور تمہیں اپنے جوڑ کا تصور نہیں کرے گا۔"

زہرہ نے بہت پیار سے بیٹی کو سمجھایا۔ نورالعین چند لمحوں تک خاموشی سے ماں کو تکتی رہی، پھر ماں کے قریب آکر اس نے زہرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگالیے۔ زہرہ نے حیرت سے بیٹی کو دیکھا۔

"آپ نے میری بات سے بالکل غلط نتیجہ اخذ کیا ہے ماں! میں بھلا کیوں خود کو میر تیمور سے کم تر سمجھنے لگی۔ مجھے یہ رشتہ اس لیے بے جوڑ نہیں لگا کہ میر تیمور مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے اور میں اس کے قابل نہیں۔۔۔ درحقیقت وہ میرے قابل نہیں ہے۔ بالکل ایسے جس طرح بابا آپ کے قابل نہیں ہیں۔ آپ دونوں کے رشتے کو بے جوڑ قرار دیتے ہوئے خدانخواستہ میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ میں آپ کو بابا سے کم تر سمجھتی ہوں۔ میری ماں جیسی عورت تو پوری دنیا میں کوئی نہیں۔ یہ آپ کی ہمت ہے کہ آپ نے بابا جیسے بندے کے ساتھ زندگی کے اتنے برس بنا اف کیے گزار دیے۔ یو آر گریٹ ماں!"

نورالعین نے دوبارہ ماں کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ یہ اس کی جانب سے ماں کے لیے بے تحاشا محبت اور عقیدت کا اظہار تھا۔ زہرہ چند لمحوں کے لیے کچھ بول ہی نہ پائی اور نورالعین کی بات سن کر باہر کھڑا میر مکرم بھی ساکت رہ گیا تھا۔ دوبارہ نورالعین کی آواز نے ہی اس سناٹے کو توڑا تھا۔

"بابا جیسے بندے کے ساتھ آپ کی زندگی کتنی ادھوری، بے کیف اور بے معنی انداز میں گزری ہے۔ اگر آپ کو کسی ایسے شخص کا ساتھ نصیب ہوجاتا، جو بھلے بابا جیسا خوب صورت نہ ہوتا۔ مگر اجلے من کا ہوتا اور ظاہری خوب صورتی کے بجائے من کی خوب صورتی کو ترجیح دیتا تو کسی ایسے شخص کی سنگت میں آپ ایک بھرپور خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کرتیں۔ بابا کے ساتھ تو آپ کی زندگی ضائع ہی ہوئی ہے۔ کوئی ایک مکمل خوشی آپ کا مقدر نہیں بنی۔" نورالعین بولے جارہی تھی۔

"یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو نور! اپنے باپ کے لیے کوئی اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کتنی محبت کرتے ہیں وہ تم سے۔" زہرہ اسے ٹوکے بنا نہ رہ پائی۔

"بات اچھے باپ کی نہیں ہو رہی ماں! بات جیون ساتھی کی ہو رہی ہے۔ بحیثیت باپ بابا مجھ سے جتنی محبت کرتے ہیں۔ مجھے اس سے قطعاً انکار نہیں اور میں خود بابا کو ٹوٹ کر چاہتی ہوں، لیکن یہ محبت فطری محبت ہے۔ میں ان سے بہت محبت تو کرتی ہوں، مگر شاید ان کی عزت نہیں کرسکتی۔ بابا کا حوالہ میرے لیے کبھی بھی باعث فخر نہیں رہا۔ ان کے ہرجائی پن اور دل پھینک فطرت نے مجھے ہمیشہ دنیا کے سامنے خفت میں مبتلا کیا ہے لیکن ایسے میں آپ کے تصور نے میرا اپنی ذات پر اعتماد بحال کیا ہے۔ میں اگر میر مکرم کی بیٹی ہوں تو زہرہ بتول کی بھی تو بیٹی ہوں۔ آپ کے چہرے کا تقدس، آپ کے وجود کی پاکیزگی مجھے انجانے سے فخر میں مبتلا کرتی ہے۔ پورے خاندان میں آپ کی عمر کی ایک بھی ایسی عورت نہیں جو آپ جتنی تعلیم یافتہ ہو۔ آپ کی درس گاہ میں آج بھی آپ کا نام آپ کے قائم کیے ہوئے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ جلی حروف میں درج ہے۔ آپ کے سینے میں دنیا جہان کے علم کے خزانے دفن ہیں۔ اس کے باوجود آپ اتنی منکسر المزاج ہیں۔ آپ کی جگہ میں ہوتی ناماں! تو کب کی بابا کی زندگی سے نکل چکی ہوتی۔ کیا ملا آپ کو ساری عمر یہ بے جوڑ بندھن نبھاتے نبھاتے ہوئے۔۔۔ آدھی ادھوری زندگی جیتے ہوئے؟" نورالعین آزردگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میری بیٹی کی اردو کتنی اچھی ہوگئی ہے۔" زہرہ نے مسکراتے ہوئے موضوع بدلنا چاہا۔

نورالعین نے گہری نگاہوں سے ماں کو دیکھا مگر چپ رہی۔

"بہرحال آپ بابا کو میر تیمور کے لیے میرا انکار پہنچا دیں۔ انکار تو خیر میں نے انہیں کر ہی دیا تھا لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے اس انکار کی وجہ پوچھیں۔ ان فیکٹ میں بابا سے بہت محبت کرتی ہوں اور انہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد نورالعین نے زہرہ کو دھیمے لہجے میں مخاطب کیا۔

"اس سارے قصے میں مجھے میر تیمور کا قصور اب تک سمجھ میں نہیں آیا بیٹا!" زہرہ نے قدرے بے چارگی سے پوچھا۔

"اوہ ماں! میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ تیمور رشتے میں بابا کا بھتیجا ہے اور مزاج اور عادتوں کے لحاظ سے پورا پورا بابا پر گیا ہے۔ وہ اتنی جلدی لباس نہیں بدلتا، جتنی جلدی گرل فرینڈ بدل لیتا ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ بہت عزت احترام اور محبت سے مجھے اپنی خاندانی بیوی بنانا چاہتا ہے اور یقیناً شادی کے بعد بھی وہ مجھ سے ایسا سلوک روا نہیں رکھے گا۔ جیسا بابا نے آپ کے ساتھ رکھا۔ وہ مجھے اپنی زندگی میں پوری اہمیت دے گا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنی ماضی کی روش بدل کر ایک محبت کرنے والے وفاشعار شوہر کا روپ بھی دھار لے لیکن اس کا ماضی میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ میں کسی شکی مزاج بیوی کی طرح ساری عمر اس کی پہرہ داری نہیں کرسکتی اور پھر جب میں نے اپنی زندگی بالکل شفاف انداز میں گزاری ہے۔ ہر طرح کی آزادی ملنے کے باوجود کبھی اپنی لمٹ کراس نہیں کی تو مجھے جیون ساتھی بھی ایسا ہی ملنا چاہیے۔ جس کا ماضی بے داغ اور مستقبل یقینی طور پر شفاف ہو۔"

نورالعین نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ بیڈ روم میں دم سادھے کھڑے میر مکرم کے سامنے ایک ہی راستہ بچا تھا کہ وہ جس طرح دبے پاؤں بیڈ روم میں داخل ہوا تھا، اسی طرح واپس پلٹ جائے۔

اس نے اگلے کئی روز زہرہ کا سامنا کرنے سے دانستہ گریز کیا تھا۔ جانے وہ بیٹی کا انکار کن لفظوں میں اس تک پہنچاتی اس نے زہرہ کو نورالعین سے جواب لینے کی ذمہ داری سونپی تھی اور زہرہ نے اسے نورالعین کے جواب سے آگاہ کرنا ہی تھا۔ جس وقت زہرہ نے اسے تنہا پاکر یہ موضوع چھیڑا۔ میر مکرم کو عجیب سی خفت نے آن گھیرا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر زہرہ بیٹی کے خیالات من و عن اس تک پہنچا دیتی ہے تو وہ اسے زوردار انداز میں جھڑکتے ہوئے بات مکمل نہیں کرنے دے گا مگر زہرہ بتول نے صرف اتنا کہا۔

"تیمور ذرا کھلنڈرے مزاج کا ہے۔ نور کے خیال میں دونوں کی ذہنی ہم آہنگی ممکن نہیں۔"

اور میر مکرم نے زندگی میں پہلی بار سوچا تھا کہ واقعی اس کا اور زہرہ بتول کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ وہ۔۔۔ زہرہ بتول کے قابل نہ تھا۔

☼

ملیحہ صدیقی

ہدایت اللہ کی شادی مہم آج کل زور و شور سے جاری تھی۔ یوں تو یہ مہم گزشتہ تین سال سے خراماں خراماں چل رہی تھی۔ مگر اب کچھ زور پکڑ ہی چکی تھی۔ اماں کہتی تھیں۔

"ہدایت! اگر تیری یہی ضد رہی تو تو کنوارہ مرجائے گا۔" مگر اس پر تو ایک ہی دھن سوار تھی۔ سب نے بتیرا سمجھایا مگر دماغی فتور کا کیا علاج؟ قصور ان کا بھی نہ تھا۔ اماں کا رنگ گہرا تھا تو ابا نے انہیں بھی چار قدم پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان پانچ بھائیوں اور تین بہنوں کے رنگ بے حد پکے تھے۔ تین بھائیوں اور ایک بہن کی شادی ہوچکی تھی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اماں نے بہو کے انتخاب کے وقت بس دین داری کو ترجیح دی تھی۔ یوں اب چھوٹے سے گھر میں چھوٹے بڑے کالے کالے بچوں کی ریل پیل تھی۔

ہدایت اللہ اس صورت حال سے عاجز آچکا تھا۔ لوگوں کی تمسخرانہ باتیں ہنس کر برداشت کرنے کی عادت پڑ تو گئی تھی۔ مگر کبھی کبھی حد ہوجاتی تھی۔ دوست یار ہنس کر پوچھتے۔

"اوئے تو کب ویسٹ انڈیز کی ٹیم بنائے گا؟" تو اس کا ارادہ اور پکا ہوجاتا۔ بچپن کے دن ابا کی سختی میں گزرے۔ ابا نے نہ کبھی سر سے ٹوپی جدا ہونے دی' نہ نماز قضا کی اجازت دی۔ وہ چوک جاتے تو دو بڑے بھائی تو تھے ہی۔ بمشکل مدرسے کی آدھی ادھوری تعلیم حاصل کرکے الیکٹریشن کا کام سیکھ لیا تھا۔ یوں زندگی کے دن گزر رہے تھے۔

ایسی حالت میں گزارے لائق شکل و صورت کی لڑکیاں بھی اسے ہدایت بھائی کہتے نہ تھکتیں۔ اس کی ضد کے آگے ہار کر اماں چھوٹے بھائی کو نپٹا چکی تھیں اور چھت پر بنی چھوٹی سی کابک اس کے حصے میں آگئی تھی۔ اب ایک اور کابک بنوا کر اماں اس کے لیے دوبارہ کمر کس کر میدان میں آگئی تھیں۔ مگر روز انے سنانے سے بھی نہ چوکتیں۔

"ائے کیوں اس عمر میں میرا مذاق بنواتا ہے؟ لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ بڑی بی چاند سی بہو کے ارمان میں مری جارہی ہیں۔ ارے میرے بیٹے! یہ سب خاکی چیزیں ہیں۔ قبر کی مٹی رنگ روپ نہیں دیکھتی' سب کھا جاتی ہے۔ سب فانی ہے۔ بس اعمال رہ جاتے ہیں۔" وہ درس میں سنی باتیں دہراتیں۔

"اب کہاں سے لاؤں چٹی؟ گوری لڑکی بھی گورا نہیں تو سانولا تو ضرور مانگتی ہے۔ تیرے جیسے پر کوئی راضی نہیں ہوتا۔ گھر والے تک انکار کردیتے ہیں۔" کبھی پریشان ہوکر اسے کھری کھری بھی سنا دیتیں مگر وہ اٹل تھا۔

"اماں! میں نے بس ایک گورا رنگ مانگا ہے۔ کوئی چاند نہیں مانگ لیا۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم لوگوں میں کوئی تو تبدیلی آئے۔ میری طرح میرے بچے باتیں سنتے عمر نہ گزاریں۔ ورنہ میں ایسا ہی بھلا۔"

"گورا رنگ ہی آج کل حسن کی ضمانت ہے۔ ہزار عیب ڈھک لیتا ہے۔"

اماں آہ بھرتیں۔ "اور بچہ تجھ پر چلا گیا تو؟"

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ بہنیں' بھابھیاں یہ فرمائش سن کر ناک بھوں چڑھاتیں۔ خطرہ تو تھا بھی۔ گوری کے نخرے تو مشہور زمانہ ہیں۔ کسی کو گھاس بھی نہ ڈالے گی۔

بہنوں نے چھپ چھپ کر کریمیں اور ٹوٹکے آزما کے رنگ کچھ بہتر کرلیا تھا مگر پار لر جانے کی اجازت نہ تھی مگر اس کا مقابلہ کیسے کرسکیں گی بھلا؟

"سیرت کو ترجیح دینی چاہیے۔ ہمارے دین میں بھی یہی کہا گیا ہے۔" عالمہ بھابھی کی بات پر اماں زور و شور سے سرہلاتیں۔ پر ان دنوں کچھ نیا سا تھا' کچھ بدلا بدلا۔ اماں کو ایک جگہ سے اقرار کا سندیسہ ملا اور کمال تو یہ تھا کہ لڑکی گوری تھی۔ گھر کی فضا میں چھایا تین سالہ جمود ٹوٹا تو ہدایت کا دل بھی جھوم اٹھا۔

"بس اماں! میری ایک ہی شرط تھی۔"

اس نے اماں کو مزید تفصیل سے روک دیا۔ فضول کی عورتوں کی لن ترانی ۔ ایسا خاندان' ویسے لوگ ۔ بچوں نے الگ چچا کی شادی کا شور مچا رکھا تھا۔

"رنگ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ناک نقشہ بھی کوئی چیز ہے' اتنی چپٹی ناک تھی اور ڈبیا بھر کاجل لگایا تھا۔ تب جاکر آنکھیں نظر آرہی تھیں۔" تیکھے نقوش والی بھابھی اپنی بڑی بڑی آنکھیں چڑھا کر کہتیں۔

"ہدایت بھائی رنگ دیکھ رہے ہیں' یہ نہیں دیکھتے کہ بچے بونے ہوں گے۔" نئی نویلی دیورانی ہاتھ سے منہ دبا کر ہنستی اور تصور میں ساڑھے چار فٹ کی جٹھانی کے ساتھ اپنا تاڑ سا قد اکڑا کر کھڑی ہوجاتی۔ اس کے سامنے تو اس کے شوہر کا قد دبتا تھا' یہ جٹھانی کیا چیز تھی۔

"بال تو سکی تھے۔ مگر تھے بہت پتلے۔" نند اپنی گھنگھریالی موٹی سی چٹیا پر ہاتھ پھیرتی۔

اماں ان باتوں سے بے نیاز بساط بھر بری تیار کرنے میں لگی تھیں۔ چھوٹے بچے تک دھڑنگ ناچتے پھرتے۔ ہدایت الگ دوست یاروں کے مذاق کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ کبھی جھینپ جاتا' کبھی مسکرا دیتا' سرخوشی کے عالم میں مذاق اڑاتے جملے بھی برے نہیں لگ رہے تھے۔

شادی قدرے سادگی سے ہی ہوئی۔ لڑکی والے بہت غریب تھے۔ صرف شربت سے تواضع کی گئی۔ قریبی مارکیٹ سے لیے گئے سستے سے لہنگے اور مصنوعی زیورات پہنے سب کے بیچ بیٹھی ثمرین ہدایت کو کوئی حور ہی لگ رہی تھی۔ سندوری رنگ اس کی گوری رنگت پر کھلا پڑ رہا تھا۔ اماں' ابا خوش پھر رہے تھے۔

بھابھیاں' نندیں قدرے الگ تھلگ تھیں۔ بڑی بھابھی نے تو چڑ کر اپنے چھوٹے والے کو دھمو کا بھی جڑ دیا۔ اس کی بھاں بھاں نے ہلچل مچادی مگر دلہن کے پتلے پتلے لبوں پر مغرورانہ مسکراہٹ جمی رہی۔ ولیمہ البتہ گلی میں ٹینٹ اور جھنڈیاں لگا کر قدرے دھوم

وھام سے ہوگیا۔ سب بریانی، کھیر اور بوٹیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہدایت کے سسرال والے کھانا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ بیٹی کے نصیب کھل گئے تھے۔

"چائنیز دلہن!" برابر میں بیٹھی نند نے جٹھانی بھابھی کے کان میں زوردار سرگوشی کی تو ثمرین دانت پیس کر رہ گئی۔

ولیمہ پر اسے بڑی نند نے گھر پر ہی تیار کیا تھا۔ باقی سب نے بھی بساط بھر ساتھ دیا۔ آئینہ دیکھ کر اس کا دل ہی جل گیا۔ شادی پر تو اس کی ماہر بیوٹیشن دوست نے مفت میں تیار کر دیا تھا اور وہی اس کی شادی کا گفٹ تھا۔ مگر بہرحال برداشت کرنا ہی تھا۔ وہ فیروزی شرارہ پہنے مسکراتی رہی اور ہدایت اپنی دلہن کو دیکھ کر نہال ہوتا رہا۔

شادی کو چار دن گزر چکے تھے۔ میکے وہ خود ہی نہ گئی۔ ایک تو دور بہت تھا۔ پھر ان پر تو اضع کا بوجھ پڑتا۔ صبح صبح تیار ہو کر ساس کے پاس بیٹھ جاتی اور ان کی چھالیہ کترتی، پان بناتی رہتی۔

"ارے بھابھی! دو، تین تیل ملا کر ڈالا کرو۔ بال تھوڑے گھنے ہو جائیں گے۔" نند پاس سے گزرتے مشورے سے نوازتی۔

"میرے سلکی بال ہیں نا۔ اس لیے پتلے لگتے ہیں مگر کھولو تو بج جاتے ہیں۔ تمھارے بالوں کی طرح تھوڑی کہ بس نظر ہی آئیں۔ ہوں نہ۔"

وہ اپنے دلنشانے کو چولہے میں ڈال کر یوں تڑتڑ بولتی کہ نند دبک کر نکل جاتی، پھر کچھ دیر کسی کی بولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ یوں ناز سے اپنے چار بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہتی کہ کیا کوئی حسینہ عالم نخرہ دکھائے گی۔ اماں دامن بچا کر بے نیاز بنی پان بناتی رہتیں۔ بے نیازی میں ہی عافیت تھی۔

اگلے دن ہدایت کو کام پر جانا تھا۔

"چل آج شام کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔" وہ ترنگ میں آ کر بولا۔

"اچھا ریسٹورنٹ؟" ثمرین نزاکت سے بولی۔

"ہاں تیار ہو جا۔" وہ کہہ کر غسل خانے میں گھس گیا۔ واپس آیا تو گلابی شلوار قمیص میں ثمرین تیار کھڑی تھی۔ گلابی لپ اسٹک لگا کر ہلکا پھلکا زیور بھی پہن رکھا تھا۔

"اتنی پیاری۔" ہدایت دل میں نثار ہوا۔ "جلدی سے برقع اوڑھ کر آ، میں موٹر سائیکل نکالتا ہوں۔" وہ جانے لگا۔

"نا جی۔ میں برقع نہیں اوڑھوں گی۔ یہ دوپٹا اوڑھ تو لیا ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"ہمارے گھر کی کوئی عورت بغیر برقع کے باہر نہیں نکلی۔" وہ جھٹکا کھا کر واپس آیا۔

"مگر میں نہیں پہنوں گی۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"تجھے سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کہہ رہا ہوں۔" اس نے اندر کے مرد کو بیدار کیا۔ تیور بگاڑے، دوست یار ٹھیک کہتے تھے۔ خوب صورت عورت کو لگام دے کر رکھنا پڑتا ہے۔

"اور جو میں کہہ رہی ہوں وہ بھی سمجھ لو۔ شادی کے وقت میری یہی شرط تھی کہ مجھ پر کوئی پابندی، روک ٹوک نہ ہوگی، ورنہ میں مولوی وہ بھی تم جیسے سے شادی کیوں کرتی۔" ثمرین اس سے زیادہ بھڑکی۔

ہدایت تو نپا تلا بولنے والی کا ایسا روپ دیکھ کر منہ کھولے رہ گیا۔

"تمہاری ماں نے بھی ہاں کہہ دیا تھا۔ غربت نہ ہوتی تو ہزار رشتے تھے۔ میں اپنی مرضی سے جیتی ہوں، خود کماتی تھی۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "مجھ پر مرضی ٹھونسی تو چلی جاؤں گی اپنے گھر۔ میرا دماغ سب کو پتا ہے، اللہ کا احسان ہے، بیلیں بنا کر، لفافے بنا کے، سلائی کر کے دسیوں کام کر کے کما لیتی ہوں، ہنرمند ہاتھ ہیں یہ۔ بھوکی نہیں مروں گی۔"

وہ تنتناتی ہوئی پردہ جھٹکتی باہر نکل گئی۔ ہدایت کے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ بے دم سا ہو کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا کہ کوئی راہ ہی نہ بچی تھی۔ قصور کس کا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا، ہاں ہلتے ہوئے پردے میں اپنا مستقبل صاف دکھائی دے گیا تھا۔

نیچے صحن میں منہ میں انگلیاں دابے نند بھاوجیں کمروں میں جا گھسیں۔ اماں سر ہلاتی پان چباتی رہیں۔

طوبیٰ احسن

قصوروار کون

اماں بی نے پاندان کھولا۔ کتھے چونے کا معائنہ کیا۔ پان بنا کر منہ میں رکھا اور ابا میاں سے جو اخبار پڑھ رہے تھے مخاطب ہوئیں۔

"کچھ ہوش بھی ہے یا نہیں۔ لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ کچھ ان کی شادی کی فکر کریں۔ صبح اخبار شام اخبار۔"

"میرے فکر کرنے سے کیا ہوگا۔" ابا میاں بڑبڑا کر بولے۔ "آپ کوشش کریں۔"

"میں کیا کوشش کروں۔" اماں بی منہ بنا کر بولیں۔ "گھر کا حشر دیکھیں کیا ہو رہا ہے؟ یہ ٹوٹے پھوٹے دروازے، پھٹے پرانے پردے، یہ رنگ اڑا ہوا قالین۔ در و دیوار سے جو غربت اور فقیری ٹپک رہی ہے، یہ کسی کو ہمارے گھر کے اندر آنے ہی نہیں دیتی۔ رشتہ لانا تو کجا کوئی بچیوں کو دیکھنے تک نہیں آتا۔"

"تو کیا ہمارے گھر سے نکاح پڑھوانا ہے۔" ابا میاں تلملا کر بولے۔ "ہماری بچیوں میں تو کوئی عیب نہیں۔"

"کوئی بہت حسین پری بھی نہیں ہیں آپ کی بیٹیاں۔" اماں نے صاف گوئی سے کہا۔ "نہ تو کسی ہنر میں یکتا ہیں اور نہ ہی اعلا تعلیم یافتہ۔ آخر سامنے والے کو کوئی تو خوبی پسند آئے آپ کے گھر کی۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" ابا میاں غصے سے چمک کر بولے۔ "گھر کی صفائی اور دیکھ بھال آپ کی ذمہ داری ہے۔ بچیوں کو ہنر سکھانا آپ کا فرض۔ جب ماں ہی خوب صورت، تعلیم یافتہ، ہنر مند اور سلیقہ مند نہ ہو تو بیٹیوں میں یہ صفات کیونکر پیدا ہو سکتی ہیں۔ جب میں آپ کے والد کو مل گیا تو یقین کریں کہ کوئی نصیب کا مارا تمہاری بیٹیوں کو بھی مل ہی جائے گا۔" ابا میاں طنزیہ لہجے میں بولے۔

"بیاہ لاتے کوئی حور پری ہمیں کون سا آپ کے پاؤں پڑی تھی۔ کوئی گن ہوتا آپ کے اندر تو گھر کا یہ حال نہ ہوتا۔" اماں بی نے گھر کی خستہ حالی کی طرف اشارہ کیا۔ "نہ آگے بڑھنے کی لگن، نہ ترقی کرنے کا جذبہ، کنوئیں کے مینڈک کی طرح۔ صد شکر کہ آپ کے ابا کو کچھ عقل تھی۔ یہ گھر خرید کر آپ کے نام کر دیا ورنہ آج فٹ پاتھ پر پڑے ہوتے ہم سب۔" اماں نے خوف ناک تصویر کشی کی۔

ابا میاں نے وہاں سے ہٹ جانے میں ہی عافیت جانی کیونکہ اماں شروع ہو چکی تھیں۔ اب انہیں چپ کرانا آسان کام نہ تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اگر اماں خوب صورت، تعلیم یافتہ اور ہنر مند نہ تھیں تو ابا میاں کے اندر بھی خوب صورتی کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی۔ پتا نہیں ابا میاں کی اماں کو اماں کی کون سی ادا بھا گئی تھی جو وہ اماں کو بیاہ کر لے آئیں اور پھر جی بھر کر پچھتائیں۔

ابا میاں کو اپنی من پسند بیوی نہ لانے کا غم اور اماں کو ابا کی بے التفاتی اور بے توجہی کا صدمہ۔ اس کا اثر بچوں کی تعلیم و تربیت پر پڑا۔

یہاں تک کہ بچے جوانی کی دہلیز پر آ کھڑے ہوئے اماں اور ابا میاں کی چخ چخ یوں ہی قائم تھی۔ زرینہ اور رخسانہ بڑی تھیں اور دونوں بیٹے ابھی چھوٹے تھے۔ اماں کی دعائیں رنگ لائیں اور ایک رشتہ چلا آیا۔

یہ رشتہ برابر والی خالہ کی وساطت سے آیا۔ پہلے وہ لوگ دیکھنے آئے پھر رشتہ لیے چلے آئے، لیکن رشتہ زرینہ کے لیے آیا تھا۔ جبکہ رخسانہ بڑی تھی۔

ابا میاں نے صاف کہہ دیا کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کی نہیں کروں گا حالانکہ اماں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، لیکن ابا کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔ آخر اماں کو عطیہ بانو سے صاف صاف کہنا پڑا کہ بڑی بیٹی کے رشتے سے پہلے چھوٹی بیٹی کا رشتہ ممکن نہیں۔ اماں کو یقین تھا یہ جواب سن کر وہ ناراض ہو کر چلی جائیں گی لیکن وہ یہ جواب سن کر سوچ میں پڑ گئیں پھر جھجکتے ہوئے بولیں۔

"میری نظر میں ایک رشتہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو۔" وہ کچھ ہچکچا رہی تھیں۔

"اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔" اماں آب دیدہ ہو گئیں۔ یا تو رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے کا یقین ہو چلا تھا کہ دوسرے رشتے کی بھی امید بندھ گئی۔ اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ رخسانہ کو پیار کر کے خوش خبری سنائی۔ ابا کے فیصلے کے بعد گھر میں ایک تناؤ اور سرد مہری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ زرینہ ابا سے خفا اور رخسانہ اور زرینہ کے تعلقات میں جو کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، وہ دور ہو گئی۔

دوسرے دن عطیہ بانو پھر آ گئیں۔ ان کے ساتھ ایک جوان لڑکا بھی تھا۔ "میں آذر کو لے کر آئی ہوں یہ رخسانہ کو دیکھنا چاہتا ہے۔" اماں گھبرا گئیں۔

"مگر ہماری بچیاں تو پردہ کرتی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آذر اکیلا لڑکا ہے، ماں باپ اس کے فوت ہو چکے ہیں۔ دو سال سے میں اس کو جانتی ہوں "اچھا بچہ ہے۔ پڑھا لکھا، سمجھ دار اور شریف۔ دیکھیے ایک نظر کی تو ہمارے مذہب نے بھی اجازت دی ہے۔" عطیہ بانو نے اماں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا!" اماں چپ کر گئیں۔ رخسانہ کو سمجھایا۔ وہ ہچکچانے لگی۔

"دیکھو بیٹا! اچھا رشتہ ہے، ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ بس یہ کولڈ ڈرنک لے کر آ جاؤ۔ رکھ کر فوراً چلی جانا۔"

اماں بھی آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کو توقع نہ تھی کہ عطیہ بانو ایسا رشتہ لے کر آ جائیں گی جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو گا اور لڑکا خود ہی چلا آئے گا۔ خیر یہ معاملہ تو بحسن و خوبی نمٹ گیا۔ اماں کو بھی آذر پسند آیا تھا۔ مؤدبانہ انداز میں اماں کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ اس کی جاب بھی اچھی تھی اور شریف اور جاذب نظر دکھائی دیتا تھا۔ رخسانہ کے اندر آنے پر صرف ایک لمحہ کے لیے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر نگاہیں جھکا لیں۔ اماں تو اس سے بڑی متاثر ہوئیں۔

دوسرے دن ابا میاں جا کر آذر سے ملے۔ ان کو بھی وہ اچھا لگا۔ بظاہر کوئی برائی نہ تھی۔ دو سال سے وہ عطیہ بانو کے محلے میں رہ رہا تھا۔ ارد گرد کے لوگوں نے تعریف کی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ابا میاں نے ہاں کر دی۔ ایک ہفتہ کے اندر سادگی سے دونوں بیٹیوں کی منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔ اماں اللہ کا شکر ادا کرتے تھکتی نہ تھیں۔

چھ ماہ بعد کی دونوں شادیوں کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اماں نے کمیٹی ڈال لی اور ابا آفس سے قرضہ لینے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ اماں ابا کی لڑائیوں میں بھی خاطر خواہ کمی آ گئی تھی۔ ہر وقت گھر میں شادی کی تیاریوں سے متعلق گفتگو رہتی۔

منگنی کو تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن عطیہ بانو چلی آئیں۔ اماں نے ان کو بڑی خوشی اور محبت سے خوش آمدید کہا۔ وہ بڑی خوش تھیں۔ آتے ہی انہوں نے زرینہ کی بلائیں لینی شروع کر دیں۔

"بڑی بھاگوان ہے میری بچی!" انہوں نے زرینہ کو گلے لگا کر ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ "اس کے اچھے نصیبوں سے شاہد کو اسلام آباد میں بڑی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ کافی عرصے سے کوشش کر رہا تھا۔ تنخواہ بھی پچھلی تنخواہ سے ڈبل ہے۔" عطیہ بانو نے خوش خبری سنائی۔ اماں بھی خوش ہو گئیں۔

"ہم لوگ بھی اب اسلام آباد شفٹ ہو رہے ہیں۔ شاہد کو کمپنی کی طرف سے گاڑی اور گھر ملا ہے۔" اماں نے خوب مبارک باد دی۔

"اچھا بہن! ان شاء اللہ اب تو شادی پر ہی ملاقات ہو گی۔" ناشتا اور چائے کے بعد وہ اٹھ گئیں۔

اماں نے ابا میاں کو بتایا تو وہ فکر مند ہو گئے۔

"تمہارے پاس عطیہ بہن کا فون نمبر تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں۔ میرے پاس ہے۔" اماں بے فکری سے بولیں۔

"شاہد کو دیکھو، اسلام آباد جاتے ہوئے ہم سے ملا بھی نہیں۔" ابا ہنوز فکر مند تھے۔

"ملتا کیوں؟" اماں نے اطمینان سے کہا۔ "اس کو یقین تھوڑی تھا کہ نوکری مل جائے گی۔"

"اچھا!" ابا میاں چپ کر گئے۔

☆ ☆ ☆

دن تیزی سے گزرتے رہے، عطیہ بانو جا چکی تھیں۔ شادی میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ عطیہ بانو کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ اماں بھی کچھ فکر مند ہو گئیں۔ فون کرتیں تو کوئی اٹھاتا نہ تھا۔

"تم عالیہ سے ملو جا کر۔" ابا میاں نے صلاح دی۔

عالیہ زرینہ کی ہونے والی نند یعنی شاہد کی بہن تھی۔ وہ ناظم آباد میں رہتی تھی۔ دوسرے دن اماں پڑوس والی خالہ کے ساتھ عالیہ کے ہاں گئیں۔ عالیہ گھر پر نہ تھی۔ اس کی ساس نے بتایا کہ عالیہ تو اسلام آباد گئی ہے۔ اس کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔

"جی؟ لیکن عالیہ کے بھائی کی منگنی تو..." اماں کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"وہ تو ٹوٹ گئی۔" عالیہ نے یہ ہی بتایا تھا۔ اب اس کے بھائی شاہد کی اس کے باس کی بیٹی سے شادی ہو رہی ہے۔ آج ولیمہ ہے۔ دو دن کے بعد عالیہ آ جائے گی۔ ویسے آپ کون ہیں اور عالیہ سے آپ کو کیا کام ہے؟

آپ ہمارے علاقے کی تو نہیں لگتیں کیونکہ میں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔" عالیہ کی ساس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"میں؟" اماں نے کچھ بولنا چاہا لیکن زبان تالو سے چپک گئی۔ اٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جسم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پڑوسن والی خالہ اماں کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ انہوں نے کچھ بولنا چاہا لیکن اماں نے اشارے سے منع کر دیا۔ بڑی مشکل سے دونوں گھر پہنچیں۔ گھر پہنچتے ہی اماں بستر پر پڑ گئیں۔ ان کو بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ رات ابا میاں آئے تو ان کو ساری بات بتائی وہ بھی گم صم ہو گئے۔

"کہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔" ابا میاں نے آہستہ سے کہا۔ "تم ابھی لڑکیوں سے کچھ نہ کہنا۔ میں آذر سے معلوم کرتا ہوں۔"

ابا میاں دوسرے دن آذر کے پاس پہنچے۔ اس سے شاہد اور عطیہ بانو کے بارے میں دریافت کیا تو اس کو کچھ علم نہ تھا۔ ابا میاں اس کی اور اس کے گھر کی حالت دیکھ حیرت زدہ رہ گئے۔ بڑھا ہوا شیو' میلے کپڑے اور گندا گھر۔ وہ بھی ان کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"دراصل میری جاب چھوٹ گئی ہے۔" اس نے انتہائی افسردگی سے بتایا۔

ابا میاں قسمت کی ستم ظریفی پر حیرت زدہ رہ گئے۔ شادی میں ایک ماہ باقی رہ گیا تھا اور آذر کی جاب چھوٹ گئی تھی۔ وہ دیر تک دلاسا دیتے رہے زرینہ اور رخسانہ کو بھی ساری بات معلوم ہو گئی۔ گھر کا ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔ خوشی اور سرشاری کی کیفیت غم اور غصے میں بدل گئی۔

☼ ☼ ☼
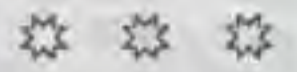
پرانے دن لوٹ آئے۔ وہی پریشانی' افسردگی' وہی بد مزاجی اور اٹھا پٹخ' وہی لڑائی جھگڑا۔۔۔ رات کو اماں اور ابا میاں کے درمیان سخت جھگڑا اور تلخ کلامی ہوئی۔ دونوں نے زرینہ کا رشتہ ٹوٹنے کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرایا۔ آخر کار ابا میاں نے کروٹ بدل لی اور اماں خلاف معمول تکیے میں منہ دے کر دیر تک روتی رہیں۔ خیر رخسانہ کا رشتہ تو برقرار تھا۔ انہوں نے خود کو تسلی دی۔ زرینہ کے لیے بھی اللہ کوئی نہ کوئی بہتر راہ کھول دے گا۔ دیر تک زرینہ کو سمجھاتی رہیں۔

پڑوسن خالہ کے ذریعے زرینہ کی منگنی ٹوٹنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دوسرے دن سے اہل محلہ افسوس کے لیے آنے لگے۔ کیا' کیوں' کیسے؟ سوالات کے جوابات دیتے دیتے اماں نڈھال ہو گئیں۔ زرینہ نے تو خود کو کمرے میں ہی بند کر لیا تھا یہ برا وقت تو جیسے تیسے گزر ہی گیا۔ اماں نے رخسانہ کی شادی کی تیاری کے لیے کمر کس لی۔ زرینہ کی جو خریداری ہو چکی تھی' اس کو ایک صندوق میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ "ایک فرض اچھے طریقے سے ادا ہو جائے۔ جس اللہ نے ایک کا بندوبست کیا ہے دوسری کا بھی کر دے گا۔" اماں خود کو تسلی دیتیں پندرہ دن باقی رہ گئے تھے۔ ابا میاں ایک دن اماں سے کہنے لگے۔

"چلو' آذر میاں سے مل کر آتے ہیں۔ انہوں نے شادی کی کیا تیاری کی ہے دیکھ لیں۔"

"اکیلا لڑکا کیا خاک تیاری کر رہا ہو گا؟" اماں نے رنجیدگی سے کہا۔

"وہ عطیہ بانو جو خود کو اس کی ماں کہہ رہی تھیں۔ چھوڑ کر چلی گئیں۔ بے چارہ!" اماں کے دل میں آذر کے لیے تاسف کی لہر اٹھی تو دوسرے ہی لمحے عطیہ بانو کے لیے لہجہ میں نفرت در آئی۔

شام کو ابا میاں تیار ہوئے۔ راستے میں کیک اور مٹھائی لے لی۔

آذر ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ ابا میاں کو بھی اس کو اچھے حال میں دیکھ کر تسلی ہوئی۔ اس سے پہلے جب اس کو دیکھ کر گئے تھے تب سے دل میں ایک کھٹک سی تھی۔ وہ بھاگ کر ناشتے کا سامان لے آیا اور ساتھ میں کولڈ ڈرنک بھی۔ اماں اور ابا میاں مطمئن لوٹے۔ باتیں کرتے کرتے آذر اماں سے کہنے لگا۔

"میرا تو اب آپ کے سوا کوئی ہے نہیں۔ میں آپ

کو پیسے دے دوں گا بری کی تیاری آپ ہی کیجئے گا۔"

"ضرور' کیوں نہیں بیٹا!" اماں نہال ہو گئیں۔ اماں کے دل میں جو برسوں سے ایک جوان بیٹے کی خواہش پل رہی تھی لگا کہ پوری ہو گئی ہے۔

واپسی پر ابا میاں اور اماں دونوں ہی بڑے خوش تھے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"اچھا ہی ہوا عطیہ بانو کا کانٹا درمیان سے نکل گیا۔" انہوں نے ابا سے سرگوشی میں کہا۔ "اس لڑکے کا کوئی آگا پیچھا نہیں' جلد ہی ہمارا ہو جائے گا۔ دیکھیے گا! زرینہ' عابد اور طیب کے لیے ایک بڑے بھائی کی کمی کو پورا کرے گا۔ آپ کا بھی سہارا بن جائے گا۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔" ابا میاں نے رسان سے کہا۔

شادی میں صرف تین دن باقی تھے۔ آذر نے دوبارہ بری کے پیسوں کا ذکر نہیں کیا تھا بلکہ منگنی کے بعد سے وہ ان کے ہاں آیا بھی نہ تھا۔ یہ بات ابا میاں کو اچھی لگی تھی۔

"خواہ مخواہ شادی سے پہلے سسرال کے چکر لگانا کوئی اچھی بات نہیں۔"

مگر پھر ابا میاں کو ہی فکر ہوئی' اماں سے کہنے لگے۔

"میں نے برات کے کھانے کے جو پیسے رکھے ہیں تم اس میں سے شادی کا جوڑا لے آؤ۔ ہو سکتا ہے وہ شادی والے دن ہی پیسے دے۔"

"اس دن دے کر کیا کرے گا۔ ہو سکتا ہے اس نے جوڑا خرید لیا ہو۔"

"پھر اس کو ہمیں بتانا چاہیے۔" ابا میاں نے اعتراض کیا۔

"اب اگر وقت پر دلہن کا جوڑا نہ آیا تو لوگ سو سو باتیں کریں گے۔"

"اور اگر آذر نے پیسے نہ دیے؟" اماں دل کی بات زبان پر لے آئیں۔

"اللہ مالک ہے۔" ابا میاں پریشان تھے لیکن ظاہر نہ کیا۔ "اب ہم ہونے والے داماد سے پیسے مانگ تو نہیں سکتے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اماں نے بجھے دل سے کہا۔ پچھلے دنوں کی خوش امیدی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شام تک اماں جوڑا خرید کر لے آئیں۔ اللہ خیر سے رخسانہ کو اپنے گھر کا کرے۔ اماں کے دل میں سو سو وہم پیدا ہو گئے تھے۔

شادی سے ایک دن پہلے محلے کی لڑکیوں نے گھر میں خوب رونق لگائی۔ زرینہ بھی اپنا دکھ گویا بھول سی گئی۔ مہندی لگائی گئی۔ اماں بھی بڑی خوش تھیں۔ یہ شور اور ہنگامہ ان کے صحن کی رونق بنا۔

محلے کی ایک لڑکی بینا سے اماں نے بات کر لی تھی' وہ پارلر میں کام کرتی تھی۔ دوسرے دن شام سے ہی تیاری شروع ہو گئی۔ بینا نے رخسانہ کو سر سے پاؤں تک سجانے اور سنوارنے کا کام شروع کر دیا۔ گھر کے باہر قنات لگا کر کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہیں پر نکاح بھی ہونا تھا۔ دس بجے تک مہمان آنا شروع ہو گئے۔ محلے کے لوگ' ابا اور اماں کے رشتہ دار اور رخسانہ اور زرینہ کی سہیلیاں۔ ابا نے بڑا ہی اچھا انتظام کروایا تھا۔ سامنے اسٹیج بنایا گیا تھا۔

دس کے بجائے ساڑھے دس بج گئے' لیکن بارات اور دولہا کا کوئی پتا نہ تھا۔ آخر کار ابا میاں نے اماں کو بلایا۔ اماں تو پہلے ہی پریشان تھیں۔ ابا کے بلاوے سے اور بھی بدحواس ہو گئیں۔

"جی کیا بات ہے؟" اماں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ابا میاں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بارات اور دولہا کا کچھ پتا ہی نہیں۔ وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا۔"

"اب تو جا کر ہی معلوم کرنا ہو گا۔" اماں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"میں خود جاتا ہوں۔" ابا نے پریشان لہجے میں کہا۔

ابا میاں اپنی سال خوردہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چکے سے آذر کے گھر پہنچے تو وہ صرف شلوار اور بنیان پہنے باہر گلی میں بیٹھا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو۔" ابا میاں غرائے۔ "وہاں

مہمان بیٹھے ہیں اور تمہارا کچھ پتا نہیں۔"

"وہ دراصل میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کرسکتا۔" آذر سر جھکا کر بولا۔

"لیکن کیوں؟" ابا نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

نہ جانے ابا کے اندر اتنی ہمت کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بھی ابا کے تیوروں سے کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میری نوکری بھی ختم ہو گئی ہے۔"

"تم کو یہ شادی کرنا ہی ہوگی۔" ابا نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا پکڑ لیا۔ "اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہیں ابھی ماردوں گا۔"

ابا میاں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔

"چھوڑ دیں۔ مجھے چھوڑ دیں۔" اس نے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کی' لیکن ابا میاں گھر کے باہر بیٹھے مہمانوں کے سوالات کے جوابات دینے اور اندر سجی بنی بیٹی کے خوابوں کو نوچنے پر تیار نہ تھے۔ ان کے اندر ایسا ہمت و حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ گویا وہ اس وقت راہ میں آنے والے بڑے سے بڑے پہاڑ کو گرا سکتے تھے۔

"تم کو یہ شادی کرنا ہی ہوگی۔" انہوں نے زور لگایا یہاں تک کہ آذر کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں۔

"میں تیار ہوں۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

ابا میاں نے اس کا گلا چھوڑ کر اس کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا۔

"چلو فوراً۔"

"میں کپڑے بدل لوں۔"

"صرف پانچ منٹ میں۔" ابا میاں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

آذر نے خوف زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ پانچ منٹ بعد ابا اس کو لے کر نکلے۔ صرف دس منٹ بعد وہ مہمانوں کے درمیان تھے۔

مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ "فوراً" ہی کھانا کھول دیا گیا۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر رخسانہ کو آذر کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تھا۔ ابا میاں رخسانہ کو رخصت کرتے ہی چکرا کر گر پڑے۔ وہ جو اماں کے آگے بھیگی بلی بن جایا کرتے تھے۔ آج انہوں نے اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اٹھایا تھا۔

رخصتی کی کہانی بھی عجیب ہی تھی۔ ایسی عجیب و غریب شادی جس میں دولہا بالکل اکیلا ہی تھا اور سسر صاحب سختی سے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ نکاح کے بعد جب زیادہ تر مہمان رخصت ہو گئے تو ابا میاں نے طارق صاحب کو پکڑا۔

"آپ ذرا دولہا' دولہن کو ان کے گھر تک چھوڑ آئیں۔"

"جی ضرور۔" طارق صاحب نے کوئی سوال نہ کیا۔ ابا میاں نے ان سے کہا ہی اسی لیے تھا کہ وہ کوئی سوال 'جواب نہ کریں گے۔

رخسانہ بھی اس عجیب و غریب صورت حال پر حیران پریشان تھی۔ اس نے کسی کی ایسی شادی نہ تو دیکھی تھی اور نہ ہی سنی' سب ہی مہمان چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں۔

"دولہا بالکل اکیلا ہی آیا۔ بغیر کسی بارات کے۔"

☼ ☼ ☼

اب وہ گھر میں آ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ کتنی دیر وہ دروازے پر کھڑی رہی۔ ایسی عجیب و غریب شادی کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ یہ کافی دیر ایک ہی جگہ مجسمے کی طرح کھڑے رہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ آگے بڑھ کر ایک کمرے میں جھانکا۔ ایک طرف الماری رکھی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کپڑے بکھرے ہوئے تھے اور کمرے میں عجیب سی بو آ رہی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ میلے کپڑے پڑے ہیں۔ وہ کتنی دیر اس کمرے کے آگے کھڑی رہی پھر دوسرے کمرے میں جھانکا۔ وہاں اس کے جہیز کا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔

ابا میاں کس مشکل سے اس فرنیچر کا انتظام کر پائے تھے۔ اس کے منہ سے آہ نکلی اور آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ایک الماری' چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل اور ایک بیڈ جس پر چادر تک نہ بچھی تھی۔ وہ چلتے ہوئے اس کمرے میں آ گئی۔ وہ کہاں تھا۔ جس سے ساری زندگی کے لیے رشتہ جڑ گیا تھا۔

"اوہ۔" اس کی نظر برآمدے پر پڑی۔ وہ باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ بیڈ کے ایک کونے پہ ٹک گئی۔ چپ چاپ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹانگیں سن ہو گئی ہوں۔ اس نے ہلکی سی حرکت تو چوڑیاں بج اٹھیں۔ چوڑیوں کا جلترنگ سن کر وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

"تم کیا اس قابل ہو کہ تم سے میری شادی ہوتی؟" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

پہلا جملہ ہی اتنا دل خراش تھا کہ رخسانہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کچھ بول نہ سکی۔ آگے کی زندگی مزید دشوار اور بوجھل تھی۔

اماں اور ابا میاں کے گھر سے بھی زیادہ مشکل۔ اس کو وہیں بیٹھے بیٹھے اماں اور ابا میاں کے گھر میں گزارے ہوئے شب و روز یاد آ گئے۔ اماں اور ابا کی لڑائیاں' غیر یقینی مستقبل' معاشی پریشانیاں۔۔۔ یکدم ہی اس کے اندر ایک اطمینان کی لہر اٹھی اور اس کو پرسکون کر گئی۔ چلو جیسے بھی سہی میری شادی تو ہو گئی۔ دنیا والوں کے سر سے ایک بوجھ تو اترا۔ اس نے خوش دلی سے سوچنے کی کوشش کی پھر اس کی نظر آذر پر پڑی جو سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ بھی کپڑے بدل کر چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی۔

گزرتے دنوں نے ثابت کر دیا کہ اماں اور ابا میاں کا یہ فیصلہ اس کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوا لیکن پوری زندگی نبھانے کا وعدہ جو اس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ اس پر قائم رہی۔ آذر کی جاب ایسی چھوٹی کہ کبھی بھی مستقل نہ ہو سکی۔ آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ وہ غیر مستقل مزاج ہے۔ کوئی نوکری لگ کر کرتا ہی نہیں۔ اوپر سے مزاج بھی شاہانہ' اپنی شکل و صورت پر بے انتہا غرور اور اب تو نیا سودا سر میں آسمایا تھا کہ باہر جانا ہے۔ وہ باہر جانے کی کوشش میں مصروف تھا اور رخسانہ ایک خوف کے عالم میں تھی۔ اس کو واپس اماں ابا کے گھر جانا ہوگا۔ پھر لوگوں کے سوالات۔۔۔ ان ہی دنوں اس کو اپنے اندر ایک نئی تبدیلی کا احساس ہوا۔ شاید آنے والا بچہ آذر کے قدموں کی زنجیر بن جائے اس کے دل نے خوش گمانی کی۔

رخسانہ نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ بچہ بے حد خوب صورت تھا۔ ابا میاں نے اس کو گود میں لے کر دیکھا۔ بالکل آذر کا بیٹا لگتا تھا خوب صورت اور حسین۔ رخسانہ کی اس میں ذرہ برابر بھی شباہت نہ پڑتی تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھیں موندے پڑی تھی۔ شرمندہ اور ندامت سے چور۔ ابا میاں کی شکل دیکھنا اس کے بس سے باہر تھا۔

اس کو وہ دن یاد آ رہا تھا جب اس نے آذر کو اپنی کوکھ میں پلنے والی ننھی سی جان کے بارے میں آگاہ کیا تو اس نے اس شدت سے غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا تھا جس کی رخسانہ کو ذرہ برابر بھی امید نہ تھی۔ گھے' لاتیں' گھونسے' تھپڑ۔ کیا کیا ستم اس نے اپنی جان پر نہ سہے۔ یہاں تک کہ اس ننھی جان تو کیا (جو کہ ابھی دنیا میں آئی نہ تھی) خود رخسانہ کی زندگی بھی بچنے کی امید نہ رہی تھی۔ پھر وہ دن جب رخسانہ کی گرتی ہوئی حالت سے گھبرا کر اس نے اپنا رویہ بدل لیا اور اس کو اسپتال میں داخل کرا کے ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا پتا نہ چل سکا۔

مکان بھی کرائے کا تھا۔ اپنا ساز و سامان لے کر وہ نہ جانے کہاں فرار ہو گیا۔ آج رخسانہ چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا اس کی ذات اتنی ارزاں تھی اور شادی کے سوا لڑکیوں کی زندگی کا کوئی مصرف نہیں۔۔۔؟؟

لبنیٰ جدون

عشق وہ دعا ہے

عمر خان اپنی قبائلی روایت سے ہٹ کر شہر میں رہنے والی ثوبانہ شاہ سے شادی کرلیتے ہیں مگر جرگے کے فیصلے کے مطابق انہیں ثوبانہ کو چھوڑنا پڑا اور فاطمہ بی بی زبردستی ان کے نکاح میں دی گئیں۔ فاطمہ بی بی سے عمر خان کے تین بچے زیاد خان ملالئی اور لالئی ہوئے۔ جبکہ ثوبانہ سے بھی ان کے دو بیٹے تھے' جو علیحدگی کے بعد ہوئے۔ عمر خان ان سے لاعلم تھے۔ ایک طویل عرصے بعد فاطمہ بی بی کی خدمتوں سے متاثر ہو کر عمر خان کے دل میں ان کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔

ربیط خان' عمر خان کے بڑے بھائی جبار خان کا بیٹا ہے۔ ملالئی اور ربیط ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ربیط کی بہن مرجانہ' زیاد خان کو پسند کرتی ہے' مگر ڈاکٹر زیاد خان سارِیہ کو پسند کرتا ہے۔ یہ بات ربیط خان جانتا ہے' جب مرجانہ کو پتا چلتا ہے کہ زیاد خان ڈاکٹر سارِیہ کو چاہتا ہے تو وہ روتی ہوئی جاتی ہے اور ٹیبل سے ٹکرا جاتی ہے۔ جس پر رکھے کرسٹل کے گل دان سے اس کا چہرہ زخمی ہوجاتا ہے اور زخموں کے نشان اس کے چہرے کو بدصورت بنادیتے ہیں۔

ثوبانہ کے دو جڑواں بیٹے شبیر اور فیض ہیں۔ فیض اپنی یونیورسٹی فیلو شمیلا کو پسند کرتا ہے۔ ڈاکٹر سارِیہ' ثوبانہ کی بہن لائبہ واحدی کی بیٹی ہے۔

دلاور خان' فاطمہ بی بی کے بھائی ہیں۔ ان کی سازش سے ثوبانہ' عمر خان سے جدا ہوئی تھیں' عمر خان ان سے قطع تعلق کرلیتے ہیں۔ دلاور خان بے اولاد ہیں۔

مکمل ناول

۲ - دوسری اور آخری قسط

"ان کے بیچ ان کے درمیان موجود فاصلوں کو کم کرنے میں جتے تھے۔ لائبی تو ہر پل ہی بے چین رہتی تھی۔ زیاد خان دونوں کے چہروں کو پڑھتا رہتا تھا اور لائبی تو تھی ہی دیوانی۔ کتنے یقین سے کہتی بابا میں جانتی ہوں کہ آپ دونوں ہیر رانجھا ہیں۔

"ماں باپ تو ہمیشہ ہی اولاد کی تکلیفیں سہتے ہیں مگر ہماری اولاد ہماری تکلیفیں سہہ رہی ہے۔ بس اب میں اپنے بچوں کو مزید رونے نہیں دوں گا۔" عمر خان دھڑلے سے اٹھے اور فاطمہ بی بی کی طرف آگئے جو دوا لینے سے انکاری تھیں۔

"مجھے دو لائبی!" انہوں نے دوائیں لائبی کے ہاتھ سے لے لیں۔ وہ باہر نکل گئی۔

"فاطمہ! بس اب اور ضد نہیں چلے گی۔ یہ دوا کھاؤ۔" وہ پانی والا گلاس بڑھاتے ہوئے بولے۔

"مجھے گولیاں کھا کھا کے زندگی کی طرف نہیں بھاگنا۔" وہ منہ پھیر کے بولیں۔

"تم زندگی کی طرف نہیں بلکہ مجھ سے بھاگ رہی ہو فاطمہ... اور میں تمہیں اب بھاگنے نہیں دوں گا۔ اب ہمیں اپنے بچوں کے چہرے پہ خوشی کے رنگ سجانے ہیں۔"

"خان! کیا یہ محض اتفاق ہے یا..." فاطمہ بی بی نے گھڑیال کی رکی ہوئی سوئیوں اور کیلنڈر پہ رکے ہوئے دن اور تاریخ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو اسی وقت دن اور تاریخ پہ رکی تھی جب فاطمہ بی بی کو اس کمرے سے بے دخل کیا گیا تھا۔

"وہ میں نے یہ اسی دن روک دی تھیں۔ میں حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا ورنہ میرا تو دل بھی تب ہی رک گیا تھا۔ مجھے ہارنا منظور نہ تھا اس لیے لڑتا رہا مگر جب تھک گیا تو یوں گرا کہ اب تک سنبھل نہیں پایا۔" وہ اب اعتراف محبت کر رہے تھے جب عمر بیت چلی تھی۔

"خان! ہم دونوں ہی حقیقت سے بھاگتے رہے مگر مجھے اب کوئی شکوہ نہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ فاطمہ بی بی کی بات کا جواب دیتے عمر خان کے موبائل پہ گھنٹی بجنے لگی۔

"ایک منٹ..." کہہ کے انہوں نے یس کا بٹن دبایا۔

"ہیلو... جی کون؟"

"آپ... مگر کیوں؟"

"مسئلہ تو کوئی نہیں لیکن مجھے بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ... آپ کیا کہہ رہی ہیں... میں آ... رہا ہوں۔" ان کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

"کس کا فون تھا۔" فاطمہ بی بی نے عمر خان کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھ کے پوچھا۔

"ہوں... میرے ایک دوست کا تھا..." وہ پھٹی پھٹی نظروں سے فاطمہ بی بی کے چہرے کا محاصرہ کرتے ہوئے بولے۔ لیکن پھر ان کے چہرے پہ صرف گہری سوچ اور پریشانی ہی نظر آئی۔ خدشات اس وقت یقین میں بدل گئے جب عمر خان نے یہ کہہ کے سارہ کے گھر جانے سے روک دیا کہ ابھی وہ کسی اور معاملے میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے دو چار دن رک جائیں۔

"لیکن کیوں خان..." وہ سمجھ نہ پائیں موسم کی مانند بدلتے عمر خان کے رویے کو۔

"فاطمہ... ایک درخواست ہے تم سے۔" وہ کھوئے ہوئے فاطمہ بی بی کی طرف مڑے۔

"مجھے لگتا ہے مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت پڑے گی۔" پلیز میرا ہاتھ تھام لینا۔"

"خان! مسئلہ کیا ہے..." وہ عمر خان کی حالت کے پیش نظر اتنا تو جان ہی گئی تھیں کہ وہ کمزور اگر ہو رہے تھے تو وہ کوئی عام بات نہیں تھی۔ انہوں نے زندگی کے ہر معاملے کو بہت مضبوطی سے سنبھالا تھا۔ ہاں اگر

کمزور پڑے تھے تو فاطمہ بی بی کے لیے۔

"فاطمہ! بنا پوچھے 'بنا جاننے کی تمنا کیے مجھے اپنی دعاؤں کی ردا نہیں دے سکتی ہو... بس اتنا جان لینا کہ آج عمر خان کو دہکتے انگاروں پہ چلنا ہے۔"

وہ چپ ہو گئیں۔ اگلی صبح وہ اپنے دوست سے ملنے کا کہہ کے چلے گئے۔ بہت سے واہمے، بہت سی الجھنیں اور سوالات فاطمہ بی بی کے ذہن میں چھوڑ کے۔ الجھا ہوا ریشم تھا جس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ایکسوزمی فیض... مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" عائلہ کی آواز پہ فیض پلٹا۔

"جی۔"

"فیض! آپ کی باتوں کی وجہ سے شمائلہ کافی ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ پلیز ایک ریکوئسٹ ہے کہ آپ اس کی طرف سے کوئی امید نہ لگائیں۔ وہ جس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہے اگر کسی کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو اس کے لیے پرابلم ہو جائے گی۔" عائلہ نے کہا تو فیض نے انتہائی سنجیدگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ خود کہاں ہے... کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ وہ ایک دفعہ بھی بات کرنے کے حق میں نہیں ہے۔" عائلہ نے اس کا پیغام من و عن بیان کر دیا۔

فیض کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا۔ اسے کافی امید سی ہو چلی تھی۔ شبیر نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبا کے حوصلہ دیا۔

"اوکے مس! آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ آپ اپنی دوست کو بتا دیجیے گا۔" شبیر نے کہا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے فیض!" عائلہ کے جانے کے بعد شبیر اس پہ پھٹ پڑا۔

"جوگی بن جاؤ۔ اس کے قدموں میں بیٹھ جاؤ۔ بھیک مانگو محبت کی۔"

وہ خاموش رہا۔

"کب ملے تھے تم اس سے اور تم نے اس بات کو مجھ سے بھی راز رکھا؟" شبیر کے لہجے میں واضح ناراضی تھی۔

"ایک دفعہ ملا ہوں اور..." وہ بتا کے رکا۔

"اور محبت ہو جانے کی خوش خبری سنا ڈالی۔" وہ تنک کے بولا۔

"یار شبیر! میں نے اس کے معاملے میں خود کو بے بس پایا ہے۔" وہ جھٹلا نہ سکا۔

"تو پھر اب کیا کرو گے۔" شبیر نے پوچھا۔

"ملوں گا پھر..." اس کے ارادے پختہ تھے۔

"فیض دیکھنا... کہیں اس کے لیے بھی پرابلمز نہ ہو جائیں۔ لڑکیوں کے لیے اور اس قسم کے مسائل اور وہ بھی روایتی گھرانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے بہت مسئلے بن جاتے ہیں۔ پوری زندگی داؤ پہ لگ جاتی ہے۔" شبیر نے سمجھایا۔

"تم مجھے ایک دفعہ اس سے ملنے دو۔ پھر دیکھتا ہوں کہ کیا آپشنز ہو سکتے ہیں۔" فیض بظاہر نارمل بن رہا تھا لیکن اندر سے بہت پریشان ہو گیا تھا۔

شبیر کے روکنے کے باوجود وہ خود کو اس کی طرف مڑنے سے روک نہ پایا اور دوبارہ اس کی طرف آ گیا۔

"آپ..." اسے دیکھ کے شمائلہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"شمائلہ... پلیز مجھے آزما لو۔"

"فیض پلیز! مجھے تنگ نہ کریں۔ میرے پاس آپ کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ منہ پھیر کے بولی۔ "آپ کی وجہ سے میری راہیں بہت دشوار ہو جائیں گی۔"

"محبت ہو تو کانٹے پھول بن جاتے ہیں شمائلہ! پلیز تم ایک دفعہ مجھے آزما لو۔ جیسے مرضی آزما لو..."

"بات آزمانے کی نہیں... فیض آپ یقیناً بہت اچھے ہیں لیکن میری پرابلمز کچھ اور ہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"میں سب پرابلمز سے نمٹ لوں گا۔ تم ایک دفعہ

اذن سفر تو دو۔ میرے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ تو دو۔" اس وقت فیض کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے شمائلہ عمر خان چاہیے تھی۔

"سوری فیض۔۔۔" وہ کہہ کے آگے بڑھنے لگی تو وہ تڑپ کے اس کے سامنے آیا۔

"شمائلہ کیوں کر رہی ہو تم میرے ساتھ ایسا۔۔۔ کیا تمہاری آنکھیں جھوٹ بول رہی ہیں۔ میری محبت گناہ ہے کیا جس کی تم مجھے سزا دینا چاہ رہی ہو۔" وہ اس کی بے رخی پہ تپ گیا۔

"فیض! میں آپ کی یک طرفہ محبت کے لیے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اس کے مضبوط مردانہ سراپے اور بے پناہ کشش کی حامل شخصیت سے نظریں چراتے ہوئے بولی کہ کہیں اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب ہی نہ جائے۔ اس کی نرم آواز کا سحر ہی نہ چل جائے۔

"میری آنکھوں میں دیکھ کے صرف ایک دفعہ کہہ دو کہ میری محبت یکطرفہ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ میں اپنی کسی بات کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہوں۔" اس نے کہا اور قدم بڑھا لیے۔

فیض کتنی دیر دیکھتا رہا کہ شاید ستم گر تیر چلا کے پچھتا رہا ہو۔ شاید اسے اپنے جملوں کی کاٹ کا احساس ہو جائے۔ ہو سکتا ہے سچے جذبوں کی طاقت اس کے قدم موڑ دے۔ مگر وہ بنا رکے وہاں سے چلی گئی کہ کیا معلوم اس کی آنکھ سے گرنے والے آنسو اس کا بھرم ہی نہ توڑ دیں۔

"اب کیوں رو رہی ہو۔۔۔" نجانے کب عائلہ اس کے سنگ ہو گئی۔

"عائلہ۔۔۔" اس کی آواز میں کھو دینے کا واضح دکھ بول رہا تھا۔

"کیا تم اپنے بابا اور قبیلے والوں کی وجہ سے انکار کر رہی ہو۔" عائلہ نے پوچھا تو جواب اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔

"نہیں، بابا سے منوانا مجھے آتا ہے۔" وہ بھرپور یقین سے بولی۔

"تو۔۔۔ پھر کیا وجہ ہے۔۔۔ کیا تمہیں اس سے محبت نہیں ہے؟ کیا تمہاری آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں جن میں صرف اور صرف فیض ہی نظر آتا ہے۔" عائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی بات سے انکار نہیں ہے۔ سب سچ ہے۔ میری آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں۔ وہ میری دل کی دھڑکنوں میں ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی طاقت ایسی ہے جو مجھے اس کی جانب جانے سے روک رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے کسی غار میں لے جا کر بند کر دے گا۔ مجھے لگتا ہے عائلہ جیسے میں قید ہو جاؤں گی۔۔۔ پتھر ہو جاؤں گی۔" وہ اپنی ہرنی جیسی خوب صورت آنکھوں کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے خوفزدہ انداز میں بولی تو عائلہ کا قہقہہ دور تک بکھر گیا۔

"عائلہ! میں تمہیں لفظوں میں اپنی کیفیت بیان نہیں کر سکتی کہ جب میں اس کے متعلق سوچتی ہوں تو خود کو کسی قید میں پاتی ہوں۔ ایک غیبی طاقت مجھے روکتی ہے۔" وہ خوف سے آنکھیں میچتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں تم کیوں اتنے اچھے انسان کے متعلق ایسا سوچتی ہو حالانکہ وہ تو صرف چاہے جانے کے قابل ہے اور اب تو سنا ہے کہ پریذیڈنٹ کے الیکشن میں بھی نامزد ہوا ہے اور جیت بھی لے گا الیکشن اور تمہیں بھی۔۔۔" آخری الفاظ اس نے دھیرے سے بولے مگر شمائلہ نے سن لیے۔ وہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"زیاد! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سب اتنے آرام سے ہو جائے گا۔" ساریہ نے جب سنا کہ وہ لوگ ایک دو دنوں تک آئیں گے تو بے یقینی سے بولی۔ زیاد خود بھی مسکرا دیا۔ اسے خود کب یقین تھا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی اتنے آرام سے حاصل کر لے گا۔

"اچھا ساریہ! ایک چیز اور کہ میں اماں بابا سے پہلے خود تمہاری فیملی سے ملنا چاہتا ہوں تاکہ کچھ معاملات کلیئر ہو جائیں۔" اس نے کہا تو ساریہ الجھن میں پڑ

گئی۔

"کون سے معاملات زیاد!"

"ساریہ! تم جانتی ہو کہ ہمارے اور تمہارے لائف اسٹائل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں تمہارے گھر والوں کو ہر چیز کھل کے پہلے ہی بتانا چاہتا ہوں۔"

"مثلاً"۔۔۔"

"مثلاً" یہ کہ شادی کے بعد تمہیں وہاں گاؤں میں رہنا ہو گا۔ وہاں کے رسم و رواج کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کرنا ہو گا۔" اس نے کہا تو ساریہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"لیکن زیاد پہلے آپ نے یہ بات نہیں کی تھی۔"

"اس میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ کیا شادی کے بعد سب لڑکیاں سسرال رخصت ہو کے نہیں جاتیں؟" وہ اس کے چہرے پہ پریشانی دیکھ کے بولا۔

"اور میری جاب۔۔۔"

"جاب کا فیصلہ حالات کے مطابق ہی ہو گا۔"

"کیا یہ شرط آپ کے گھر والوں نے رکھی ہے۔" ساریہ کا اس انداز سے پوچھنا غضب ہو گیا۔

"واٹ ڈو یو مین بائے میرے گھر والے۔۔۔ ساریہ! یہ کس انداز سے بات کی ہے تم نے میرے گھر والوں کے بارے میں۔ ایک بات یاد رکھنا! میری فیملی مجھے بے انتہا عزیز ہے۔ ان کے بارے میں کبھی بھی انسلٹنگ زبان برداشت نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی ایسا سوچنا۔۔۔ ہم پٹھان لوگ بہت سیدھی اور سچی کرتے ہیں۔ انہوں نے تو میری پسند پہ ایک بھی اعتراض نہیں اٹھایا۔ میری پسند کو دل سے قبول کیا ہے۔ جا کے ذرا میری اماں کی زبان پہ اپنے لیے دعائیں دیکھنا۔۔۔ بابا کی محبت تم نے محسوس کر لی ہو گی۔۔۔ میری بہنوں کے لبوں پہ بھابھی کہتے ہوئے جو مٹھاس گھل جاتی ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

"سوری زیاد! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔۔۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

"ساریہ! مجھے میری چھوٹی سی جنت بہت عزیز ہے۔ میرے اماں اور بابا سے میری سانسیں جڑی ہیں۔ ملالئی اور لالئی دونوں میری جان ہیں۔ پلیز میرے رشتوں کو اپنا سمجھ لینا۔ میں پہلے ہی انہیں بہت ہرٹ کر چکا ہوں۔" وہ جلدی میں وہ بھی بول گیا جو نہیں بولنا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔ کیسے ہرٹ ہوئے وہ۔" ساریہ نے اس کے چہرے کا محاصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شاید اس سمندر سے گہرے شخص کی باتوں کی کوئی جھلک اس کے اندر کا احوال بتا سکے۔

"چھوڑو یہ بتاؤ، خالہ جانی کا کیا حال ہے۔" اس نے موضوع بدلا۔

"ماشاء اللہ کافی بہتر ہیں۔ بی پی ذرا کنٹرول سے باہر ہو جاتا ہے۔"

"خالہ جان کے ساتھ پرابلم کیا ہے ساریہ۔۔۔ ان کے چہرے پہ اداسی بتاتی ہے کہ جیسے انہوں نے بہت تکلیف میں زندگی گزاری ہے۔" زیاد خان ثوبانہ شاہ کا چہرہ تصور میں لاتے ہوئے بولا۔

"دراصل خالہ جانی نے لو میرج کی تھی گھر والوں سے بغاوت کر کے۔۔۔ اس شخص نے بھی بے وفائی کی اور انہیں چھوڑ دیا۔ واپس آئیں تو نانا جان اور نانو نے بھی قبول نہیں کیا۔ وہ پھر بے آسرا خواتین کے ادارے میں رہیں۔ وہیں فیض اور شبیر پیدا ہوئے اور پانچ سال رہے۔ اس دوران نانا جان اور نانو کی ڈیتھ ہو گئی۔ ماما انہیں ڈھونڈتی رہیں۔ بالآخر وہ مل گئیں مگر اس کے بعد اداسی نے ان کا دامن نہیں چھوڑا۔"

"او۔۔۔ سو سیڈ۔" زیاد کو سن کر واقعی دکھ ہوا۔

"پتا ہے وہ دونوں یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے والد کی ڈیتھ ہو چکی ہے جبکہ وہ زندہ ہیں۔" ساریہ نے مزید بتایا۔

اس نے موضوع بدلا۔ ساریہ اداس ہونے لگی تھی۔

"اچھا چلو، آج تمہارے پاپا سے مل کے بات کر لوں۔"

"کیا بات۔۔۔؟"

"میں ان سے کہوں گا کہ یہ ساریہ وقار تو ایسی ہی ہے۔ فضول میں آپ کے گھر پڑی ہے اُسے مجھے دے دیں۔" ساریہ نے بہتر یہی جانا کہ وہ وہاں سے اٹھ ہی جائے۔ سو وہ بکار تارہ گیا۔

وہ آواز ملک الموت کی نہیں تھی مگر انہیں مار گئی تھی۔

"میں ثوبانہ عمر خان کی بہن بات کر رہی ہوں۔۔۔"

"وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔۔۔ آپ آئیں گے نا؟"

اس وقت ان کا ذہن بالکل ماؤف تھا۔

کوئی لفظ دوسرے سے نہیں مل رہا تھا کہ وہ مطلب اخذ کر سکتے۔۔۔

اتنے سالوں بعد یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

اس نے نمبر کہاں سے لیا تھا۔

اگر ان کا دماغ کام کرتا تو وہ یقیناً" یہ سارے سوال ڈھونڈتے اور ان کا جواب ڈھونڈنے کا تردد کرتے مگر وہ گم ہو گئے تھے۔

مطلوبہ مقام پہ پہنچے تو سامنے لائبہ واحدی کو دیکھ کے گھبرا گئے۔

چند لمحوں کے لیے سب جھوٹ سا لگا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔" وہ بولیں تو عمر خان جیسے نیند سے جاگے۔

"آپ۔۔۔"

"جی میں۔ میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا۔ گھر میں بات کرنی مشکل تھی، اس لیے یہاں زحمت دی ہے۔"

"مگر آپ تو۔۔۔" سوال کرتے کرتے رک گئے۔

"ایک بیٹی کا فیصلہ ہونے سے پہلے دوسری کا فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے آپ کو بلایا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔" وہ الجھے۔

"ثوبانہ اس کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

لائبہ واحدی نے دائیں جانب والے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

عمر خان کی ٹانگیں ان کا سامنا کرنے سے پہلے ہی جواب دینے لگیں۔ بمشکل اس کمرے میں داخل ہوئے۔

ثوبانہ کا سر جھکا تھا۔ کتنا وقت خاموشی میں گزر گیا۔

"ثوبانہ۔۔۔" عمر خان نے تڑپ کے ان کا بے جان ہاتھ تھاما۔

"ثوبانہ! سر تو صرف ایک ہی بندے کا جھکا ہونا چاہیے اور وہ جھکا ہے۔"

"میں نے کبھی یہ دعا نہیں مانگی تھی عمر! کہ میرا دوبارہ تم سے سامنا ہو۔" ثوبانہ نے تلخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور میں نے ہر لمحہ تم سے ملنے کی دعائیں مانگیں تاکہ تم سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگ سکوں۔۔۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا تھا ثوبانہ!"

"اور جب مجھ سے مایوس ہوئے تو اس کی گود میں سر رکھ لیا جس نے ہمیں جدا کیا تھا۔ کیا خوب محبت نبھائی ہے تم نے۔۔۔ آج ترازو لے کے آؤ اور دیکھو کس کی محبت کا وزن زیادہ ہے۔" وہ رو پڑیں۔

"ثوبانہ۔۔۔" وہ بے بس سے ہو گئے۔

"میں آج بھی نہ ملتی اگر قسمت ایک بار پھر وارنہ کرتی۔ تمہارا بیٹا ساریہ کی خواہش نہ کرتا تو۔"

"ساریہ۔۔۔"

"بھانجی ہے میری۔۔۔ میری بہن لائبہ واحدی کی بیٹی۔۔۔ اور میں اسے آگ میں نہیں جھونک سکتی۔ اپنے بیٹے سے کہو، وہ ساریہ کے راستے سے ہٹ جائے۔" وہ سختی سے بولیں تو عمر خان کے اوپر جیسے کوئی وزنی پہاڑ آن گرا۔

"ثوبانہ! وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"اس سے بھی زیادہ جتنا ہم دونوں نے کیا تھا؟" وہ طنزاً بولیں تو عمر خان کی زبان کو چپ لگ گئی۔

"عمر! تم لوگوں کے لیے بھلے عورت اور مرغابی کا شکار برابر ہو مگر اس بار میں تمہیں آسانی سے تو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" عمر خان حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

"ثوبانہ! کیا ہم اپنی ناکام زندگی کا بدلہ اپنے بچوں سے لیں گے؟"

"بھول ہے تمہاری۔۔۔ میں تم سے بھی بدلہ لوں گی۔۔۔ اس سے بھی لوں گی، جس نے میری زندگی برباد کی۔" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا تو عمر خان کی روح تک کانپ گئی۔

روز حساب تو آنا ہی تھا۔

"میں نے اتنے سال اپنے حوصلے جمع ہی اس لیے کیے ہیں کہ تمہاری ہر سزا سہہ سکوں۔ لیکن بچوں کو ان کی خوشیوں سے محروم نہ کرو۔" عمر خان نے کہہ کر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"عمر! تم آج بھی اتنے ہی بزدل ہو جتنے پہلے تھے۔ یقیناً" تمہارا بیٹا بھی ویسا ہی ہو گا۔ وہ کیا ساریہ کو تحفظ دے گا۔ تم لوگ تو وقت پڑنے پہ اپنی عزتوں کی بھی نیلامی کرنے پہ تیار ہو جاتے ہو۔ کیا پتا کل کو زیاد بھی ساریہ کا یہی حال کر ڈالے۔" ثوبانہ کی زبان پہ نشتر تھے اور عمر خان کو سننے تھے کہ انہوں نے گھاؤ بھی تو ان سے ہی کھایا تھا۔ اتنے سالوں کا غبار تھا جو لاوے کی طرح اندر ہی اندر پک رہا تھا اسے باہر تو آنا ہی تھا۔

"تم مجھے جو بھی سزا سناؤ گی مجھے منظور۔۔۔ لیکن میرے بیٹے کو سزا صرف زیاد کے لیے نہیں ہو گی بلکہ ساریہ۔۔۔ تمہاری بھانجی بھی تو دکھی ہو جائے گی۔ اپنے اور میرے حساب کتاب سے انہیں دور رکھو ثوبانہ!" عمر خان نے التجا کی۔

"نہیں عمر! میں اپنی بچی کو تکلیف نہیں دے سکتی۔"

"تم مجھے بھی تکلیف نہیں دے سکتیں ثوبانہ۔۔۔! تمہاری آواز کی لرزش بتا رہی ہے کہ تمہاری جدائی میں اگر اذیت عمر خان نے جھیلی ہے تو وقت تمہارے دل سے بھی عمر خان کی محبت کو نکال نہیں پایا۔ ظلم صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں ہوا تھا، میرے وجود کو بھی سنگسار کیا گیا تھا۔" عمر خان کے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ نے ثوبانہ کو بھی رلا دیا۔

"مجھے معاف کر دو ثوبانہ۔۔۔ میں محبت کر کے نبھا نہیں پایا۔۔۔ میری محبت میری بزدلی کے ہاتھوں ہار گئی۔"

"عمر! میں تو اپنا آشیانہ جلا کے تمہارے سنگ نکلی تھی۔ یہ تو سوچتے کہ میں کہاں جاؤں گی۔"

"میں تو خود پابند سلاسل تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں تو باندھ دیے تھے ان لوگوں نے۔۔۔ مگر خدا جانتا ہے کہ میں نے تمہاری تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ مگر نجانے تم کہاں کھو گئی تھیں اور۔۔۔"

اس سے پہلے کہ ثوبانہ کوئی بات کرتیں عمر خان کا موبائل جو سامنے ہی میز پہ پڑا تھا، بجنے لگا۔ فون کرنے والے کا نام واضح طور پہ پڑھا جا سکتا تھا۔

ثوبانہ نے طنزیہ انداز میں عمر خان کی جانب دیکھا۔

"اور جب مجھ سے مایوس ہوئے تو اس کے دامن میں پناہ لی جس نے ٹھوکریں مار مار کے ہم دونوں کو جدا کیا تھا۔ اگر میں غلط نہیں تو یہ اسی کا فون ہے۔"

عمر خان نے سر جھکا لیا۔

جونہی عمر خان نے موبائل کا بٹن دبا کے موبائل کو خاموش کرنا چاہا ثوبانہ نے ان کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

"بات تو کرو۔۔۔ میں بھی تو دیکھوں کہ عمر خان نے میرے لیے بھی کوئی جگہ چھوڑی ہے یا نہیں۔" اپنی بات کر کے ثوبانہ نے یس کا بٹن دبا کے موبائل عمر خان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ہیلو۔۔۔" عمر خان کی آواز خود اپنا ساتھ بھی نہیں دے رہی تھی۔

"خان! کہاں ہیں آپ۔۔۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز با آسانی ثوبانہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"ایک دوست کی طرف ہوں۔" بمشکل جواب دیا۔

ثوبانہ کے وجود کو عمر خان کا نرم لہجہ لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ رہا تھا۔

انتقام کا ناگ پھن پھیلا رہا تھا۔

"ثوبانہ! فاطمہ بھی تمہاری طرح بے گناہ تھی۔ اس

کی زندگی بھی کھیل بنی تھی۔" عمر خان نے اس کا دفاع کرنا چاہا۔

"لگتا ہے اس سے بھی محبت ہو گئی ہے۔" عمر خان کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا۔۔۔ دل سوکھے پتے کی مانند کانپنے لگا۔

"لیکن مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے عمر خان! اب میری باری ہے۔ اس نے اپنا حق وصول کر لیا۔" ثوبانہ کی بات پہ عمر خان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب۔" عمر خان کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"مطلب یہ کہ تمہیں اسے اسی طرح جرگے میں واپس بھیجنا ہو گا جیسے اس کے بھائی نے مجھے وہاں سے رسوا کر کے بھیجا تھا۔ بولو عمر خان! میری محبت کا اتنا بھرم تو رکھو گے نا۔"

عمر خان کو لگا کہ جیسے ان کے وجود کے کسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیے ہوں۔

"عمر خان! تب کی بزدلی کا تاوان آج دے دو۔ اب میرا اور میرے بچوں کا حق ہے۔ وہ مجھ سے یہ اعزاز چھین نہیں پائی کہ میں اس سے پہلے تمہارے بچوں کی ماں بنی ہوں۔" ان کا کھو کھلا دعوا بہر حال موجود تھا۔

"بچے۔۔۔ میرے بچے؟"

"ہاں عمر خان! ہمارے دو جڑواں بیٹے ہیں۔ فیض اور شبیر۔۔۔"

"وہ۔۔۔ جو دونوں ساریہ کے گھر تھے۔۔۔ وہ میرے بیٹے تھے؟" آواز پھٹنے لگی۔

"مجھے ان سے ملنا ہے ثوبانہ۔۔۔" وہ بے قرار ہو گئے۔

"پہلے ان کی ماں کی حیثیت کا تعین تو کرو عمر!"

"میں تمہیں پوری عزت کے ساتھ لے کے جاؤں گا۔ تمہیں تمہارا پورا حق ملے گا ثوبانہ۔۔۔" عمر خان نے ثوبانہ کو کندھوں سے تھامتے ہوئے جذباتی آواز میں کہا۔

"لیکن میری شرط برقرار ہے۔۔۔ وہ یا میں۔۔۔

درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی سے ساریہ اور زیاد کا مستقبل بھی مشروط ہے۔ یہ آپی کا فیصلہ بھی ہے۔" ثوبانہ نے فیصلہ سنا دیا۔

"ثوبانہ! ایک دفعہ اس سے مل لو۔ وہ بہت اچھی ہے۔۔۔" عمر خان کو ایسے لگ رہا تھا کہ ان کی آواز جیسے کسی کنویں سے آ رہی تھی۔

"وہ بہت زیادہ اچھی ہے تو بھی تم سے اپنا حق وصول کر چکی ہے۔" ثوبانہ کے اندر عمر خان کے نرم لہجے سے طوفان اٹھ رہا تھا۔ گویا اس نے عمر خان جیت ہی لیا تھا اور وہ تمام عمر کی آبلہ پائی کے بعد بھی نامراد ہی رہی تھیں۔

"ثوبانہ پلیز! سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں نے تمام عمر تمہاری محبت کے نام پہ بے سروسامانی میں گزار دی پھر بھی اس سے ہار گئی۔ جو غاصب بن کے ہماری زندگیوں میں آئی تھی۔۔۔ عمر! مجھے اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے۔ میں ہار گئی ہوں۔ وہ ظالم ہو کے بھی جیت گئی ہے۔" وہ منہ چھپا کے بری طرح رو دیں۔

"ثوبانہ! تم غلط سوچ رہی ہو۔۔۔ ظلم تمہارے ساتھ اگر ہوا ہے تو اس کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ تم نے ساری زندگی جو سزا دور رہ کے گزاری ہے اس نے وہ سزا میرے ساتھ رہ کے جھیلی ہے۔ اسے کبھی میری محبت نہیں ملی۔"

"تو کاٹ پھینکو اس مصنوعی حصے کو۔ سینے سے لگائے رکھنے کا فائدہ۔۔۔ کیوں اپنا سایہ بنا کے رکھنا چاہتے ہو۔" وہ چیخ اٹھیں۔

"ثوبانہ کوئی ایک نیکی جو میں نے تمہارے ساتھ کی ہو۔ اس کے بدلے اسے میری حویلی میں رہنے دو۔"

"عمر! تمہارے لہجے کی تڑپ میری ہار کا اعلان ہے۔۔۔ لیکن میں لڑوں گی اور جو کہا ہے اس پہ جمی رہوں گی۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

وہ کہہ کے تیزی سے نکل گئیں اور وہ پکارتے رہ گئے۔ کتنی ہی دیر بیٹھے رہے، پھر ٹوٹے قدموں سے وہاں سے نکل گئے۔

"کیا پاگل پن ہے۔ کیوں بھاگ رہی ہو مجھ سے۔" فیض پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

وہ بنا کچھ بولے بے چارگی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔

"غور سے دیکھ لو۔ اتنا برا بھی نہیں ہوں۔" وہ نظر کرم دیکھ شوخ ہوا۔

"فیض پلیز۔ مجھے لوگوں کی معنی خیز نظروں کا سامنا کرنا اچھا نہیں لگتا، کہیں تماشا نہ لگ جائے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"تو پھر کیا کروں میں۔"

"اپنے امی ابو کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ جائز رشتہ ہو تو کردار پہ انگلیاں نہیں اٹھتیں۔ میری یہی ریکویسٹ ہے۔"

وہ کہہ کے اٹھی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"لوٹ آؤ جناب! محترمہ چلی گئی ہیں۔" شبیر فیض کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا تو وہ چونک گیا۔ شبیر نے دونوں کو ساتھ دیکھ کے ڈھیروں دعائیں مانگ ڈالی تھیں۔ اسے اس کا اور فیض کا ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاں چلی تو گئی ہے مگر لوٹنے کے لیے۔"

"اب جلد سے جلد جسے دل میں بسایا ہے اس سے گھر بھی بسا لو۔"

"وہ بھی تو یہی کہہ رہی تھی۔" فیض نے جھٹ کہا۔

"اف میں کتنا معصوم سمجھا تھا اسے۔۔۔ مگر کتنی تیز نکلی، دو ملاقاتوں میں بات شادی تک پہنچا دی ہے اس نے۔" شبیر نے شرارت سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے شبیر! وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے کردار پہ انگلی نہ اٹھائے۔ وہ بنا کسی رشتے کے مجھ سے ملنے سے انکاری ہے۔"

"وہ مضبوط کردار کی لڑکی ہے اور ایسی ہی لڑکیاں گھر بناتی ہیں۔" وہ فیض کی پسند پر مطمئن تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں اپنے بچوں کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے لگی ہوں۔" ثوبانہ کو بار بار خیال آ رہا تھا۔

"میں تو تمہیں تب فتح نہیں کر سکی، جب تم میرے پاس اور صرف میرے تھے۔ اب بھلا اپنے بچوں کی لڑائی کیسے جیت پاؤں گی۔ کتنی شان سے اس نے میری محبت کے تاج محل پہ اپنی فتح رقم کر لی۔ میں محبت کی لڑائی میں اپنی ہار تسلیم کرتی ہوں۔

فاطمہ بی بی۔۔۔ مگر ایک ترپ کا پتا ابھی میرے پاس ہے۔ تم اپنے بیٹے کی محبت کی خاطر آؤ گی میرے پاس اور اس مقام پہ میں تمہیں ضرور شکست دوں گی۔ ماں کبھی نہیں ہارتی۔ تب میں تم سے عمر خان کو چھین لوں گی۔"

ثوبانہ شاہ کی فطری سرکشی عود آئی جو عمر خان سے محبت کے بعد کھو گئی تھی۔ "مجھے وہ وقت نہیں بھولتا جب میں محبت بھرا ہاتھ تھامے عمر خان کے ساتھ وہاں گئی تھی اور تمہارا بھائی تمہیں اور مجھے بازار میں لے گیا تھا۔

کیسے تم سب نے مل کے مجھے اور عمر خان کو جدا کر ڈالا تھا۔

ان منصفوں پہ خدا کا قہر نازل ہو جنہوں نے مجھے رسوا کر ڈالا تھا۔

مجھے اور فاطمہ بی بی کو ترازو میں بٹھایا جائے اور۔۔۔ اور جس کا وزن زیادہ ہو گا وہی عمر خان کی دلہن ہو گی۔

میں تو پاگل ہو گئی تھی اپنی اس توہین پہ۔ فاطمہ بی بی کے ساتھ اس کا پورا قبیلہ تھا اور میں اور عمر تنہا چلا رہے تھے اس وحشیانہ اور ظالمانہ فیصلے پہ۔ مگر بے سود۔ ہم ہار گئے، فاطمہ بی بی ترازو میں تل گئیں مگر میں نے انکار کر دیا، اور ہم ہار گئے۔

"جدا کر دو۔" فیصلہ سنا دیا گیا۔

وہ بلاشبہ حشر کا ہی میدان تھا۔ منصف بھی تھے۔ ترازو بھی تھا مگر انصاف کہاں تھا۔ ترازو کی حرمت کھو گئی تھی۔ انصاف بے توقیر ہو گیا۔

ثوبانہ کو وہاں سے رات کے اندھیرے میں نامراد لوٹا دیا گیا۔ وہ جو جگنوؤں کی تلاش میں گئی تھی، مقدر میں اندھیرے سجائے لوٹ آئی۔

"کیا میرا کوئی حق نہیں کہ ان ظالموں سے حساب لوں۔ تب تنہا تھی' اب تو نہیں ہوں۔ اب میری طاقت میرے بیٹے ہیں۔ اب میں لڑوں گی۔"

ثوبانہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جیت کے دکھائیں گی کہ جھکنے اور ڈرنے والوں کو زمانے والے اور دباتے ہیں۔ اب دنیا سے لڑنا ہے۔ ڈر اور خوف کہیں بھاگ گیا۔

☼ ☼ ☼

"خان! ہم نے ساریہ کے گھر والوں سے ملنے جانا تھا' آپ نے کہا تھا۔" فاطمہ بی بی نے چپ چاپ بیٹھے عمر خان کو مخاطب کیا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ یوں ہی خاموش خاموش سے تھے۔ ہر کوئی محسوس کر رہا تھا' مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ لالئی کا نکاح ہو جائے تو پھر چلیں گے۔" انہوں نے ٹالا۔

"ٹھیک ہے' مگر ایک بات تو بتائیں کہ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" خان فاطمہ بی بی کے محبت بھرے لہجے میں کھو سے گئے۔ جواب ہی نہ دے پائے۔

لالئی کے نکاح کے ہنگامے میں سب ان کی خاموشی کو بیٹی سے جدائی کے احساس سے جوڑتے رہے۔ فاطمہ بی بی کی محبت اب تناور درخت بن کے ان کے پورے وجود پہ سایہ کیے ہوئے تھی۔ کیسی آندھی چلی تھی کہ اس درخت کو جڑ سے ہی اکھاڑ دینا چاہ رہی تھی۔

لالئی کا نکاح بخیریت ہو گیا۔ یہ تو کوئی لالئی کے دل سے پوچھتا کہ اس پہ کیا بیت رہی تھی۔ خوف سے اس کا دل بند ہو رہا تھا۔ ملالئی اور مرجانہ دونوں نے مل کے خوب رونق لگا رکھی تھی۔ زیاد خان کو بہن کی خوشی سے بھی زیادہ یہ احساس تسکین دے رہا تھا کہ مرجانہ کے اندر زندگی کا احساس زندہ تھا۔ وہ واپس لوٹ آئے گی۔ ان شاء اللہ۔ وہ خود سے کہہ کے مسکرا دیا۔

نکاح کے بعد رات وہ اپنے کمرے میں آئی تو دھیان ربیط کی جانب چلا گیا۔ لب مسکرا دیے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ربیط خان کو جیت لے گی۔ سب وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ابھی وہ ان سوچوں میں ہی گم تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر ربیط خان کا نام جگمگا رہا تھا۔ دل دھڑک اٹھا۔

"ہیلو۔۔۔"

"لالئی۔۔۔ مجھے تم سے ملنا ہے۔" وہ جھٹ بولا۔

"کیا مطلب۔" وہ گھبرا گئی۔ ان کی طرف ایسا کب ہوا تھا کہ لڑکا اور لڑکی نکاح یا منگنی کے بعد ملاقاتیں کر پائے ہوں۔

"مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"مگر میں سب کو کیا کہوں گی۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تمہارے پاس صرف تین دن ہیں۔ چھوٹی حویلی میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے کہہ کے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼
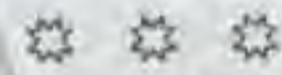
اسی شام فاطمہ بی بی کا بلڈ پریشر ایک دفعہ پھر شوٹ کر گیا۔ وہ پسینے میں نہا گئی تھیں۔ عمر خان گھبرا گئے۔ فوراً زیاد خان کا نمبر ملایا۔ وہ بھاگا چلا آیا۔ وہ ڈاکٹر تھا' مگر سامنے اس کی ماں تھی' ہاتھ پاؤں تو پھولنے ہی تھے۔

"بابا! میں اماں کے لیے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لیتا ہوں۔ آپ کل چلیں میرے ساتھ شہر۔" زیاد نے کہا تو انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا' جب فاطمہ بی بی کی آنکھ کھلی تو عمر خان صوفے پہ بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

"خان ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ سوئے کیوں نہیں۔" فاطمہ بی بی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں تو عمر خان ان کے پاس آ کے بیڈ پہ بیٹھ گئے۔

"پتا نہیں کیوں نیند نہیں آ رہی۔"

"خان بھروسا ہے تو بتا دیں کہ وہ فون کس کا تھا۔" فاطمہ بی بی کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"آپ اس فون کو بھول کیوں نہیں جاتیں فاطمہ۔" وہ زچ ہوئے۔

"مجھے لگتا ہے خان کہ اس فون کے بعد آپ ایک دن بھی سکون سے نہیں سوئے۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے فاطمہ! تم خود کو پریشان نہ کرو۔" وہ نرمی سے بولے تو فاطمہ خاموش ہو گئیں۔

صبح زیاد خان نے ڈرائیور کو بڑی گاڑی نکالنے کو کہا۔ انہیں اسپتال جانا تھا۔ ملالئی نے بھی ہاسٹل واپس جانا تھا۔

"بابا! آج ہی ڈاکٹر کے بعد بھابھی کی طرف چلے جائیں نا۔" ملالئی نے کہا تو عمر خان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"ارے نہیں بھئی! اپنی لاڈلی بہو کے گھر ہم ایسے ہی تو نہیں جائیں گے۔ اس کے گھر تو ہم اہتمام سے جائیں گے۔ باقاعدہ پروگرام کے ساتھ۔" فاطمہ بی بی نے عمر خان کا بھرم رکھ لیا۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

لیکن قدرت کو ابھی عمر خان کی آزمائش منظور تھی۔ ملالئی کو ہاسٹل چھوڑ کے اسپتال آئے تو زیاد خان نے فاطمہ بی بی سے ساریہ کو ملوایا۔

"ماشاء اللہ میری بیٹی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اللہ میرے بیٹے کا دل اور گھر دونوں اس چاند کے اجالے سے روشن رکھے۔" ساریہ کو خود سے لگا کے کتنی دیر وہ اسے اپنی دعاؤں سے نوازتی رہیں۔

شرم سے ساریہ کا چہرہ جھک گیا۔ "میں نے اپنی بیٹی کو پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ یہ میری طرف سے۔۔۔" انہوں نے اپنے ہاتھ کی شہادت انگلی سے انگوٹھی اتار کے ساریہ کی انگلی میں پہناتے ہوئے کہا تو وہ جھجک گئی۔

"اماں۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔"

"میں نے اپنے زیاد کی دلہن کو دیا ہے' تمہیں تو نہیں۔" وہ مسکرا کے بولیں تو وہ شرما گئی۔

"اماں! ساریہ کی خالہ جانی اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ آئیں انہیں دیکھ لیتے ہیں۔ آپ کی ساریہ کی ماما سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"خان چلیں؟" فاطمہ بی بی عمر خان کی طرف مڑیں تو وہ کچھ بول نہ پائے۔

"بابا جان! آئیں نا۔" ساریہ نے کچھ اتنی محبت سے عمر خان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ وہ فقط اتنا کہہ سکے۔

"فاطمہ! آپ مل آئیں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے ساریہ کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔

"ماما! دیکھیں تو کون آیا ہے۔" ساریہ دروازہ بجا کے اندر آ گئی اور لائبہ واحدی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

وہ مڑیں تو ساکت ہو گئیں۔ دھڑکنیں تو ثوبانہ شاہ کی بھی رک گئی تھیں۔ انہوں نے اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ماما یہ زیاد کی اماں ہیں۔ آج ڈاکٹر کی طرف آئی تھیں تو مجھ سے ملاقات ہو گئی۔" ساریہ نے تعارف کروایا۔

"السلام علیکم۔" لائبہ واحدی کو آگے بڑھنا پڑا کہ ابھی تو کھیل پردے میں تھا۔

"بیٹھیں۔۔۔" لائبہ واحدی نے نہ چاہتے ہوئے بھی حق میزبانی ادا کیا۔

"شکریہ۔۔۔" فاطمہ بی بی' ثوبانہ کے سامنے بیٹھ گئیں۔ "ہم نے ایک دو دنوں میں آنا ہے آپ لوگوں کی جانب۔" فاطمہ بی بی نے ساریہ کو دیکھ کے مسکراتے ہوئے کہا۔ فاطمہ بی بی کا ایک ایک انداز بتا رہا تھا کہ ابھی عمر خان نے انہیں لاعلم ہی رکھا ہے۔ زیاد بھی سلام دعا کے بعد باہر نکل گیا۔

ساریہ تو ان کی شخصیت سے شدید متاثر لگ رہی تھی۔ اسکائی بلیو چائنا سلک کی نفیس شلوار قمیص پہ پشمینہ شال سے اپنے وجود کو مکمل طور پہ ڈھانپے وہ انتہائی پروقار شخصیت کی مالک لگ رہی تھیں۔ ان کا پشتو زبان کا لب و لہجہ انہیں اور بھی منفرد بنا رہا تھا۔

"آپ کے ہسبینڈ کہاں ہوتے ہیں۔" انہوں نے ثوبانہ شاہ سے پوچھا تو ساریہ نے ہی بتایا کہ ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔

"اوہ۔۔۔ بہت افسوس ہوا سن کے۔ انسان کے ساتھ اگر ہم سفر نہ ہو تو زندگی بہت مشکل سی ہو جاتی ہے۔"

"آپ کی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔" نہ جانے کیا سوچ کے ثوبانہ نے یہ سوال پوچھا تھا۔

"ماشاء اللہ بہت اچھی اور جب عمر خان جیسا محبت کرنے والا انسان ساتھ ہو تو مشکلات بھی خوب صورت زیور ہی لگتی ہیں۔" ان کے لہجے کا سکون ثوبانہ کے تن بدن کو سلگا گیا۔

"ان شاء اللہ ساریہ وہاں بہت خوش رہے گی' کیونکہ زیاد بہت محبت کرنے والا بچہ ہے اپنے بابا کی طرح۔" وہ اٹھ کے ساریہ کو خود سے لگا کے بولیں۔

وہ اللہ حافظ کہہ کے نکلیں تو ساریہ ان کے ساتھ باہر نکلی۔

"عمر! تم اتنے بزدل ہو کہ اس کے ساتھ میرے سامنے بھی نہ آسکے۔ تم بھلا کیسے ہمت کرتے۔ فاطمہ کی ایک ایک ادا سے تمہاری محبت کا خمار جھلک رہا تھا۔ میں نے تمام عمر تمہاری چاہت کی طلب میں رائیگاں کر ڈالی۔ میرے پہلو میں تمہاری محبت اور تمہارے پہلو میں نئی محبت۔۔۔ واہ عمر خان واہ۔۔۔ محبت اس شان سے نبھائی جاتی ہے تمہارے قبیلوں میں۔"

☼ ☼ ☼

جوں ہی ربیط کو معلوم ہوا کہ سب شہر گئے ہوئے ہیں' اس نے فوراً" لائبہ سے رابطہ کیا۔ وہ جو یہ تہیہ کیے ہوئے تھی کہ اپنے روٹھے ساجن کو جھک کے منت کرکے ہر طرح سے منالے گی' ارادہ باندھ کے اس کی جانب چلی آئی۔ لیکن سب ارادے ڈگمگا گئے' جب میز پہ اس نے وہ مکروہ سیال دیکھا' جس کی وجہ سے انسان حیوان بن جاتا ہے۔ جوں ہی لائبہ کو اس کے ارادوں کا اندازہ ہوا' وہ جھٹکے سے پلٹی مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

"ربیط! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا کر رہا ہوں میں۔۔۔ ایک شوہر اپنی بیوی سے کیا پیار بھری کوئی بات نہیں کر سکتا۔" وہ مسکرایا۔

لائبہ کی سانسیں رکنے لگیں۔ وہ اس کی جانب بڑھا اور اس کے گھنے بالوں کی چوٹی کھول کے سیاہ زلفوں کو بکھرا کے قیامت برپا کر دی اور پھر اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تو جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔

وہ مردہ قدموں سے حویلی واپس آگئی۔ او میرے اللہ! میری لاج رکھنا۔ وہ مذہبی و قانونی لحاظ سے مجھ پر استحقاق رکھتا تھا مگر کچھ رسم و رواج بھی تو ہوتے ہیں جن کی پاس داری کرنی پڑتی ہے۔

خدایا اگر۔۔۔ تو پھر میں کیا کروں گی۔ کیا جواب دوں گی سب کو۔۔۔ کیسے سامنا کروں گی اماں' بابا اور لالہ کا۔ ساری دنیا کا مقابلہ کیسے کروں گی۔

وہ ابھی اپنے دکھوں پہ رو رہی تھی کہ بابا نے نیا طوفان اٹھا دیا۔ انہوں نے زیاد لالہ کا رشتہ ساریہ واحدی سے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

پورے دو دن کی اذیت کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچے تھے کہ وہ فاطمہ کو جدا نہیں کر سکتے۔ وہ ان کی ذات کا لازمی حصہ تھیں۔ وہ اب اتنی بے دردی سے انہیں کاٹ کے خود سے دور نہیں کر سکتے۔

"نہیں خان! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں ہاتھ جوڑ کے آپ سے اپنے بیٹے کی خوشیاں مانگتی ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولیں تو وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ گویا وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھے۔

"خان! اب اور کتنی سزا سہنی ہے مجھے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب میرے سکھ کے دن آگئے ہیں۔" وہ دوپٹے میں منہ چھپا کے رو پڑیں۔

"اماں! مت روئیں' یہ مرد نام کی مخلوق پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ ان سے سر ٹکرانا خود کو توڑنے کے مترادف ہے۔ ان سے اگر کچھ مل سکتا ہے تو صرف زخم۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔" لائبہ نے ماں کا ہاتھ تھام کے کہا اور ان کے ساتھ خود بھی رو پڑی۔

لائبہ کا پہلا شک ربیط کی طرف گیا کہ کہیں اس نے تو کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ وہ بھاگ کے کمرے تک آئی اور موبائل سے اس کا نمبر ملایا۔

"ربیط۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ایسی کیا بات ہے' جس کے لیے محترمہ کو میرا نمبر ملانا پڑا۔" اس نے پوچھا۔

"بابا سے آپ نے کیا کہا ہے کہ وہ لالہ کی شادی کے خلاف ہو گئے ہیں۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ ربیط کا قہقہہ بلند ہوا۔

"آپ نے اس دن کہا تھا کہ اگر میں نے آپ کی بات نہ مانی تو آپ زیاد لالہ سمیت میرے سارے گھر والوں کو خوشیوں سے محروم کر دیں گے۔ ربیط! ہمارے پاس خوشیوں کے نام پہ یہی کچھ ہے۔ خدا کے لیے ہم پہ رحم کھائیں۔" وہ اس کی منتیں کرنے لگی۔

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ تمہارا بھائی کسی سے شادی کرے یا کسی کو اٹھا لائے۔ خبردار جو ان بے کار کی باتوں کے لیے مجھے فون کیا تو۔" وہ دہاڑتے ہوئے بولا اور فون بند کر دیا۔

"یاد رکھنا ربیط۔۔۔ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو مظلوم ایسا وار کرتا ہے کہ ظالم پھڑک بھی نہیں سکتا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ کچھ ایسا ہے جو مجھے اپنے وجود میں بدلا بدلا محسوس ہو رہا ہے مگر جو میں سوچ چکی ہوں تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

لائبہ کے اوپر گزرنے والی قیامت نے اپنا رنگ دکھا ہی دیا۔ اس کی ساری عبادتیں رائیگاں گئیں۔ وہ جو مصلے پہ رو رو کے اپنے رب سے دعائیں کرتی رہی تھی کہ اے اللہ مجھے بانجھ کر دے۔ میں کبھی ماں نہ بن سکوں۔ میری عزت رہ جائے۔۔۔ سب نامنظور ہو گئیں۔ کوئی بھی تو نہ تھا جو اس کے کرب کا اندازہ لگا سکتا۔

☼ ☼ ☼

"لیکن کیوں زیاد۔۔۔ کیوں نہیں آرہے ہو تم لوگ۔" ساریہ فون پہ زیاد کی بات سن کے پریشان ہو گئی۔ "یہاں تو سب انتظار میں ہیں۔" وہ حد سے زیادہ مایوس ہوئی تھی۔ جب دل میں اندیشے پل رہے ہوں تو سوچوں کو بے راہ ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ ایک پل میں ہر اس سوچ سے گزر چکی تھی جس کے ہونے کا ہلکا سا بھی شائبہ اسے اپنی اور زیاد خان کی محبت کی راہ میں نظر آیا تھا۔

"دراصل بابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" زیاد خان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے مطمئن کرتا۔

"پھر کب زیاد۔۔۔" بے یقینی صاف ظاہر تھی۔

"کمال کرتی ہو تم بھی ساریہ! میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ بابا کی طبیعت خراب ہے۔ اب میں تمہیں دنوں' گھنٹوں اور منٹوں میں بتاؤں کہ کب آئیں گے۔ بجائے یہ پوچھنے کے کہ اب وہ کیسے ہیں' تم۔۔۔" سارا غصہ اس پہ نکال دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس لہجے میں بات کرے گا تو وہ کچھ دن کے لیے خود کو چپ کی سولی پہ لٹکا لے گی۔

"سوری ساریہ۔۔۔ میں نے زیادہ سخت لہجہ اپنایا۔۔۔ بابا کی وجہ سے میں دراصل بہت پریشان ہو جاتا ہوں نا اس لیے۔"

"بابا جان کا پرابلم کیا ہے۔"

"ساریہ! ان کا بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ وہ میڈیسن لینے میں بھی سستی کرتے ہیں۔" کئی دفعہ کی بتائی ہوئی بیماری دہرائی۔

"تو اماں سے کہو کہ ان کے ساتھ ذرا نرمی نہ کریں۔" اس نے مشورہ دیا۔ "پتا ہے جب ڈیڈی کی طبیعت خراب ہوتی ہے اور وہ کوئی بات نہ مانیں تو ماما خود بھی اپنی ٹیبلیٹس لینا بند کر دیتی ہیں۔ جن کا ڈاکٹر نے ایک دن بھی ناغہ منع کیا ہے۔" وہ مسکرائی۔

زیاد خان تو مسکرا بھی نہ سکا تھا کہ ان لوگوں نے بھلا کب یہ سب دیکھا تھا۔ جبر کی رسی سے بندھے رشتے جنہوں نے کبھی رشتوں کی لذت کو محسوس ہی نہ ہونے دیا تھا۔

"اچھا ساریہ! میں تم سے پھر بات کروں گا' اللہ حافظ۔" بنا اس کی بات کا جواب دیے اس نے فون بند کر دیا۔ دکھ کی شدید لہر نے ساریہ کا محاصرہ کر لیا۔

"بیٹا! کیسی ہے اب زیاد کے والد کی طبیعت۔" شام لان میں بیٹھے جب سب چائے پی رہے تھے تو وقار

واحدی نے پوچھا۔

"جی پاپا! ابھی دوبارہ بات ہوئی ہے' کہہ رہا تھا کہ اب کافی بہتر ہیں۔"

لائبہ واحدی نے شرم سے ہلکا ہلکا سرخ شرمایا' شرمایا بیٹی کا چہرہ دیکھا تو دل ڈولنے لگا۔

"ایسا کرنا مجھے عمر خان کا نمبر دے دینا' میں خود بھی اس کی طبیعت کا پوچھ لوں گا۔ ویسے آپس کی بات ہے' میں کافی ڈرا ہوا تھا مگر ملنے کے بعد مجھے وہ بہت اچھی فیملی لگی ہے۔" وقار واحدی نے کہا تو عبید نے بھی ان کی تائید کی۔

"ڈیڈی! زیاد کی اماں بھی بہت اچھی ہیں۔ انتہائی گریس فل اور محبت کرنے والی۔" ساریہ نے کہا تو لائبہ واحدی کو عجیب سی الجھن ہونے لگی اس گفتگو سے۔ اس لیے انہوں نے بات کا رخ بدل دیا۔ موضوع گفتگو بدلا تو ساریہ اٹھ کے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے بعد کافی دفعہ اس نے زیاد کا نمبر ملایا مگر مل ہی نہ رہا تھا۔ مسلسل بند مل رہا تھا۔

"ساریہ! زیاد کا کوئی فون آیا۔" لائبہ واحدی نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے سوال کیا۔

"جی نہیں ماما! پتا نہیں کیا پرابلم ہے۔ نمبر بھی بند مل رہا ہے۔ میرا دل ڈر رہا ہے۔" اس نے کہا تو لائبہ واحدی کے دل کی حالت غیر ہونے لگی۔

وہ تو سمجھی تھیں کہ ایک محاذ پہ ساریہ اور ثوبانہ دونوں کی جنگ لڑیں گی۔ مگر اب تو ہاتھ لگی بساط بھی ہار رہی تھیں۔ اب پیچھے ہٹنا بھی' ممکن نہ تھا کہ ثوبانہ کو اس لڑائی کے لیے ہتھیار خود انہوں نے دیے تھے۔ زبان سے نکلے لفظوں کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو کیا بتاتیں کہ وہ کیا کھیل کھیل رہی تھیں۔ کبھی کسی ماں نے اپنی اولاد کو بھی مہرہ بنایا ہے۔ وہ تو ایسا ہی کر رہی تھیں۔ اس یقین اور بھروسے پہ کہ شاید اس طرح ان کی برسوں کی تھکی ہاری بہن کو اب اس عمر میں منزل مل جائے۔

انہیں اپنی بہن کی ساری اذیتیں یاد تھیں۔ اس کی تکلیف کا ایک ایک دن..... ان کو یاد تھا وہ دن جب ثوبانہ انہیں بے سہارا عورتوں کے ادارے میں [illegible] تھی۔ اس کی حالت انہیں لہو رلا گئی۔ اس بے درد [illegible] خاطر اپنے ماں' باپ کا آخری دیدار تک نہ کر سکی [illegible]

آج وقت عمر خان کو سامنے لے تو آیا تھا۔ مگر اب ثوبانہ کے ساتھ ساریہ بھی لائن میں کھڑی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اماں! آپ بابا سے بات کریں نا۔" لالئی حالات بری طرح بگڑتے دیکھ کے فاطمہ بی بی کے پاس چلی آئی۔

"کاش! میں اپنے بچوں کی خوشیوں کی حفاظت کر سکتی۔" لالئی نے ان کا ہاتھ تھاما تو احساس ہوا کہ ان کے وجود میں کتنی برف جمی ہے۔

"ٹھیک ہے اماں..... اگر آپ بات نہیں کریں گی تو میں بات کروں گی۔" لالئی نے ارادہ کر لیا۔

وہ ہمتیں جمع کر کے عمر خان کے کمرے تک آئی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

"بابا! آپ سوتو نہیں گئے تھے۔" وہ رات کو ان کے کمرے میں آئی تھی۔

"نہیں..... نہیں لالئی آؤ۔" وہ فوراً" مسکرائے۔

"بابا....." اس نے ہمت کر کے پکارا اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"لالئی کیا ہوا بچے! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ اس کے انداز پہ پریشان ہو گئے۔

"بابا! آپ جانتے ہیں نا کہ ہم رشتوں کے معاملے میں کتنے بدقسمت ہیں۔ اب اور کھونے کا حوصلہ ہے بھلا۔"

"نہیں بیٹا! اب میں اور کوئی رشتہ کھونے نہیں دوں گا۔" انہوں نے انتہائی مضبوطی سے اپنی بات کی۔

"تو پھر بابا! مان جانے کے بعد زیاد لالہ کو کیوں محروم کر رہے ہیں۔ کیا اس طرح ہم زیاد لالہ کو کھو نہیں دیں گے۔" وہ ان کے سامنے سوال پہ سوال رکھ رہی تھی اور ان کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

"بیٹا سمجھ لو کہ اس رشتے میں سراسر گھاٹا ہے۔" وہ چھت پہ نظریں مرکوز کرتے ہوئے اداسی سے بولے۔

"بابا! آپ کہیں مرجانہ کے لیے تو نہیں سوچ رہے۔" اس نے وہ کہہ ہی دیا جو کب سے اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔ انہوں نے ساکت نظروں سے اسے دیکھا۔

"بابا آپ اور اماں سے زیادہ کس نے نقصان اٹھایا' ان جبری رشتوں کے عذاب سے۔ آپ دونوں ہی نایاب تھے مگر رل گئے۔ کیا اب آپ لالہ کو بھی جبر کی زنجیر سے باندھنا چاہتے ہیں۔ یوں رشتے نہیں ہوتے بابا۔"

"ہمارے ہاں رشتے جبر کی زنجیروں سے باندھ کے ہی طے ہوتے ہیں لالئی! جب ان کی قیمت نہیں لگتی تو فیصلہ ترازو کرتا ہے۔ اب خان نے بھی بھائی کی محبت کی قیمت بیٹے کی خوشیاں قربان کر کے اتارنی ہوں گی۔" فاطمہ بی بی کی آواز پہ دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھا کے دروازے کی جانب دیکھا جہاں وہ نہ جانے کب سے کھڑی تھیں۔ لالئی نے اٹھ کے ماں کو تھاما۔

"خان! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ لالہ کی محبت میں آپ اپنے بیٹے کی خوشیاں چھین لیں گے تو میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ رہی بات مرجانہ کی تو خان! لڑکی اور لکڑی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کے مقدر میں جلنا لکھا ہوتا ہے اور جل جانا تمام عمر سلگتے رہنے سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔" عمر خان کے مرجانہ کے نام پہ خاموشی سے انہوں نے یہ ہی سمجھا کہ خان کے انکار کے پیچھے یہی وجہ ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"میں نے تمام عمر چپ رہتے ہوئے گزاری ہے خان! صرف اس لیے کہ تب اپنی ذات پہ سہنا تھا' مگر اب بات میرے بچوں کی خوشیوں کی ہے اب میں چپ نہیں رہوں گی۔" وہ نڈر ہو گئیں۔ لالئی چپکے سے درمیان سے نکل گئی۔

عمر خان آہستگی سے چلتے ہوئے ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ کندھوں سے تھاما اور اپنی پناہوں میں لے لیا۔ دونوں کے درمیان صرف گھڑیال کی ٹک ٹک تھی۔ اس ٹک ٹک کی آواز میں ان کے گزرے ہوئے سالوں کے ضائع ہونے کا دکھ تھا۔

"خان....." فاطمہ بی بی کو اس ہارے ہوئے شخص کا انداز سمجھ میں نہ آیا۔

"فاطمہ! آپ نے ہر کسی کی تکلیف اپنے وجود پہ سہی ہے۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کا وجود ان تکلیفوں سے آزاد ہو' اب اور کوئی تکلیف آپ کا مقدر نہ بنے۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"آپ کیوں چاہتے ہیں کہ زیاد خان بھی آپ کی طرح معذوروں والی زندگی گزارے۔ بیٹے کو بھی اسی آگ میں جھونکنا چاہتے ہیں' جس میں تمام عمر خود بھی جلے اور مجھے بھی جلاتے رہے۔ کچھ نہیں سیکھا آپ نے اپنی ناکام اور برباد زندگی سے۔" فاطمہ بی بی کی آواز میں واضح طور پہ آنسوؤں کی آمیزش شامل تھی۔ عمر خان تڑپ کے رہ گئے۔

"فاطمہ....." وہ رکے۔ "مجھے آج اقرار کرنا ہے کہ میں نے ثوبانہ کو چاہا تھا' پا بھی لیا' مگر وہ کھو گئی۔ تم سے میں نے بہت شدید نفرت کی..... مگر پھر اس نفرت کی آگ نے عمر خان کو ہی جلا کے بھسم کر ڈالا۔ خدا کو حاضر ناظر جان کے کہتا ہوں۔ اس راکھ سے' جس وجود نے جنم لیا' وہ تمام عمر تمہارے وصل کی تمنا میں جلتا رہا فاطمہ..... ایک آگ تھی جو جلاتی رہی' میں نے کئی بار خواہش کی کہ تمہیں اپنے قریب کر لوں' مگر تم نے اپنے اردگرد لوہے کا حصار قائم کر لیا تھا اور تم سے اگر مانگتا تو بھی کس منہ سے..... اس لیے جلتا اور سلگتا ہی رہا۔ اس آگ کو اگر کوئی بجھا سکتا تھا تو وہ تم تھیں فاطمہ..... صرف تم..... مگر تم بس میرا تماشا دیکھتی رہیں۔ عورت مرد کی طلب کو نہ سمجھے یہ کیسے ممکن ہے' تم نے مجھ سے بدلہ لیا۔ مجھ سے اپنی انا کی جنگ لڑتی رہیں۔ صرف محبت کی چند بوندیں میری پیاس کو بجھا سکتی تھیں۔ صرف تم فاطمہ' صرف تم وہ پیاس بجھا سکتی تھیں۔" عمر خان نے اعتراف محبت کیا۔ "میں نے ہر

آواز پہ پلٹ کے دیکھا۔ میں نے ہر دستک پہ تمہارا گمان کیا۔ میں نے ہر سجدے میں رب سے تمہیں مانگا۔ لیکن میں ہار گیا۔ مجھے تسلیم ہے عمر خان آج ہار گیا ہے اور ٹوٹ رہا ہے۔ مگر یہ آخری میدان ہے۔ فاطمہ مجھے کم از کم یہاں تو جیتنے دو۔ اب تو مجھے جیتنے دو۔" کہتے ہوئے انہوں نے منہ پھیر لیا۔

"آج میں یہاں اپنے حساب کتاب کے لیے نہیں آئی۔ مجھے میرے بچے کی خوشیاں چاہئیں۔ جو آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ آج جھولی اور ہاتھ دونوں پھیلا کے میں نے آپ کا یہ گلہ ختم کردیا کہ مجھے مانگنے کی عادت نہیں۔" فاطمہ بی بی نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"سوری فاطمہ۔۔۔ میں آج بھی تمہیں مایوس ہی کروں گا۔" انہوں نے بنا کسی مروت اور لحاظ کے انکار کردیا۔ وہ آج بھی عمر خان سے ہار کے ہی لوٹی تھیں۔

"پیاسا تو میرا وجود بھی تھا خان۔۔۔ تمہارے وجود میں لگی آگ نے کیا مجھے نہیں جلایا۔ تم نے میرے زخموں پہ مرہم رکھنے کا اس وقت سوچا جب وہ زخم ناسور بن چکے تھے۔ میں تمہیں کیا تھامتی' میں تو خود سہاروں کی تلاش میں تھی۔ آج تم نے یہ الزام بھی لگا دیا کہ میں نے تمہاری محبت کی قدر نہیں کی۔ یہ جرم بھی میرے سر آیا۔ میں تمہارے اشاروں کو نہیں سمجھی۔ عمر خان کیا میں کچھ سمجھنے کے قابل تھی۔ میرے وجود کو تم نے ہی تو پتھر کیا تھا۔ ہر جذبہ سرد پڑ تا گیا۔

☼ ☼ ☼

"ساریہ! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" زیاد خان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے سنبھالے' جو عمر خان کے فیصلے کو جاننے کے بعد سے روئے جارہی تھی۔

"زیاد! اب کیا ہوگا' میں تمہارے بنا مرجاؤں گی۔"

"جب میں راضی ہوں تو پھر فکر کی کیا بات ہے ساریہ!" زیاد اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔

"زیاد! بات میرے اور تمہارے راضی ہونے کی نہیں ہے۔ اگر اماں اور بابا جان نہیں آئے تو پاپا کبھی نہیں مانیں گے۔"

"عجیب منطق ہے۔ کیا ہم نے محبت بڑوں کو ضامن بنا کے کی ہے۔ جب ہم نے محبت خود کی ہے تو شادی بھی خود کرلیں گے۔" وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔

اس کی بات پہ ساریہ نے صدمے سے اسے دیکھا۔

"یار! میں پوری کوشش کررہا ہوں' اگر وہ نہیں مان رہے تو بتاؤ میں کیا کروں۔ یہ تو طے ہے کہ تم میرے سوا کسی کی نہیں ہوسکتیں۔ میں بھی یوں ہی زندگی گزار دوں گا۔" اسے لگی لپٹی رکھنی نہیں آتی تھی جو دل میں آیا بول گیا۔

رات لائبہ واحدی اس کے پاس آئیں تو اس کا ستا ستا چہرہ انہیں کچھ ہونے کی کہانی سنا رہا تھا۔

"ماما! زیاد کے بابا کو ابھی ڈاکٹر نے سفر کرنے سے منع کیا ہے۔" وہ نظریں چرا کے بولی تو لائبہ واحدی نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ پھر وہ چھپا نہ سکی۔

"ماما! زیاد کے بابا نے انکار کردیا ہے۔" ماں کے سینے میں جیسے کسی نے برچھی ماری تھی۔ ثوبانہ کی محبت نامنظور ہوگئی تھی۔

کون ثوبانہ کو اس تلخ حقیقت سے آگاہ کرتا کہ تم جس کا عشق دل میں بسائے عمر بتا چکی ہو' اس نے تمہیں ماننے سے انکار کردیا ہے۔ تمہاری آبلہ پائی بے کار گئی۔

"ماما! میں زیاد کے بنا مرجاؤں گی' میں اس کے علاوہ کسی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔" لائبہ واحدی کی لاڈلی رو رہی تھی۔

نہ جانے یہ ثوبانہ کی فریادیں تھیں کہ ساریہ کی۔ دونوں کے رونے کی آوازیں گڈمڈ ہورہی تھیں۔

"ساریہ۔۔۔" انہوں نے اسے پکارا۔ اس کا پورا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ "زیاد کیا کہتا ہے؟"

"ماما! وہ کہتا ہے کہ وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔" ساریہ نے بتایا۔

"لیکن اس کے ماں' باپ کا راضی ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم پہلے بھی ایک چوٹ کھا چکے ہیں۔" انہوں نے گویا اپنا فیصلہ بھی سنایا تھا۔

شام تک سارے گھر والوں کو اس بات کی خبر ہوگئی۔ سب اداس ہوگئے تھے۔ مگر فی الحال کوئی کچھ نہ کرسکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

زیاد خان تھکنے لگا تھا۔ اسے کسی طرح کوئی راستہ نہ مل رہا تھا۔ ساریہ کی طرف سے الگ دباؤ تھا اور بابا جان۔۔۔ آج آخری بار بابا سے اپنی محبت کی بھیک مانگوں گا۔ اس کے آنسو اس کے قلب پہ گرنے لگے۔ وہ سیدھا ماں کی طرف آیا کہ ان سے بھی مدد مانگے' مگر فاطمہ بی بی کے کمرے کے دروازے پہ جیسے اس نے دہکتے انگاروں پہ قدم رکھ دیے ہوں۔

"اماں! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرا اعتبار کریں۔ میں بے گناہ ہوں۔"

"تو نے مجھے جیتے جی ماردیا لالئی۔" فاطمہ بی بی روتی چلی گئیں۔

"اماں! مجھے معاف کردیں' مجھے معاف کردیں۔"

"بتا تو سہی کہ یہ کس کا بچہ ہے۔" وزنی چھت زیاد خان کے اوپر گری تھی۔

"اماں۔۔۔" وہ اس کا نام تک نہ لے سکتی تھی کہ بات پھر لالئی تک نہیں رہتی تھی' بلکہ ساریہ اور ملالئی تک چلی جاتی۔

"خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔" وہ اذیت سے چیخ اٹھی۔ ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ زیاد بجلی کی سی تیزی سے اندر آیا۔

فاطمہ بی بی اور لالئی اس کی آنکھوں سے نکلتے شعلے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"اماں بھلے نہ پوچھیں مگر میں تم سے بہرحال پوچھوں گا اور دوسری بار اگر پوچھنا پڑا تو تمہاری جان نکال کے رکھ دوں گا۔ فوراً" بولو۔"

"لالہ۔۔۔" خوف سے لالئی کی آواز پھٹ گئی۔

"مت کہو مجھے لالہ۔۔۔ کوئی رشتہ نہیں ہے میرا تم سے۔" اس کے بھرپور مردانہ ہاتھ نے لالئی کے سرخ وسفید گالوں پہ واضح نشانات چھوڑے تھے۔

"بولو۔۔۔ جواب دو مجھے۔" وہ چلایا۔

"یہ۔۔۔ یہ ربیط کا۔۔۔" وہ چیخ اٹھی۔

"ربیط خان۔۔۔" فاطمہ بی بی اور زیاد خان کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔ لالئی نے سر جھکا لیا۔ زیاد خان تیزی سے نکلا اور سیدھا جبار خان کی حویلی آگیا۔

"کیا بات ہے بچے! کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" جبار خان نے الجھے الجھے زیاد خان سے پوچھا۔

زیاد خان نے جھکے سر سے ساری بات ان کو بتادی کہ سر اٹھانے کی سکت جو نہیں تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو زیاد خان۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔" ان کا وجود لرز اٹھا اور آواز کانپنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا بیٹا ایسا کرسکتا تھا۔ کتنا ہی وقت انہیں خود کو سنبھالنے میں لگا۔

"کیا عمر خان بھی اس بات سے واقف ہے۔" کافی دیر بعد انہوں نے مری مری آواز میں پوچھا۔

"نہیں کاکا جی۔"

"زیاد۔۔۔ میرے بچے یہ دیکھو۔ میرے ہاتھ جڑے ہیں کہ خود پہ قابو رکھنا اور عمر خان کو اس بات کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا۔ میں اپنے بھائی سے نظریں نہیں ملا پاؤں گا۔"

جبار خان نے اپنی پگڑی اتار کے زیاد خان کے قدموں میں رکھ دی۔

زیاد خان کانپ گیا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر ان کی پگڑی ان کے سر پہ رکھی۔

"میں ایک ہفتے کے اندر اندر رخصتی کا بندوبست کرتا ہوں۔ میرے جڑے ہاتھوں کی لاج رکھ لینا۔" انہوں نے پھر کہا تو زیاد خان نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"بیٹا اس بات کو یہی دفن کردو۔ میں عزت کھو جانے کا ازالہ تو نہیں کرسکتا۔ مگر بات کو سنبھال لوں گا۔" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس بے عزتی اور ذلت کا انجام کسی چھوٹے موٹے جھگڑے پہ نہیں ہوتا تھا' بلکہ بات خون خرابے تک چلی جاتی۔

"ارے۔۔۔ زیاد آیا ہے' السلام علیکم۔" ربیط خان

نے قدم اندر رکھے۔

زیاد خان رخ موڑے کھڑا رہا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ خود بخود گر گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی لالئی نے رو' رو کے اسے ساری بات بتائی تھی۔ جس کے بعد وہ حویلی چلا آیا تھا تاکہ دیکھ سکے جب بات اپنی بہن کی ہو تو بندہ کیسے تڑپتا ہے۔

"ربیط خان! تم نے یہ کیا کیا ہے۔" جبار خان غصے سے اس کی طرف بڑھے۔

"کیا کیا ہے میں نے۔" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ذلیل۔ کمینے۔" جبار خان نے ایک تھپڑ اسے مارا۔ "تم نے میرے بھائی کی عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ تم نے میرے جان سے پیارے بھائی کی گردن جھکائی ہے۔" جبار خان دہاڑے۔

"بابا جان! کیا کہہ رہے ہیں آپ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کھل کے بولیں' بات کیا ہے۔" وہ مکمل انجان بن گیا۔ اس وقت اسے زیاد خان کی بے بسی مزا دے رہی تھی۔

"بکواس کر رہی ہے وہ۔ جھوٹ بولتی ہے۔ کسی اور کا گناہ میرے ساتھ منسوب کر رہی ہے۔" جبار خان کے ساتھ ساتھ زیاد خان نے بھی جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"ربیط خان! یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ وہ تمہارا نام لے رہی ہے۔ تمہاری بیوی ہے' تمہاری عزت ہے۔" زیاد خان جھٹکے سے اس کی طرف مڑا' جواباً" وہ زور' زور سے چلانے لگا۔

"میں اتنا ذلیل اور کمینہ نہیں ہوں کہ ایسی گھٹیا حرکت کروں اور اب اسے بھی معاف نہیں کروں گا۔ وہ اب میری عزت ہے۔ اس سے حساب میں خود لوں گا۔" اس نے یکدم پانسہ ہی پلٹ دیا۔

"میں جرگہ بلواؤں گا۔" وہ قابو سے باہر ہونے لگا تو جبار خان نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

"بابا جان! میں اس سے یہ سوال ضرور پوچھوں گا اور زیاد خان کی موجودگی میں پوچھوں گا۔ کیونکہ میں اب اس کے ڈرامے کو سمجھنے لگا ہوں۔ وہ کافی دنوں سے فون کر کے مجھے شادی جلد طے کرنے پہ زور دے رہی تھی۔ یہ اس کے ایس ایم ایس دیکھیں۔" اس نے جان بوجھ کے اس کے کچھ پیغامات ان باکس میں رکھے ہوئے تھے' جن میں وہ شادی جلد کرنے پہ کہہ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔" جبار خان نے جاننا چاہا۔ زیاد خان نے ایک لمحے کے لیے نظریں نہ چرائیں۔

"ٹھیک ہے ربیط۔ اس کی ضرورت نہیں۔" جبار خان نے اسے روکا۔

جبار خان کو اس بات کی تکلیف تھی کہ اگر لالئی قصوروار تھی تو بھی ان ہی کے باپ' دادا کی پگڑی اچھالی جائے گی اور اگر ربیط نے یہ سب کیا ہے تو بھی اسی خاندان کی بے عزتی تھی۔

"زیاد خان! اگر اس نے مجھ پہ لگائے اس الزام کو ثابت نہ کیا تو یاد رکھنا کہ اپنی ذلت کا بدلہ اس سے ضرور لوں گا۔ وہ میرے نکاح میں ہے۔ میری عزت کے ساتھ کھیلی ہے۔" وہ کہہ کے نکل گیا اور زیاد خان نے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"زیاد خان! اسے کل یہاں لے آنا۔ میں خود اس سے بات کروں گا اور کوشش کرنا کہ عمر خان کو اس بات کا ابھی پتا نہ چلے۔" زیاد خان مردہ قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ لالئی ایسی نہیں ہے۔ وہ کوئی غلط قدم کیسے اٹھا سکتی ہے۔ اس نے ربیط کا نام لیا ہے۔ پھر ربیط کیسے منکر ہو سکتا ہے۔ لیکن ربیط خان ایسا کیوں کرے گا۔ لالئی آخر اس کی بیوی ہے اور ایک ڈیڑھ ماہ میں ان کی شادی بھی ہو جانی تھی۔ تو پھر کیا کوئی اور۔ دماغ کی رگیں تن گئیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔

فاطمہ بی بی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"اماں! وہ منکر ہے۔ جھٹلا دیا ہے اس الزام کو اس نے۔ کہہ رہا تھا کہ جرگہ بلوائے گا۔" وہ سر جھکا کے بولا فاطمہ بی بی نے ہائے اللہ کہہ کے سینہ پیٹ ڈالا۔

"اماں! بابا کی خاطر میں اپنی محبت سے دستبردار ہو سکتا ہوں۔ مگر میں اس اذیت سے انہیں کیسے بچاؤں۔ یہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے اماں۔" وہ بے بسی سے ماں کی گود میں سر رکھ کے رو دیا۔

"میں خود خان لالہ سے بات کرتی ہوں۔" وہ کچھ سوچ کے اٹھیں اور لالئی کو لے کے سیدھی جبار خان کی حویلی آئیں۔

ان کی نظریں تو ہمیشہ ہی جھکی ہوتی تھیں' آج تو سر بھی جھکا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ کمرے میں صرف لالئی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وہ ظالم بھی وہاں موجود تھا۔ آرشین جان بھی سب کچھ جان چکی تھیں اور نفرت بھری نظروں سے لالئی کو دیکھ رہی تھیں' جس نے ان کے بیٹے کی خوشیوں کو داغ دار کیا تھا۔

اس ساری صورت حال میں اگر کوئی شخص لطف اٹھا رہا تھا تو وہ ربیط خان تھا۔ زیاد خان کی جھکی ہوئی گردن۔ اسے اپنے انتقام کی آگ بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔

"لالئی بچے!" جبار خان بمشکل لب کھول سکے۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے بات کرنے کی ہمت کی۔

"کاکا جی۔ کاکا جی۔" وہ ان کے پاؤں میں گر گئی۔

"لالئی! کھل کے بتاؤ کہ یہ گناہ کس کا ہے۔" آرشین جان بے رحمی سے بولیں۔ فاطمہ بی بی اور زیاد خان کی اذیت ناقابل بیان تھی۔

"تائی اماں!" اس نے بے بسی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بولو لالئی بچے! کیا یہ ربیط کا بچہ ہے۔" جبار خان نے کہا تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

اتنا بے رحم تیر چلا تھا کہ سب ایک ہی بار میں گھائل ہو گئے تھے۔ جبار خان۔ آرشین جان۔ فاطمہ بی بی اور زیاد خان۔ کس کس کے زخم روح تک نہ اترے تھے۔

مگر ربیط خان کو لالئی نے اس وقت آسمان سے زمین پہ دے مارا۔ جب اس نے اپنے چالیس سالہ ملازم شیر خان کا نام لیا۔ شیر خان نوکری چھوڑ کر جا چکا تھا' کوئی نہیں جانتا تھا' وہ اب کہاں تھا۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ لالئی نے ایک ہی وار میں اس سے بدلہ لے لیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا یہ سب اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔

زیاد خان بھوکے شیر کی مانند اس پہ جھپٹا۔ وحشیانہ انداز میں اسے پیٹنے لگا۔ وہ چپ چاپ سہتی رہی۔ یہاں تک کہ نڈھال ہو کے فرش پہ گر گئی۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ زیاد خان کے ہاتھ روک سکتا۔ ربیط یکدم ہی کھڑا ہوا۔

"زیاد خان! تم اس کے حساب کتاب کو چھوڑو اب میں جانوں اور یہ۔ باقی خاندان کی عزت کی خاطر میری سب سے یہی درخواست ہے کہ اس بات کو یہی دفن کر دیں۔ میں اپنے باپ' دادا کی عزت پہ حرف نہیں آنے دوں گا۔ بابا جان آپ شادی کی ڈیٹ رکھ دیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ربیط خان نے فیصلہ سنا دیا تو جبار خان نے بہت غور سے ربیط خان کو دیکھا تھا۔

"ربیط۔ بچے! ہم تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں اتار پائیں گے۔" فاطمہ بی بی نے آگے بڑھ کے اپنا دوپٹا ربیط خان کے قدموں پہ رکھ دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں چچی جان۔" وہ حقیقتاً" شرمندہ ہو گیا اور فوراً" ان کی چادر ان کے سر پہ ڈالی۔

زیاد خان ہاتھ جوڑ کے اس کے سامنے آیا تو اس نے وہی موقع غنیمت جانا۔

"نہیں زیاد خان! ایسا مت کرو۔ میں جانتا ہوں یہ کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ اگر آسان ہوتا تو کیا میں اپنی بہن کے لیے تمہارے آگے ہاتھ نہ جوڑتا' میں نے کسی پہ احسان نہیں کیا۔"

☆ ☆ ☆

رخصتی کا دن آگیا۔ لالئی کا سادہ سا روپ بھی دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ ملالئی نے بہت چاہا کہ اس کا میک اپ کر دے۔ مگر وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔

"اماں! یہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟" ملالئی بار بار فاطمہ

بی بی سے پوچھتی۔
لالئی پتھر کا بت بنی رہی۔
"جرگہ آ گیا۔" شور اٹھا۔ "ارے لڑکیوں قرآن پاک اور چاول لے آؤ۔" لالئی کی دور پرے کی پھپھو نے ملالئی اور اس کی باقی کزنز کو آوازیں لگانی شروع کردیں۔
"لالئی دیکھو تو کون آیا ہے۔" شمیلا کی خوشی سے سرشار آواز پہ اس نے سر اٹھایا تو سامنے اماں کے ساتھ دلاور ماما جی اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شادی اور موت دونوں موقعوں پہ اپنے پرائے بن بلائے بھی آجاتے تھے۔ ہر ناراضی ان موقعوں پہ دفن کردی جاتی تھی۔
آج ان کی بیٹی رخصت ہورہی تھی۔ عمر خان نے خاموشی سادھ لی کہ وہ فاطمہ بی بی کے بھائی تھے۔
لالئی کے مردہ وجود میں جیسے جان آگئی تھی۔ بھاگ کے ان کے سینے سے جا لگی اور اتنا روئی کہ ارد گرد کھڑا ہر شخص رو پڑا۔
"اماں۔۔۔" رخصتی سے کچھ دیر قبل فاطمہ بی بی کسی کام سے اندر آئیں تو اس نے تڑپ کے پکارا۔
"مجھے ماں مت کہہ۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں تو اس کا دل کٹنے لگا۔
"لالئی! زیاد خان کو بلاؤ۔ لالئی کے دوپٹے کے کونے باندھ دے۔" لالئی کا دم گھٹنے لگا۔
زیاد خان نے پتا نہیں کس دل سے رسم ادا کی۔ وہ جب جانے لگا تو لالئی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ مڑ نہ سکا تو وہ اس کے سامنے آگئی اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ لب خاموش رہے۔ آنکھیں ساون کے بادلوں کی طرح برس رہی تھیں۔ زیاد خان نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا کہ آج اس کی اس حویلی سے ڈولی کے بجائے جنازہ نکلتا، جس نے ان کی عزت پامال کی تھی۔
"ڈولی آگئی' ڈولی آگئی۔" شور مچ گیا' لالئی کو لگا کہ وقت قضا آن پہنچا ہے۔ اس کے اوپر وزنی سا پوت (ریشم کی بنی روایتی شال) ڈال دی گئی اور کچھ رسمیں ادا کرکے ڈولی میں بٹھادیا۔
کاکاجی کی حویلی میں اسے تائی ماں کے کمرے میں فرش پہ بنی سیج پہ بٹھایا۔ وہ بے آواز روئے جارہی تھی۔
"لڑکیو! ابھی گھونگھٹ نہ اٹھانا۔ بدشگونی ہوجائے گی۔ مغرب کی نماز کے بعد رسم ہوگی۔" وہ پہچان نہ پائی کہ یہ کس کی آواز تھی۔
مغرب کی نماز کے بعد ساری رسمیں ادا کی گئیں۔ اس کی شہادت انگلی میں ست رنگی ریشمی دھاگا باندھا گیا جو سات سہاگنوں نے مل کے بنایا تھا۔
اس کے مردہ وجود کو بجائے قبر میں دفنانے کے ربیط خان کے کمرے میں پہنچادیا گیا مگر ساری رات گزر گئی۔ وہ پتھر بنی اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ کمرے میں نہ آیا۔ تائی اماں دنیاداری نبھانے اس کے کمرے میں آئیں مگر انہوں نے نفرت سے اسے دیکھا۔
"میرا بیٹا بھلا کون سا تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا کہ تمہاری انگلی سے یہ دھاگا کھولتا۔" وہ اس کی انگلی میں ریشمی دھاگا بدستور بندھے دیکھ کے بولیں۔ اس کا سر مزید جھک گیا۔
"یہ سب کیا ہورہا ہے لالئی! میں کیسے مان لوں کہ تم ایسا کرسکتی ہو۔"
شادی کی رات آرشین جان نے مرجانہ کو جو بتایا وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ مگر یہ قیامت اس حویلی پہ گزر چکی تھی اور لالئی سے نظریں ملانے کی ہمت کم از کم مرجانہ میں نہ تھی۔
آج بھی بڑی ہمت کرکے اس کے سامنے آئی تھی۔
"کیسے ہوسکتا ہے یہ سب لالئی۔۔۔ میں کیسے مان لوں۔۔۔ تم ایسی نہیں ہو۔" وہ بے یقینی سے بولی۔
"میں ایسی ہی ہوں مرجانہ۔۔۔ سب ٹھیک کہہ رہے ہیں' سب کا یقین کرو۔ تمہاری دوست ایک بدکردار اور بدصورت لڑکی ہے' سب سچ ہے' سب سچ ہے' میں نے سب کو برباد کردیا ہے' سب کو مار دیا ہے۔" وہ پتھریلے لہجے میں بولی تو مرجانہ روتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"اف خدایا۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ کس دوراہے پہ آن کھڑا ہوا ہوں۔۔۔ کیا کاکاجی اور ربیط کے احسانات سے منہ موڑنا آسان ہے۔ ہماری ذلت کو انہوں نے اپنی پاکیزہ چادر میں یوں سمیٹ لیا کہ خود بابا جان بھی لاعلم ہیں۔ میں ربیط خان کی اس اذیت کا اندازہ نہیں کرسکتا' جب اس نے میرے جڑے ہاتھوں کو تھام کے کہا تھا کہ ہاتھ جوڑنا آسان نہیں ہوتا' اگر آسان ہوتا تو وہ کب کا مرجانہ کے لیے جوڑ چکا ہوتا۔"
زیاد خان نے فلک کی سیاہ چادر پہ نظریں جمائے سوچا۔ "میری بہن کی رسوائی کو اس نے چھپایا ہے تو کیا مجھے مرجانہ کی بدصورتی کو جس کا سبب بھی میں ہی ہوں' قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اسی میں محبت کا حق ہے' اسی میں رشتوں کا احترام ہے مگر ساریہ۔۔۔ دل میں ہوک سی اٹھی۔ "میں بھول پاؤں گا کیا اسے؟" اس تصور ہی نے اس کی جان نکال دی۔
ساری رات ہی جاگتے گزر گئی۔ صبح نماز کے بعد خدا سے اپنے لیے استقامت کی دعا مانگی۔ ہمت کرکے ساریہ کا نمبر ملایا۔
"زیاد! اتنی صبح صبح۔۔۔ خیریت تو ہے۔" وہ بھی ابھی ابھی جائے نماز سے کرکے اٹھی تھی۔
"ساریہ! آج مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔" ہمت باندھی۔
"جان بھی حاضر ہے۔" وہ زندہ دلی سے بولی۔
"یہی چاہیے۔" وہ دکھ کی شدت سے مسکرا دیا۔
"کیا مطلب۔۔۔ خیریت تو ہے۔" اب کے ساریہ کے کان اس کے شکستہ لہجے پہ کھڑے ہوئے۔
"ساریہ! میں ہار گیا ہوں۔ میں اپنے سارے قول ہار گیا ہوں' میں اپنی محبت ہار گیا ہوں' مجھے معاف کردینا!"
"زیاد۔۔۔" ساریہ کی آواز گلے ہی میں رندھ گئی۔ حوصلے ٹوٹنے لگے۔ ذات بکھرنے کو تھی۔
"ساریہ! مجھے بے وفا مت کہنا۔۔۔ بس کبھی کبھی انسان حالات کے شکنجے میں بھی آجاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں۔" وہ رکا کہ شاید وہ کوئی سوال کرے' مگر اس کے لبوں پہ چپ کے قفل پڑے رہے۔ گویا آج اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ ہی سننا تھا۔
"ساریہ! تم اپنے جیسے کسی خوب صورت شخص کا ہاتھ تھام لینا' مجھے معاف کردینا۔" فیصلہ سنا دیا گیا اور زیاد خان نے جلدی سے لائن کاٹ ڈالی۔
وہ بے جان بت بنی موبائل کو دیکھے جارہی تھی۔ بھابھی اسے ناشتے کے لیے بلانے آئیں تو اسے دیکھ کے گھبرا گئیں۔ زور' زور سے سب کو آوازیں دینے لگیں۔
"کیا ہوا ہے ساریہ کو۔"
"ساریہ میری جان۔۔۔ اٹھو کیا ہوگیا ہے۔"

ہر کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اسے سب سنائی دے رہا تھا۔ وہ بولنا بھی چاہ رہی تھی۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ حرکت کر سکتی یا ان کو جواب ہی دیتی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھی۔ بی پی کافی ڈاؤن ہو چکا تھا۔

اسپتال فون کیا گیا تو اس کے کولیگز بھاگے چلے آئے۔ فوراً" اسپتال شفٹ کیا گیا۔ بی پی کے ساتھ ساتھ شوگر لیول بھی ڈاؤن ہو گیا تھا۔

ثوبانہ شاہ اور وہ دونوں بھی بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ سب ٹیسٹ کلیئر تھے۔

"سارہ بیٹا! کیا سوچ رہی ہو۔" شام تک اس کی طبیعت سنبھلی تو۔ ثوبانہ شاہ نے اس کے بال بناتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"خالہ جانی! میں بھی آپ کی طرح محبت کی جنگ ہار گئی ہوں۔" ثوبانہ شاہ اس کی بات پہ بری طرح گھبرائیں۔

"کیا مطلب... کیا ہوا ہے۔"

"خالہ جانی! زیاد نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔" ایک قیامت ثوبانہ شاہ پہ ٹوٹی تھی اور ایک دروازے پہ کھڑی لائبہ واحدی پہ۔

"صرف اتنا کہا ہے کہ کچھ رشتوں کو بچانے کے لیے اسے قربانی دینی پڑ رہی ہے۔"

ثوبانہ کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات پوچھوں عمر خان!" جبار خان نے سامنے بیٹھے عمر خان کو مخاطب کیا جو آج کافی دنوں بعد بھائی کی طرف آئے تھے۔ زیاد واپس اسپتال چلا گیا تھا۔

"جی خان لالہ پوچھیں۔" وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم زیاد خان کے رشتے سے انکاری کیوں ہو گئے ہو۔ ایسا کیا ہوا ہے وہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کبھی زیاد کو وہ دکھ نہیں دینا چاہو گے جو تم نے خود سہا ہے۔" ان کا سوال اس وقت عمر خان کے لیے غیر متوقع تھا۔ کمرے میں داخل ہوتی فاطمہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ وہ خان لالہ کو سلام کرنے کی نیت سے آئی تھیں۔

"لالہ! وہ ثوبانہ کی بھانجی ہے۔"

"وہ تمہاری شہر والی بیوی؟" وہ جھٹکے سے سیدھے ہوئے۔

"جی وہی... وہ ابھی بھی میرے نام پہ بیٹھی ہے۔ خان لالہ! انہوں نے زیاد اور سارہ کے رشتے کو مشروط کر دیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں فاطمہ کو اپنی زندگی سے نکال دوں۔ تب وہ سارہ اور زیاد کے رشتے کے لیے ہاں کریں گے اور ثوبانہ میری زندگی میں واپس آئے گی۔" عمر خان نے جبار خان کو بتا کے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"خان لالہ! فاطمہ میری ذات کا حصہ بن چکی ہے۔ میں ثوبانہ کی یہ بات نہیں مان سکتا۔"

"اف خان! کیا ہو تم... جس کی خاطر تمام عمر مجھے پیاسا رکھا، آج میری خاطر اسے جھٹلا رہے ہو۔ جدا کرنے پہ تیار ہو۔" فاطمہ بی بی کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

"لیکن عمر! تمہارے بچے، کیا ان کا کوئی حق نہیں ہے؟"

"خان لالہ! بات حالات کی ہے۔ اب فاطمہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ اس نے میری محبت میں عمر گزاری ہے۔ لیکن یوں محبت میں سرخرو ہونے میں انسانیت کا زوال ہے۔ کیا وہ میری خاطر فاطمہ کو قبول نہیں کر سکتی۔ کیا محبت کرنے والوں کے دل اتنے چھوٹے ہوتے ہیں؟" عمر خان اذیت سے چیخ اٹھے۔

"محبت کرنے والوں کے دل محبوب کے معاملے میں انتہائی تنگ ہوتے ہیں عمر!"

"نہیں خان لالہ! میں جو رو، رو کے ثوبانہ سے مانگ رہا ہوں، اگر فاطمہ کو اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو سب کچھ قربان کر دے گی۔" وہ یقین کی آخری حد پہ تھے۔ "مگر میں فاطمہ کو اب خود سے دور نہیں کر سکتا۔"

"اس کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ فاطمہ تمہارے لیے ثوبانہ سے زیادہ اہم ہو چکی ہے۔"

"خان لالہ یہ حقیقت ہے۔" وہ انکار نہ کر سکے۔

"ثوبانہ کو یہ شکوہ ہے کہ اسے میری محبت نہیں ملی۔ لیکن فاطمہ کو تو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ملا۔" وہ تلخی سے بولے۔

"اور زیاد۔"

"زیاد کو اپنی ماں کے لیے قربانی دینی پڑے گی۔ کیا وہ سارہ کی خاطر اپنی ماں کو اس عمر میں رسوا کر دے گا۔ کیا وہ چاہے گا کہ اس کی ماں اس عمر میں بدنامی کا ٹیکا ماتھے پہ سجا کے حویلی سے نکالی جائے؟" عمر خان نے کہا۔ ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اپنی بیٹی سے اس کی محبت چھین لی۔ ثوبانہ کو بھی خواب دکھائے مگر سب الٹ ہو گیا۔ سب چھن گیا۔ نہ سارہ کے چہرے پہ ہنسی رہی اور نہ ثوبانہ کی امیدیں باقی رہیں، میں کیا کروں... مگر ابھی میں نے ہار نہیں مانی عمر خان... ابھی تو صرف ایک ہی مہوپٹا ہے۔ ابھی کھیل ختم نہیں ہوا۔"

وہ اٹھیں اور ٹیلی فون... نمبر ملانے لگیں۔ انہوں نے عمر خان یا زیاد خان کے موبائل پہ ملانے کے بجائے لینڈ لائن پہ نمبر ملایا۔

"ہیلو... مجھے فاطمہ بی بی سے بات کرنی ہے۔"

"جی کون فرمائیں۔" فاطمہ بی بی کی ٹھہری ہوئی آواز ماؤتھ پیس میں گونجی۔

"میں سارہ کی ماما بات کر رہی ہوں۔"

"جی السلام علیکم، کیسی ہیں آپ۔" فاطمہ بی بی بمشکل اپنے جذبات پہ قابو کر کے بولیں۔

"فاطمہ! میں آپ لوگوں کے انکار کی وجہ جاننا چاہتی ہوں؟" انہوں نے بنا کسی تمہید کے بات شروع کی۔

"ارے ایسا تو کچھ نہیں ہے۔ ہم جلد اپنی امانت لینے آئیں گے۔" کہتے ہوئے فاطمہ بی بی کا دل خون کے آنسو رو پڑا۔

"لیکن زیاد نے تو فون کر کے انکار کر دیا ہے۔ میری بچی کی حالت خراب ہو گئی ہے۔" انہیں یقین نہ آیا۔

"وہ بچہ ہے، جلد گھبرا جاتا ہے، آپ بالکل فکر نہ کریں، ہم جلد ہی آئیں گے، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"مگر..."

"آپ کی ہر شرط مجھے منظور ہے۔" فاطمہ بی بی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ لائبہ واحدی سوچ میں پڑ گئیں۔ کیا وہ سب جان چکی ہیں اور زیاد خان بھی... اس کے باوجود وہ لوگ آنا چاہ رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے ثوبانہ کو اس کا حق مل رہا ہے۔

وہ اٹھیں اور سیدھی ثوبانہ کی طرف آ گئیں۔

"ثوبانہ! صبح فاطمہ بی بی کا فون آیا تھا۔"

ثوبانہ شاہ نے بے یقینی کی کیفیت میں ان کی جانب دیکھا۔

"وہ لوگ ایک دو دنوں میں آنا چاہ رہے ہیں۔"

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ میری نحوست کے سائے سارہ پہ بھی پڑ گئے ہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کے بولیں۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر آپی اب کے میرا نام درمیان سے نکال دیں۔" وہ تلخی سے بولیں۔

"لیکن ثوبانہ! میں تمہاری جنگ بھی جیت گئی ہوں۔ اسے ہر شرط منظور ہے۔ فاطمہ نے خود کہا ہے۔" لائبہ واحدی نے خوشی خوشی بتایا۔

"فاطمہ نے بتایا ہے۔ آپ نے یہ جنگ عمر خان سے لڑی تھی جو فاطمہ کے نام سے اور وجود سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ میں محبت میں اپنی شکست تسلیم کر چکی ہوں... فاطمہ... اب وہ صرف اپنے بیٹے کی محبت کی بازی جیتنا چاہ رہی ہے اور وہ جیتے گی۔ وہ تب بھی جیت گئی تھی جب اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اب تو اس کے بیٹے کے ساتھ ہماری اپنی بیٹی کی خوشیاں

بھی مشروط ہیں۔ اسے جیتنا آتا ہے آپی! وہ جیت چکی ہے۔"

"لیکن ثوبانہ! میں تمہاری خاطر ساریہ کی خوشیوں کی قربانی دے سکتی ہوں۔"

"مت بولیں ایسے، اولاد شطرنج کا مہرہ نہیں ہوتی آپی۔" وہ غصے سے بولیں۔

"ثوبانہ۔۔۔"

"آپی صرف دعا کریں کہ اللہ ہماری اولاد کو سکھ سے نوازے ہمارا وقت گزر چکا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ہیلو شمیلا۔۔۔ کیسی ہو۔" فیض کے دل کی کلی اسے دیکھ کے کھل اٹھی، وہ خاموش رہی۔

"کہاں غائب تھیں اتنے دنوں سے۔" وہ بنا کوئی تاثر دیے آگے بڑھ گئی۔ جب طے ہو گیا تھا کہ اسے نہیں دیکھنا تو پھر نہیں دیکھنا تھا۔ چاہے پل صراط سے ہی گزرنا پڑے۔

"شمیلا! کیا ہو گیا ہے تمہیں میں کتنے دنوں سے تمہارا ویٹ کر رہا تھا۔ میں نے اپنی ماما سے بات کر لی ہے، وہ تمہارے والدین سے ملنا چاہ رہی ہیں۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"آئی ایم سوری فیض! یہ ممکن نہیں۔ آئندہ کوشش کیجیے گا کہ میرے راستے میں نہیں آئیں۔" وہ بے رخی سے کہہ کے وہاں سے نکل گئی اور وہ دیکھتا رہ گیا۔

شمیلا کیسے اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ جب حویلی میں ایسے حالات نے جنم لیا کہ جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔ اماں اور بابا جان کے درمیان سرد جنگ پھر چھڑ گئی تھی۔ زیاد لالہ سے ان کا پیار چھن گیا تھا۔ لالئی کی زندگی کس طوفان سے آشنا ہو گئی تھی۔ یہ اب اسے اماں سے پتا چلا تھا۔ ایسے میں وہ کیسے توقع کرتی کہ وہ اپنی محبت پا لے گی۔ اس نے بہت سوچ کے اپنے قدم موڑے تھے۔

"شمیلا کوئی ناراضی ہے کیا۔" وہ پھر اس کے سامنے تھا۔

"ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ ہے بھلا؟" بدلحاظی سے بولی۔

"ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہیں کس بات پہ غصہ ہے، میں نہیں جانتا۔ میں پھر تم سے بات کروں گا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کے چند لمحوں کے لیے رکا اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

شبیر نے اس کے چہرے پہ چھائی سنجیدگی کو محسوس کیا، مگر کوئی سوال نہ کیا۔ وہ بجھے ہوئے ذہن کے ساتھ الیکشن کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اگر مخلص دوستوں کا حصار نہ ہوتا تو وہ کب کا ہار مان چکا ہوتا۔ فیض جب شبیر اور باقی گروپ کے ساتھ ووٹ مانگنے ان کے ڈیپارٹمنٹ آیا تو ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس کی مقبولیت کا گراف کافی اونچا تھا اور اونچی اڑان والے سب سے پہلے شکار ہوتے ہیں۔ مخالف گروپ نے شمیلا کے ساتھ اس کا سکینڈل بنا دیا۔

اس ساری صورت حال کا نتیجہ وہی ہوا کہ فیض مخالف گروپ والوں سے الجھ پڑا جنھوں نے اس پہ فقرے کسے تھے اور بات جھگڑے سے ہوتی ہوئی فائرنگ میں بدل گئی اور فیض شدید زخمی ہو گیا۔ یونیورسٹی کو پولیس نے گھیر لیا۔

دو اور طالب علم بھی زخمی تھے۔ مگر فیض کی حالت تشویش ناک تھی۔ آدھے سے زیادہ اسٹوڈنٹ اسپتال پہنچ چکے تھے۔

شمیلا دیوانوں کی طرح روتی اسپتال پہنچی۔ شبیر پتھر بنا دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔

"شبیر۔۔۔" لائبہ واحدی جو اسپتال میں ساریہ کے ساتھ تھیں۔ آپریشن تھیٹر کے سامنے شبیر کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"خالہ جانی۔۔۔ فیض کو گولیاں لگ گئی ہیں۔" وہ ان کے ساتھ لگ کے رو دیا۔

"ہائے میرا بچہ۔" انہوں نے سینہ پیٹ ڈالا۔ "میرا لاڈلا فیض۔۔۔ ہائے میری بہن جیتے جی مر جائے گی۔ اے مالک تو رحم کرنا۔" شبیر کے موبائل پہ بار بار ثوبانہ شاہ کی کالز آ رہی تھیں۔ انہیں ٹی وی سے یونیورسٹی میں ہنگامے کی خبر ملی تھی۔

اتنے میں وقار واحدی اور عبید بھی آ گئے اور وہی جا کے ثوبانہ کو بھی لائے۔

اسے کتنی ہی خون کی بوتلیں لگ چکی تھیں۔ ڈاکٹرز کچھ بھی نہیں بتا رہے تھے۔ اذیت و تکلیف کے لمحات طویل ہوئے جا رہے تھے۔ ساریہ سے بھی صبر نہ ہوا تو وہ آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔ وہ خوب صورت اسمارٹ سا فیض اب بے بس سا آکسیجن کے سہارے پڑا تھا۔ جو اپنے کپڑوں پہ اڑتی دھول نہیں پڑنے دیتا تھا، آج خون سے رنگے ہوئے کپڑے اس کے بدن پہ تھے۔ خون اس کے جسم سے بہے جا رہا تھا۔ وہ برداشت نہ کر پائی اور باہر نکل آئی۔

"ساریہ۔۔۔" شبیر بھاگ کے اس کی طرف آیا۔

"اللہ سے دعا کرو شبیر! وہ سب کی سنتا ہے۔" وہ کیا کہتی۔

"آپ نے اسے دیکھا ہے نا۔ وہ کچھ بول رہا ہے کیا۔" شمیلا یقیناً "دیوانی" ہو چکی تھی۔ اگر ذرا سا بھی ہوش مند ہوتی تو یہ سوال نہ پوچھتی کہ اس کا تعلق جہاں سے تھا، وہاں تو ان باتوں پہ قتل جائز تھا۔

ثوبانہ شاہ اٹھیں اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کے اسے دیکھنے لگیں۔ انہیں اس کے چہرے پہ اپنے فیض کی محبت نظر آ رہی تھی۔ وہ ان سے لپٹ کے رونے لگی۔

"تم میرے فیض کی دلہن ہو نا۔۔۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے ہم سب کی محبت واپس لے آئے گی۔"

"ان شاء اللہ۔۔۔" شمیلا نے بے ساختہ کہا اور اللہ نے ان کی سن بھی لی۔ ڈاکٹرز نے خیریت کی خبر دے دی۔

☼ ☼ ☼

"کیا لالہ تمہارے کمرے میں نہیں آتے۔" مرجانہ نے اس کا ہاتھ تھام کے پوچھا تو اس نے سر جھکا لیا۔ "لالئی میری بات کا جواب تو دو۔"

"نہیں۔۔۔" مختصر جواب آیا۔

"کیا بہت ناراضی ہے تم دونوں میں۔ تم ہی انہیں منا لو، جھک جاؤ، اس میں کوئی بے عزتی نہیں ہے۔" وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"میرا بچہ۔۔۔ کیا ملا ہے اسے شادی کر کے تجھ سے سوائے اس ذلت کے۔ کیا خوشی ملی ہے اسے تجھ سے۔" تائی اماں کمرے میں آئی تھیں۔ وہ سر جھکائے انگلیاں مروڑتی رہی۔ دل میں تو طوفان اٹھ رہے تھے۔

"لالئی! ایک بات یاد رکھنا۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں ہر رشتہ بھول جاؤں گی۔" وہ خونخوار لہجے میں بولیں، تو وہ ڈر گئی۔ "اس کا خیال رکھو، بیوی ہو اس کی۔" وہ تو حکم صادر کر کے چلی گئیں۔

وہ دریدہ دامن کے ساتھ اٹھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے کمرے کا دروازہ بجا کے اندر آ گئی۔ ربیط نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

شادی کے بعد یہ پہلی بار دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔

"ربیط! یہ کھول دیں۔" وہ اپنا نازک خوب صورت ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ جس پہ ریشم کا دھاگا بدستور موجود تھا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔

"ربیط! مجھے بالکل اسی طرح قبول کر لیں جیسے اس ناجائز بچے کو تسلیم کر لیا ہے۔"

"جاؤ اپنے کمرے میں۔۔۔" وہ چلا اٹھا۔

"اب نہیں جاؤں گی۔" اس کا ہاتھ اب بھی اس کے سامنے تھا۔ "میں جانتی ہوں کہ بدکردار عورت کا شوہر اس کی انگلی کو ساری عمر اس زنجیر سے آزاد نہیں کرتا مگر آپ تو جانتے ہیں میں بدکردار نہیں ہوں۔" وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "آپ جانتے ہیں یہ آپ کا بچہ ہے۔ آج آپ جو کر رہے ہیں، وہ کل آپ کے لیے گلے کا پھندہ بن جائے گا ربیط! بیٹا ہوا تو گمنامی کے جنگل میں کہیں کھو جائے گا اور اگر خدا نے بیٹی دی

تو اس کے لیے یہ لفظ ناجائز۔۔۔ گالی بن جائے گا' سہ پائیں گے آپ؟" وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

کتنے ہی دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ اس نے سچ ہی کہا تھا کہ اب وہ اپنے ہی جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔

دوسری طرف تائی اماں اب اسے خود ربیط کی طرف بڑھنے کے لیے مجبور کر رہی تھیں کہ وہ جانتی تھیں کہ لالئی ان کے بیٹے کی اولین خواہش تھی اور اپنے بیٹے کو اس طرح ادھورا دیکھنا انہیں منظور نہ تھا۔

"لالئی! ربیط کو چائے دے آؤ۔ وہ اس وقت چائے پیتا ہے۔"

"جی۔۔۔" وہ اٹھی اور چائے بنا کے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ "چائے لے لیں۔"

اس نے ایک لمحہ کے لیے نظریں اٹھائیں۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ سرخ و سفید چہرے پہ زردی چھا گئی تھی۔ اس کے ہلکے گولڈن ریشمی بال دوپٹے سے صاف نظر آرہے تھے۔ ربیط ہمیشہ اس کے بالوں کی لمبی بل کھاتی چوٹی شرارت سے کلائی پہ لپیٹ لیتا اور اس کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کرتا۔

"کون کافر اس زنجیر سے آزاد ہونا چاہے گا۔" آج سب کچھ دھندلا گیا تھا۔

"یہ چائے پی لیں۔" اس کے جواب نہ دینے پر وہ چائے کا کپ بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے بولی تو وہ غصے سے اسے ہلکا سا دھکا دے کر باہر جانے لگا۔ وہ لڑکھڑا کے ٹیبل سے جا ٹکرائی۔

میز کا کونا بری طرح اس کے پیٹ میں لگا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔

وہ گھبرا کے اس کی طرف مڑا۔ وہ پیٹ پہ ہاتھ رکھے بری طرح تڑپ رہی تھی۔

"لالئی۔۔۔ لالئی۔۔۔" اس کی بے قراری بے پناہ تھی۔ تائی اماں اور مرجانہ اس کی چیخوں پہ دوڑی چلی آئیں اور اس کی حالت دیکھ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"کیا ہوا ہے اسے ربیط۔" انہوں نے گھبرا کے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"اماں دھکا لگ گیا تھا۔" وہ سر جھکا کے بولا تو مرجانہ نے شکوہ بھری نگاہوں سے بھائی کو دیکھا۔

"اسے اسپتال پہنچاؤ' مجھے لگتا ہے خدا ہمیں اس عذاب سے نکالنے والا ہے۔" ربیط کے دل پہ ہاتھ پڑا۔

"اے اللہ! میرے بچے کو اپنی امان میں رکھنا۔" ربیط نے دعا کی۔

اسپتال میں جب ڈاکٹر نے خیریت کی اطلاع دی تو اس کی جان میں جان آئی۔

"شکر ہے اللہ کا ماں اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ لیکن بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کی مسز کا ایچ بی بہت کم ہے۔ میں نے وٹامن اور کچھ اور میڈیسن لکھ دی ہیں۔ پیشنٹ کو مکمل بیڈ ریسٹ پہ رکھیں اور دو ہفتوں بعد دوبارہ چیک اپ کے لیے لے آئیے گا۔" انتہائی پروفیشنل انداز میں بات کر کے ڈاکٹر پلٹ گئی۔

"کاش! ہم اس اذیت سے آزاد ہو جاتے۔" آر شین جان نے افسردگی سے کہا تو فاطمہ بی بی جو کچھ دیر پہلے ہی مرجانہ کی اطلاع پہ آئی تھیں' شرمندہ ہو گئیں۔

"ربیط میری بات سن۔" حویلی واپس آئیں تو آر شین جان نے ربیط کو پکارا۔

"جی اماں۔"

"میرا بچے! میں تیری اذیتوں کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ مگر اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ تو خود کو اب زندگی کی طرف موڑ۔ میں جانتی ہوں کہ تو اب بھی لالئی سے اتنی ہی محبت کرتا ہے' جتنی پہلے تجھے اس سے تھی۔ رہی بات اس ذلت کی تو اس سے چھٹکارا تجھے تیری ماں دلائے گی۔" انہوں نے کہا تو ربیط نے ماتھے پہ آئے پسینے کو صاف کر کے ان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بس یہ تو اپنی ماں پہ چھوڑ دے۔" ربیط کا پورا وجود سلگ اٹھا کہ یہ آگ اس کی اپنی لگائی ہوئی تھی' جس کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔

"اماں۔۔۔" لالئی نے سچ کہا تھا کہ وہ اپنے ہی جال میں پھنستا جا رہا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ زیاد کو انتقام کی رسی سے باندھ کے اپنی بہن مرجانہ تک لے آئے گا

مگر بابا جان نے اس رسی کی گرہیں ہی کھول دی تھیں۔ یہ کہہ کے کہ زیاد چاہے بھی تو یہ رشتہ نہیں بندھ سکتا' وہ زیاد کو ساریہ کے ساتھ ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کے سارے زمانے کو بتائے کہ یہ اس کا اپنا جائز بچہ ہے۔ ربیط خان کا بچہ مگر ساری چیخیں اندر ہی گھٹ کے رہ گئیں۔

وہ رات دیر سے کمرے میں آیا۔ وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں پہ پلکوں کی جھالر پر آنسو موتیوں کی صورت چمک رہے تھے۔ دودھ کا گلاس اسی طرح بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر کی باتیں یاد آئیں تو وہ بنا کچھ سوچے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ گھبرا کے اٹھی۔

وہ اس کے سامنے بیڈ پہ بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیے کتنی دیر خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا اور دھیرے دھیرے اس کی انگلی سے ست رنگی ریشمی دھاگا کھولنے لگا۔ لالئی بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

"لالئی! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" وہ خاموش رہی۔ "میں مرجانہ کے آنسوؤں کی اذیت دیکھ نہیں پایا تھا۔" وہ بول رہا تھا اور اس کی زبان بند تھی' پتھر بنی رہی۔

"تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔" وہ تڑپ کر بولا۔

"مجھے تو ایک ہی ربیط خان یاد ہے۔ جس نے کاکا جی' تائی جی' زیاد لالہ اور میری ماں کے سامنے مجھ سے میرے ناکردہ گناہ کو تسلیم کروایا تھا۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"لالئی۔۔۔ میں تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ تم سب بھول جاؤ گی۔ میں نے زخم دیا ہے تو مرہم بھی میں ہی رکھوں گا۔ لیکن مجھے معاف کر دو' یہ دیکھو میرے ہاتھ جڑے ہیں' مجھے معاف کر دو۔" وہ اس کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا کے رو دیا۔

"دعا اس وقت اثر کرتی ہے جب انسان زندہ ہوتا ہے' مردوں کو تو دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"لالئی! میں انتقام میں اندھا ہو گیا تھا' مگر وہ گناہ نہیں تھا' تم میری بیوی تھیں۔"

"اچھا۔۔۔ تو پھر اب میں کس بات کی معافی دوں آپ کو؟"

"لالئی۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"معاف کر دوں گی اگر۔۔۔" وہ رکی۔

"اگر۔۔۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اگر مجھے طلاق دے دو تو۔۔۔ معاف کر دوں گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

☼ ☼ ☼
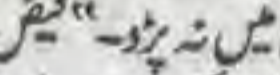
"اسی دن کو روتی تھی میں' کتنا سمجھایا تھا کہ اس طرح کے کاموں میں نہ پڑو۔" فیض ہوش میں آیا تو ثوبانہ اس کا ہاتھ تھام کے بے حوصلہ ہو گئیں۔

"ما۔۔۔ ما۔" وہ نقاہت سے صرف اتنا ہی بول پایا۔

"مار کے رکھ دیا ہے تم نے ماما کو۔" وہ دکھی آواز میں بولیں تو شبیر نے ماں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"ماما! اللہ کا شکر ہے' یہ بالکل ٹھیک ہے۔" وہ فیض کی نیم بے ہوشی کی کیفیت کو دیکھ کے آہستگی سے بولا۔

"آپ سب شکوے بعد میں کر لیجیے گا' ابھی اسے سکون میں رکھنا ہے۔"

اس کے بعد جتنے دن وہ اسپتال میں رہا شبیر نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہ جھپکی۔

ساریہ بھی کافی بہتر ہو گئی تھی' اس لیے اسپتال آنا شروع کر دیا تھا۔ دن میں کئی دفعہ اس کی طرف چکر لگاتی۔

"شبیر! ایک بات پوچھوں۔" فیض نے کچھ سوچتے ہوئے شبیر کو متوجہ کیا' جو اس کے لیے سوپ نکال رہا تھا۔

"ہوں بولو۔۔۔" وہ اس کی جانب مڑا۔

"کیا شمیلا مجھے دیکھنے آئی تھی؟"

"ارے ایسا ویسا' وہ تو دیوانہ وار بھاگتی آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کے ماما نے اندازہ لگا لیا کہ وہی ان کے

فیض کی پسند اور ہونے والی دلہن ہے۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن اب وہ کیوں نہیں آرہی۔ دیکھو سب دو دو، تین تین دفعہ آرہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ظاہر ہے یونیورسٹی بند ہے تو وہ بھی اپنے گھر گئی ہوئی ہوگی۔"

"لالہ! مجھے نہیں کروانی سرجری۔" ایک لڑکی اپنے بھائی کا بازو تھام کے رو رہی تھی۔ شبیر کسی کام سے فیض کے کمرے سے نکلا تو اس نے کاریڈور میں دیکھا۔

"پاگل ہوگئی ہو کیوں نہیں کروانی سرجری۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گی۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ ہم سب تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں۔ اماں، بابا جان اور وہ تمہاری بھابھی، اس دن بھی تمہیں سمجھا رہی تھی۔"

"چلو اٹھو، اب کوئی فضول بات نہیں ہوگی۔" وہ دونوں اٹھے تو شبیر نے دیکھا کہ اس کے چہرے پہ بدنما سے دو نشانات تھے۔ شاید ان ہی کے لیے اس کا بھائی پلاسٹک سرجری کا کہہ رہا تھا۔

"عجیب لڑکی ہے۔ شکر نہیں کررہی کہ علاج ہورہا ہے۔ ورنہ ایسی بدصورت سے کون شادی کرے گا۔" شبیر خود سے بولا اور سر جھٹک کے باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تم کہاں تھے شبیر۔" وہ کمرے میں آیا تو فیض نے پوچھا۔

"میں خدا کی خدائی دیکھ رہا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"خدا کی کوئی حسین مخلوق تو نہیں دیکھ لی، دل تو نہیں آگیا کسی پہ۔" اس نے چھیڑا۔

"ارے نہیں یار۔ ایک ہی لڑکی دیکھی جس کی صورت کو گرہن لگا ہوا تھا۔ اس پہ ترس تو کھایا جاسکتا تھا۔ دل جیسی قیمتی چیز نہیں لٹائی جاسکتی۔" وہ چند لمحوں کے لیے خدا کی ذات کو جیسے بھول گیا تھا۔

"توبہ کرو شبیر! کیا فضول بول رہے ہو۔" فیض نے ڈانٹا تو اس نے جھٹ کانوں کو پکڑلیا۔

☆ ☆ ☆

"زیاد! تم اسپتال کیوں نہیں جارہے؟" فاطمہ بی بی اس کے کمرے میں آئیں تو اسے گہری سوچ میں گم دیکھتے ہوئے محبت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اماں! آپ تو جانتی ہیں کہ یہ پیشہ کتنا نازک ہے اس میں ذرا سی کوتاہی سے کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔ میں نے کچھ دنوں کے لیے چھٹی لے لی ہے جب سیٹ ہوجاؤں گا تو کرلوں گا۔" اس نے کچھ بھی دل میں رکھے بنا کہا۔

"میرے بچے اللہ بہتر کرے گا۔ وہ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا کے اسے تیرے مقدر میں لکھ دے گا۔"

"چھوڑیں اماں! آپ بھی شاید دل سے دعا نہیں کرتیں، ورنہ ماں کی دعا بھلا عرش سے ناکام لوٹتی ہے۔" زیاد نے کچھ اتنی حسرت سے کہا کہ فاطمہ بی بی تڑپ کے رہ گئیں۔

"صرف دو، تین دن مجھے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم مایوس نہیں ہوگے۔ میں خان کو منالوں گی۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ساریہ کو انکار کردیا ہے۔" اس نے سر جھکا کے بتایا۔

"جس کے صدمے کی وجہ سے وہ دو دن اسپتال میں رہی۔" فاطمہ بی بی نے کہا تو وہ چونکا۔

"بیٹا! جب بندہ کسی کا ہاتھ تھامے تو اسے بیچ بھنور میں نہیں چھوڑتا۔ محبت تو دعا ہے۔ اسے بے توقیر کرنا انسان کو زیب نہیں دیتا۔"

"اماں کیا کاکا جی ہمیشہ صرف قربانیاں دیتے ہی رہیں گے۔ کیا ہمارا کوئی فرض نہیں۔ اگر ربط خان نے ہماری ذلت کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہے تو میں مرجانہ کے تاریک مستقبل کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے قربانی نہیں دے سکتا؟" اس نے اپنے دل پہ قیامت کا جبر کیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا! مگر میری خواہش ہے کہ میرے بیٹے کی محبت اسے ملے۔"

فاطمہ بی بی کے نہ چاہنے کے باوجود زیاد خان نے اپنی خواہش کا اظہار عمر خان کے سامنے کردیا۔ وہ کتنی دیر حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔ وہ جو کچھ دن پہلے تک ساریہ کے بغیر مرجانے کی باتیں کرتا تھا، آج اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوگیا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا مگر جبار خان، عمر خان کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے اور انکار کردیا۔

"خان لالہ! یہ بات خود زیاد نے کی ہے، میں نے اسے نہیں کہا۔"

"اسے میری طرف بھیجنا، میں خود بات کروں گا۔"

عمر خان نے فوراً نمبر ملایا اور اسے وہاں بلالیا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے سامنے تھا۔ عمر خان لالئی سے باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گئے کہ خان لالہ کھل کے بات کرلیں۔

"کاکا جی! یقین کریں میں نے کسی دباؤ میں فیصلہ نہیں کیا۔"

"کوئی ایک مضبوط دلیل دے دو اس فیصلے کی، میں یقین کرلوں گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں مرجانہ کو دکھی کرکے آپ سے شرمندہ ہوا ہوں۔ آپ تمام عمر ہمارے لیے ایک سایہ کی مانند رہے ہیں اور ربط نے ہماری ذلت کو۔۔۔"

"اس بات کو تم چھوڑ دو۔۔۔ رہی بات میری محبت کی تو بیٹا! محبتیں بدلے نہیں مانگا کرتیں۔ مرجانہ اگر میری بیٹی ہے تو تم میرے بیٹے ہو۔ میں خود جاؤں گا اس بار عمر خان کے ساتھ ساریہ کے گھر والوں سے ملنے اور خبردار! دل میں کوئی فضول بات لائے تو۔" وہ محبت سے اسے ساتھ لگاتے ہوئے بولے تو وہ کچھ نہ بول سکا۔

"اور اگر احسان ہی اتارنا چاہتے ہو تو شاید کبھی ایسا وقت بھی آئے جب میرے ہاتھ تمہارے سامنے پھیلے ہوں۔"

"اللہ ایسا وقت کبھی نہ لائے۔"

فاطمہ بی بی نے جبار خان کا فیصلہ سنا تو سکون کی ایک لہر نے پورے وجود کا احاطہ کرلیا۔

"عمر خان اب میں اپنے بیٹے کی خوشیوں کی جنگ خود لڑوں گی۔"

"فاطمہ! میں نے کہا نا کہ اب ساریہ کا ذکر اس گھر میں نہیں ہوگا۔" عمر خان نے یہ جاننے کے بعد کہ فاطمہ ساریہ کے گھر جانا چاہ رہی ہیں، ان کی طرف چلے آئے۔

"خان! مجھے اس حکم عدولی کے لیے معاف کردیجئے گا۔ مگر میں اپنے بچے کے چہرے پہ خوشی دیکھنا چاہ رہی ہوں۔"

"میں کیسے سمجھاؤں تمہیں فاطمہ۔" وہ سر پکڑ کے گرنے کے انداز میں صوفے پہ بیٹھ گئے۔

☆ ☆ ☆

"تم نے کمزور نہیں ہونا ثوبانہ۔۔۔ تمہیں فاطمہ سے مقابلہ کرنا ہے۔ وہ عورت قابل رحم نہیں ہے۔ اس نے تم سے تمہاری محبت چھینی تھی، آج تم اس سے اپنی وہ جگہ چھین لو جس پہ وہ شان سے قبضہ کیے بیٹھی ہے۔"

"مگر آپی۔۔۔" وہ شاید پیچھے ہٹنا چاہ رہی تھیں۔

"ثوبانہ۔۔۔ ساریہ، زیاد کو صرف ایک صورت میں پاسکتی ہے، جب تمہیں تمہاری حیثیت ملے گی۔"

"لیکن آپی۔۔۔" وہ الجھنے لگیں۔ دوسری طرف ساریہ بے یقینی سے موبائل کو دیکھ رہی تھی، جس پہ کچھ دیر پہلے زیاد خان نے ایک دفعہ پھر اسے امید کی راہ دکھائی تھی۔

"ماما! کل زیاد اور اس کی اماں آرہی ہیں۔" ساریہ نے ماں کو بتایا تو وہ دل ہی دل میں عمر خان کی بزدلی پر مسکرادیں۔

ساریہ کے جانے کے بعد لائبہ واحدی نے ثوبانہ کو فون ملایا۔

"ثوبانہ کل زیاد اور اس کی اماں آرہی ہیں۔" جواباً ثوبانہ رو پڑیں تو لائبہ واحدی کے دل پہ چھریاں چلنے لگیں۔

☆ ☆ ☆
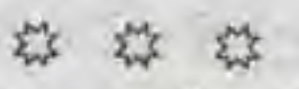
وہ رات بھی عجیب تھی۔ زیاد خان کی آنکھ ایک لمحے کے لیے نہ لگی۔ جو دکھ رہا تھا سب ویسا نہیں تھا۔ اسے

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے بابا کو رسیوں سے باندھ رہا ہے۔

بابا کا ساریہ کے گھر خوشی خوشی جانا بنا کسی اعتراض کے اسے تسلیم کرلینا اور پھر بنا کسی وجہ کے اس کے رشتے سے پیچھے ہٹ جانا۔ آخر بابا کے اندر کیا جنگ چل رہی ہے۔ اماں کے جانے کا ارادہ جان کے بابا نے مجھے یہ کیوں کہا کہ اپنی ماں کا ہاتھ بہت مضبوطی سے تھامنا۔ تمہاری ماں کو سہارے کی ضرورت پڑے گی۔

دوسری طرف عمر خان تھے۔ وہ اب تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ فاطمہ کو ان کی زندگی سے نوچ کے الگ کردیا جائے، جسے انہوں نے لڑ کے حاصل کیا تھا۔ زمانے والوں سے نہیں، بلکہ خود اپنے آپ سے۔ ثوبانہ پتا نہیں کیوں اتنی ظالم ہو رہی تھی۔

نیند تو فاطمہ بی بی کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ بہت آسان تھا کشتی کو دریا میں اتارنا، مگر بہت مشکل تھا اسے پار لگانا۔

"کیا زندہ انسان کی روح بھی جسم سے الگ ہوئی ہے۔ تو پھر ہم کیسے ہوسکتے ہیں۔ میں یہ قربانی آپ کو ناراض کرکے نہیں خان! بلکہ آپ کو منا کے دوں گی۔" آخری پہر وہ اس نتیجے پہ پہنچیں۔

"زیاد! ہمیں صبح جلدی نکلنا ہے۔ اس لیے تم جا کے شام کو ہی لالئی سے مل آؤ اور خان لالہ کو بھی بتا دینا۔ ویسے تو میں نے دن کو ان سے بات کرلی تھی۔" فاطمہ بی بی نے کہا تو وہ خاموش ہوگیا۔

"کوئی پریشانی ہے زیاد خان۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

"اماں! کیا بابا جان کی رضا کے بغیر جانا مناسب ہے۔ میں کیسے اپنے بابا کو صرف اپنی خوشی کے لیے ناراض کرسکتا ہوں۔" اس کی سوچ اسی مقام پہ آکے رکتی تھی۔

"تم صرف مجھ پہ بھروسا رکھو۔ میں تمہارے بابا جان کو روٹھنے نہیں دوں گی۔ چلو اٹھو اور بہن کو مل کے آؤ۔" اسے بھیج کے فاطمہ بی بی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں اور وہ جبار خان کی حویلی آگیا۔ لالئی اور مرجانہ جامن کے اونچے درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم لالہ۔" زیادہ خان کو دیکھ کے لالئی تیزی سے اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ حالانکہ زیاد خان کے اندر وہ محبت اور لگاؤ نہیں تھا جو اس کا خاصہ تھا۔

مرجانہ نے بھی دھیرے سے سلام کیا اور اندر چلی گئی۔ زیاد اداسی سے اس ٹوٹی پھوٹی لڑکی کو دیکھ کے رہ گیا۔

"لالہ مجھے معاف کردیں۔" بھائی کے مہربان سینے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"لالئی! اماں کل ساریہ کے گھر جا رہی ہیں، تم دعا کرنا۔" زیاد نے کہا تو وہ مسکرا اٹھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے، بابا جان مان گئے کیا۔" اس لمحہ وہ وہی زیاد خان کی لاڈلی لالئی اور وہ محبت لٹانے والا بھائی بن گیا۔

"اماں کہہ رہی ہیں کہ وہ مان جائیں گے۔" وہ جانے کے لیے اٹھا تو وہ اس کے سامنے آگئی۔

"لالہ! کچھ چائے یا ٹھنڈا تو لیں۔"

"لالئی! کیا واقعی تم سے وہ گناہ ہوا ہے۔" زیاد خان نے اچانک پوچھا۔ اسے اکثر لگتا تھا کہ جیسے لالئی بے گناہ ہے۔ اس کے چہرے پہ چھایا سکون اور نور اسے دن بدن پہلے سے زیادہ خوب صورت بنا رہا تھا۔

"اب اس سوال کا وقت گزر گیا لالہ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"یہ چائے۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنی الجھنوں کا سراغ پاتا مرجانہ کی آواز انہیں واپس کھینچ لائی۔ ٹرے میں پڑا اور چائے تھی۔

"ارے تم نے اتنا تکلف کر ڈالا۔" وہ مسکرایا۔ جواباً وہ صرف مسکرائی۔

"لالہ! مرجانہ نے زندگی سے تعلق بالکل ختم کرلیا ہے۔ نہ پڑھائی کا نام لیتی ہے، نہ کچھ بولتی ہے اور اب تو چہرے کے علاج سے بھی انکار کردیا ہے۔ پلیز آپ اسے سمجھائیں۔ آپ کی بات وہ نہیں ٹالے گی۔"

"مرجانہ! کیوں کر رہی ہو ایسا۔"

"دعا کر رہی ہوں۔" اس کی ہرنی جیسی آنکھیں انھیں تو زیاد کو نظریں چرانی پڑیں۔

"تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتی ہو؟" زیاد نے کہا تو وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"مرجانہ! میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے تکلیف پہنچی ہے۔ جو میری خواہش نہیں تھی۔ لیکن میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ تم میرے لیے لالئی اور ملالئی کی طرح ہو۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"ادھر دیکھو، میری طرف، میری گڑیا ہو تم، خبردار میں نہ دیکھوں کہ آئندہ تم یوں خود کو ٹارچر کر رہی ہو۔ میں شہر جاتے ہی ڈاکٹر سے ٹائم لیتا ہوں اور تمہیں ربط کے ساتھ آنا پڑے گا۔ انکار کیا تو ناراض ہو جاؤں گا۔" وہ خاموش ہوگئی۔

"اور اب اسٹڈیز بھی دوبارہ شروع کردو۔" وہ مسکرا دی کہ اس حقیقت کو تسلیم کرلینے میں ہی بہتری تھی۔ چاہے جتنا بھی وقت لگ جاتا۔

زیاد کو مرجانہ سے بات کرکے سکون ملا تھا۔ حویلی میں داخل ہوا تو بابا جان لاؤنج ہی میں بیٹھے تھے۔ وہ ان کی طرف چلا آیا۔

"بابا! بہت ناراض ہیں کیا۔" وہ ان کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا اور ان کی گود میں سر رکھ لیا۔

"نہیں تم سے کیا ناراضی۔ البتہ خود سے بہت شکوے ہیں۔" ان کے لہجے میں عجیب سی شکستگی اور حسرت تھی۔

"آخر کیوں بابا! کیا ہے جو آپ کو پریشان کر رہا ہے۔ میں آپ کا بیٹا، کیا آپ کے دکھ کو بانٹ نہیں سکتا۔ کیا اس قابل نہیں کہ آپ کے دکھ درد میں شریک ہو سکوں۔" زیادہ نے ان کے ہاتھ چومتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیے۔

فاطمہ نے انتہائی دکھ سے ان دونوں باپ، بیٹے کو دیکھا۔

"بابا! آپ مجھے میری بات کا جواب دیں کہ آپ نے یکدم فیصلہ کیوں بدل دیا۔" زیاد نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے اس لمحے فیصلہ کرلیا کہ وہ زیاد کو ساری بات سچ سچ بتا دیں گے۔ وہ ان کا بیٹا تھا، ان کی تکلیفوں کو نہیں سمجھے گا تو پھر کون انہیں سہارا دے گا۔

"زیاد! در اصل بات یہ ہے کہ میں۔"

فاطمہ اسی لمحے اندر آگئیں۔ جس کی وجہ سے عمر خان کو بات روکنی پڑی۔ جو فاطمہ بی بی چاہتی تھیں۔ عمر خان اٹھ کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

ہر دن ربط کی ذہنی اذیت پہلے سے بڑھتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا وہ شدید ذہنی دباؤ میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی اس حالت کا اندازہ لالئی بخوبی کرسکتی تھی کہ سامنے بیٹھا شخص آخر اس کا محبوب تھا۔

"یہ دودھ پی لو لالئی۔" ربط نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا، جسے تھامنے سے اس نے انکار کردیا۔

"یہ میرا بچہ ہے۔ باپ ہوں میں اس کا۔ خیال رکھو میرے بچے کا۔" وہ دہاڑا۔

"سب کی نظر میں یہ میرا گناہ ہے اور اس کا باپ شیر خان۔" ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ وہ دیوانوں کی مانند اس پہ ٹوٹ پڑا۔

"میں اپنے گناہ کا کفارہ خود کو ختم کرکے ادا کروں گا۔" اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکلتی وہ اپنا پستول نکال چکا تھا۔

"نہیں نہیں ربط! خدا کے لیے نہیں۔" وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخوں کی آواز پہ سب بھاگے چلے آئے۔

جبار خان کو اندر کے منظر نے دہلا دیا۔ آرشین جان تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرا ایک ہی تو بچہ ہے۔ اس کی زندگی بھائی کی محبت میں داؤ پہ لگا دی ہے آپ نے۔" آرشین جان نے روتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔

"اماں! خاموش ہو جائیں آپ ـــــ مت میرا دماغ خراب کریں۔" وہ غصے سے کہہ کے نکل گیا اور وہ اسے بری طرح پیٹنے لگیں۔ جبار خان سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"کاکا جی ـــــ مجھے واپس بھیج دیں ـــــ" وہ اٹھی اور جبار خان کے سامنے ہاتھ جوڑتے درخواست کی۔

"لالئی بچے ـــــ ایک بات خدا کو حاضر ناظر جان کے بتاؤ کہ ـــــ"

"کاکا جی! خدا کے لیے اب یہ سوال مت پوچھئے گا۔ اس حساب کتاب کو روز حساب پہ چھوڑ دیں۔" وہ منہ پھیرتے ہوئے بولی۔

مرجانہ نے بہت کوشش کی مگر اب وہ رکنے کو تیار نہ تھی۔

اس نے شکر ادا کیا کہ حویلی میں اس کا سامنا کسی سے نہ ہوا۔ عمر خان کو طبیعت کی خرابی کا کہہ کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ملائی کی یونیورسٹی کھل چکی تھی وہ بھی واپس چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ بی بی تو سمجھ رہی تھیں کہ وہ بہت بہادری سے سب سہ لیں گی مگر ان کا تو پہلا قدم ہی لڑکھڑا گیا تھا۔ عمر خان کو کھونے کا احساس انہیں خون کے آنسو رلانے لگا۔ کچھ دیر بعد لائبہ واحدی اور ثوبانہ شاہ اندر داخل ہوئیں تو زیاد خان نے فاطمہ بی بی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لے کے اٹھایا اور تعارف کروایا۔

"آنٹی! میری اماں ـــــ"

"السلام علیکم ـــــ" فاطمہ بی بی نے آگے بڑھ کے لائبہ واحدی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جسے لائبہ واحدی نے تھاما تو ان کے ہاتھوں کی تختی فاطمہ بی بی کو اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئی۔

"خوشی ہوئی آپ کے آنے کی ـــــ" وہ روایتی جملہ بولیں۔ یہ تو فاطمہ جانتی تھیں کہ انہیں کتنی خوشی ہوئی تھی۔

ثوبانہ شاہ نے فاطمہ بی بی کی شخصیت کا بغور جائزہ لیا۔ ان کی شخصیت کا وقار دیکھ کے دل میں حسد کی لہر نے انگڑائی لی اور جی چاہا کہ ان کی محبت کا یقین خاک میں ملانے میں ذرا تاخیر نہ کریں۔

"یہ میری بہن ہیں مسز شاہ ـــــ" فاطمہ نے پہچان لیا کہ وہی ثوبانہ ہیں۔ انداز سے سرد مہری صاف ظاہر تھی۔

"کیسی ہیں آپ ـــــ" وہ جواباً" زیر لب کیا بولیں فاطمہ بی بی سمجھ نہ پائیں۔

ثوبانہ کی نظریں بھٹکتے ہوئے بار بار فاطمہ بی بی پہ جم جاتی تھیں۔

ان کے سامنے سلک کے انتہائی نفیس لباس میں جو عورت بیٹھی تھی اس کے اندر ایسا جادو تھا جو اس عمر میں بھی کسی بھی مرد کو ان کا دیوانہ بنا سکتا تھا۔

جادوگرنی کتنی بھی خوب صورت ہو ـــــ اس کے جادو کا کوئی نہ کوئی توڑ ہوتا ہے اور ثوبانہ کے ہاتھ وہ توڑ لگ چکا تھا۔ اب انہیں عمر خان کو ان سے چھیننا تھا۔ وہ اس سے ہر قدم پہ تو نہیں ہار سکتی تھیں۔ کیا ہر مقام پہ ہار میرا ہی نصیب بنے ـــــ؟ نہیں ـــــ اب نہیں ـــــ اب نہیں ہاروں گی۔

"مسز شاہ ـــــ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی ـــــ زیاد بتا رہا تھا کہ پچھلے دنوں آپ کی طبیعت کافی خراب تھی۔" فاطمہ، ثوبانہ شاہ کی طرف مڑیں۔

"ثوبانہ عمر خان ـــــ" ثوبانہ نے تعارف کرایا جس کی ضرورت نہیں تھی۔

"ثوبانہ! آپ بہت بہادر خاتون ہیں۔ آپ نے جس طرح زندگی گزاری ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اب آپ کو آپ کا حق اور مقام ملنا چاہیے۔" فاطمہ بی بی بھی خود کو زیادہ دیر پردے میں نہ رکھ سکیں۔

"وقت گزر جائے تو حق اور مقام بھی کھو جاتے ہیں۔"

"لیکن دل کے ٹکڑے کوئی زمین کا ٹکڑا نہیں ہوتے کہ جن پہ جو چاہے قبضہ کرلے ـــــ جو ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ تمام عمر ہی بے نام رہتے ہیں۔" فاطمہ بی بی کی آواز بھرا گئی۔

"لگتا ہے آپ کے ہاتھ بہت کچھ لگ گیا ہے۔"

"اس کے سوا کچھ نہیں ـــــ" فاطمہ بی بی نے اپنی کلائی سامنے کرتے ہوئے کہا' جہاں سگریٹ سے داغا گیا ثوبانہ کا نام موجود تھا۔

یہ پہلا مقام تھا' جہاں ثوبانہ کو محسوس ہوا کہ عمر خان نے ان کی محبت کی لاج رکھی ہے۔

"خان نے میری تقدیر کا فیصلہ کسی کھو جانے والے ہاتھوں میں دے رکھا ہے۔ میں اس کے فیصلے کے انتظار میں ہوں۔" فاطمہ نے دل پہ پتھر رکھتے ہوئے اصل بات کی۔

"فیصلہ تو ہو گیا ـــــ"

ان کی گفتگو کس پیرائے میں ہو رہی تھی دونوں بخوبی آگاہ تھیں۔

"کیا وہ فیصلہ جاننے کا اختیار ہے مجھے ـــــ"

"مجھے عمر کے ساتھ اس کا سایہ بھی قبول نہیں۔" وہ اتنے پتھریلے لہجے میں بولیں کہ فاطمہ بی بی کو لگا جیسے موت کی سزا سنادی ہو۔

"ثوبانہ! محبت کرنے والوں کے دل تو بہت وسیع ہوتے ہیں ـــــ کیا اس میں بے نام سا وجود نہیں رہ سکتا اس وعدے کے ساتھ کہ اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہو گا آپ کو ـــــ" فاطمہ نے اب کے کھل کے بات کی۔

"نہیں ـــــ ہرگز نہیں ـــــ بلکہ مجھے تو سکون ہی اس دن ملے گا جب تم بھی اسی طرح واپس جاؤ گی جس طرح تمہارے بھائی نے مجھے رسوا کرکے بھرے مجمع میں واپس بھیجا تھا۔" وہ سنگ دلی سے بولیں۔

"تب میں بھی تو رسوا ہوئی تھی ـــــ" وہ تڑپیں۔

"اس قصے کا اب وقت نہیں ہے اور آخری بات یہی ہے کہ ساریہ اور زیاد صرف اس صورت میں ایک ہو سکتے ہیں کہ آپ راستے سے ہٹ جائیں۔"

فاطمہ کا دل کرچی کرچی ہوا۔

"ٹھیک ہے ـــــ مجھے منظور ہے ـــــ مگر ایک درخواست ہے کہ عمر خان کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگے کہ آپ کے اور میرے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ زیاد خان کی شادی کے بعد میں خود خاموشی سے اس حویلی سے نکل جاؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" فاطمہ نے دل پہ جبر کرکے فیصلہ سنایا۔

ثوبانہ جانتی تھیں کہ عمر ایک بٹا ہوا شخص ہے اور فاطمہ کی موجودگی میں وہ کبھی ثوبانہ کا نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ فاطمہ کو معاف کرکے وہ عمر خان کے دل میں اپنی محبت کی فتح کا جھنڈا گاڑ سکتی تھیں۔ یہاں انہوں نے غلط پتا کھیلا تھا۔

زیاد خان اور ساریہ کے نکاح کی تاریخ پکی کرکے وہ خالی ہاتھ لوٹ آئیں۔

فاطمہ بی بی اپنے بیٹے کی خاطر سب کچھ داؤ پہ لگا آئیں ـــــ زندگی ہار دی۔ عمر خان ان کی زندگی ہی تو تھے۔

"اماں آپ خوش تو ہیں۔" زیاد خان کو نجانے کیوں وہم ہو گیا تھا کہ فاطمہ بی بی خوش نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ عام دنوں سے زیادہ ہنس رہی تھیں کسی کہاوت کی طرح کہ خالی برتن زیادہ آوازیں نکالتا ہے۔

"اماں! میں ہسپتال جاؤں گا آج ـــــ کل گاؤں کے لیے نکلیں گے۔" زیاد نے فلیٹ کی طرف گاڑی موڑتے ہوئے کہا تو فاطمہ بی بی نے شکر کیا کہ وہ آج خان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"شبیر ـــــ شبیر۔" فیض اسے ڈھونڈتا ہوا لائبریری میں آگیا۔

"آہستہ لائبریری ہے یہ ـــــ" شبیر نے گھورتے ہوئے کہا۔ امجد نے الگ گھوری ماری۔ مگر اس نے پروانہ کی۔ شبیر کو کھینچ کے باہر لایا اور بتایا کہ ابھی آنلہ کا فون آیا تھا کہ شمیلا لوٹ آئی۔

"اس کا مطلب ہے اس کے گھر والوں کو اس واقعے کا علم نہیں ہوا اسی لیے وہ لوٹ آئی ہے۔ یقین کرو شبیر! میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔" وہ بہت خوش تھا۔

"اب جا کے ملاقات تو کرو ـــــ" شبیر نے چھیڑا۔

"نہیں اب اسے آنا ہے۔ آخر موت سے بال بال بچا ہوں۔ کیا اس کو مجھے دیکھنے نہیں آنا چاہیے۔ مجھے اس کی محبت کو بھی تو آزمانا ہے۔"

"ارے یار اس کی محبت تو تم اس دن دیکھتے..... بقول شاعر۔

وہ سر کھولے میری لاش پہ دیوانہ وار آئے
اسی کو موت کہتے ہیں تو یارو! بار بار آئے

شبیر نے لہرا کے شعر پڑھا تو وہ مسکرا دیا۔

ابھی وہ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ وہ آنلہ کے ساتھ کوریڈور سے آتی دکھائی دی۔

"السلام علیکم۔" شبیر نے پہل کی۔

"وعلیکم السلام۔" آنلہ نے باآواز بلند اور اس نے زیر لب کہا۔

"فیض کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟"

"شکر ہے اللہ کا..... اب تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہوں۔" اسے یقین نہ آیا کہ وہ یوں اس سے مخاطب بھی ہو سکتی ہے۔

"آئیں۔ کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" شبیر نے آفر کی تو اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی آنلہ اسے گھسیٹ کے ساتھ کیفے لے آئی۔ اس کا دل بری طرح ڈر رہا تھا۔ اسے یہ سب مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

یہ آج پہلی اور آخری بار ہے۔ اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔ شبیر نے تھوڑے فاصلے پہ آ کے ساریہ کو فون ملایا۔

"ساریہ! آج یونیورسٹی آ سکتی ہو..... میں تمہیں شمیلا سے ملانا چاہ رہا ہوں۔"

"بالکل آجاتی ہوں....."

کچھ ہی دیر بعد ساریہ یونیورسٹی میں تھی اور ظلم یہ تھا کہ اس کے ساتھ زیاد خان بھی تھا۔ ساریہ نے آتے وقت اسے بھی آفر دی تو اس نے انکار نہ کیا کہ اتنے دنوں بعد تو آج دونوں پر سکون ہوئے تھے۔

"ارے ماشاء اللہ ہماری بھابھی تو بہت پیاری ہے۔" ساریہ اسے گلے ملتے ہوئے بولی۔

"فیض! تم نے تو بہت اچھا پیس مارا ہے۔" ساریہ کے کمنٹس جاری تھے اور شمیلا اور زیاد خان کے وجود پتھر ہو گئے تھے۔

"شمیلا آپیا تمہیں بھی میرا بھائی قبول ہے۔ ہم نے گھر میں تو بات کر لی ہے۔ خالہ جانی جلد ہی تمہارے والدین سے ملیں گی۔ کیا تمہارے گھر والے مان جائیں گے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کے بولی۔

وہ خاموش رہی..... زیاد خان کی خواہش تھی کہ وہ بولے۔

ایک بہن نے پہلے ذلیل کیا تھا۔ ایک نے آج کر دیا تھا۔ وہ خود بالکل خاموش تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں۔" زیاد نے کہا تو ساریہ شمیلا سے گلے مل کے اس کے ساتھ ہولی۔

شام کو زیاد اسے ہاسٹل سے لے کے اپنے فلیٹ پہ آ گیا۔ فاطمہ بی بی نے اسے خوشخبری سنائی کہ ساریہ اور زیاد کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔

وہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کے بھائی کو مبارک باد نہ دے پائی۔ اس سرد مہری کو فاطمہ بی بی نے بھی محسوس کیا۔

"لالہ!" فاطمہ بی بی رات کمرے میں سونے گئیں تو شمیلا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ جب کسی پل سکون نہ ملا تو زیاد خان کے کمرے میں سر جھکائے چلی آئی۔ اس نے نظریں نہ اٹھائیں۔

"مجھے معاف کر دیں لالہ! میں نے آپ لوگوں کا اعتماد توڑا....." وہ اس کے قدموں میں آن بیٹھی۔

"میں نے تو تمہیں کوئی الزام نہیں دیا۔ کیا گناہ کیا ہے تم نے سوائے اپنے باپ اور بھائی کے نقش قدم پہ چلنے کے..... فکر نہ کرو، میں بابا جان کو راضی کر لوں گا اور اگر انہوں نے انکار کیا تو یقیناً" یہ سزائیں بھی سہنے کا اتنا ہی حق دار ہوں گا جتنی تم..... جاؤ اب۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو وہ اس کے قدموں پہ گر گئی۔

"نہیں لالہ..... میں جانتی ہوں کہ میں نے بہت برا کیا ہے مگر یقین کریں میں کبھی آپ کی راہ میں نہیں آؤں گی۔ ساریہ بھابھی کا ملنا میری دعاؤں کا اعجاز ہے۔ ان پہ سب کچھ قربان ہے..... میں کبھی اس کا نام بھی نہیں لوں گی۔ آپ میرے اس جرم کو پردے میں لپیٹ دیں۔ نادان اور کم عقل ہوں..... معاف کر دیں۔" وہ روتی چلی گئی۔

"جاؤ ملالئی..... جاؤ۔"

وہ اٹھی اور مردہ قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

صبح زیاد نے اسے یونیورسٹی چھوڑنا چاہا تو وہ منکر ہو گئی۔

"ملالئی تماشا مت بناؤ..... مجھے اس بات کا کوئی افسوس نہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ کہا ہے نا کہ بابا جان سے بات کروں گا۔" اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں اپنی مرضی سے گاؤں جانا چاہ رہی ہوں۔"

"اور یہاں جو اسٹڈیز کا حرج ہو گا۔"

"مجھے نہیں پڑھنا لالہ..... مجھے نہیں جانا یونیورسٹی۔"

"فضول باتیں مت کرو..... چلو میں تمہیں ہاسٹل چھوڑ دوں۔"

وہ چپ ہو رہی۔ اسے افسوس تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بھائی کے حالت کتنی خراب ہوئی تھی۔ مجھے تم سے اب کبھی نہیں ملنا فیض۔ اس نے طے کر لیا اور اس بات پہ جم بھی گئی۔

اور پھر شمیلا نے یونیورسٹی کو چھوڑ ہی دیا۔ بابا جان کو گاڑی بھیجنے کو کہا اور اگلے ہی دن حویلی واپس لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! آپ نے اسے کیوں جانے دیا ہے۔ اسے واپس لائیں۔ بیوی ہے وہ میری۔" ربیط آرشین جان کے سر ہو گیا۔ آج اسے گئے ہوئے پانچواں دن ہو گیا تھا۔ وہ ایک دن اس کے بغیر سکون سے نہ رہ پایا تھا۔

ہر لمحہ اس کی یاد ستا رہی تھی اور ڈر اس بات کا بھی تھا کہ کہیں وہ اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے۔

"دماغ تیرا ہی گھوم گیا تھا۔ خود پہ قابو ہے تجھے..... اس دن اللہ نہ کرے کہ اسے کچھ ہو جاتا تو..... کیا منہ دکھاتے تیرے بابا جان اپنے بھائی کو..... اور اس بچے کی حقیقت سے تو واقف تھا اور تو نے اسے اس کے باوجود قبول کیا تھا۔ اب کیا مصیبت ہے۔ اب کیوں تماشا بنا رہا ہے۔" آرشین جان نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی۔

"اچھا آئندہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ اسے لے آئیں....." وہ منت بھرے لہجے میں بولا تو انہوں نے انکار کر ڈالا۔

"خود لے آ..... حق رکھتا ہے۔"

اور وہ اس کی طرف آ گیا۔

"ارے ربیط آیا ہے۔" فاطمہ بی بی نے اسے دیکھ کے خوشی کا اظہار کیا۔

زیاد نے اٹھ کے اسے گلے لگایا۔

"ربیط لالہ! آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئے ہیں۔" ملالئی نے ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔

"بس بابا نے فیکٹری میں اتنا مصروف کر دیا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔" روایتی سا بہانہ بنایا۔

زیاد خان اور وہ دونوں باتوں میں لگ گئے۔ آج کتنے عرصے بعد دونوں نے اکٹھے وقت گزارا تھا۔

ملالئی نے لالئی کو اس کے آنے کی اطلاع دے دی وہ بے نیازی سے اپنے کاموں میں لگی رہی۔

"لالئی ربیط تمہیں لینے آیا ہے۔" زیاد ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر آیا۔

وہ باہر آئی تو وہ اس کے سامنے آ گیا۔ وہ بے نیازی سی صوفے پہ بیٹھی رہی۔ ربیط اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔ گلابی دوپٹے کے حصار میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ گلابی گلابی پاؤں کارپٹ پہ چپلوں کی قید سے آزاد تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے جسم پہ سوجن واضح ہو رہی تھی۔ نازک سی لالئی کا سراپا بھاری اور بے ڈول ہو رہا تھا۔

"لالئی آئی ایم سو سوری۔ کاش میں تمہارا گنہگار نہ ہوتا۔ مجھ سے تمہیں اتنے دکھ نہ ملے ہوتے۔" وہ سر جھکا کے بولا۔

"مجھے ساری زندگی یہ اذیت نہیں بھولے گی کہ میں نے، جس سے محبت کی اسی نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالا۔ مجھے بے آبرو کیا۔" اس کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔

"لالئی! تم اس وقت بھی میری بیوی تھیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ شرمندہ میں صرف اپنے بعد کے رویے پہ ہوں۔ بہت پچھتا رہا ہوں۔" وہ چہرہ چھپا کے رو پڑی تو ربیط نے اسے اپنی پناہوں میں لے لیا۔

"ربیط! میں بھی تو کسی کی بیٹی تھی۔ کسی کی عزت تھی۔ جسے بے عزت کرتے ہوئے آپ کا دل نہیں کانپا۔ اب بات اپنی اولاد پہ آئی ہے تو کیسے تڑپ رہے ہیں۔"

"تم سے بہت شرمندہ ہوں لالئی۔"

"تم مرد تھے سچے ہو گئے اور میں ایک کمزور عورت ..... اس لیے گناہ گار ٹھہرادی گئی۔" وہ اسی کے سینے سے لگ کے رونے لگی۔

"تمہاری پارسائی کا گواہ میں خود ہوں۔ مجھے کسی گواہ کی ضرورت نہیں، باقی سب کے سامنے بھی تمہیں میں ہی سرخرو کروں گا میری جان۔" ربیط اس کے ریشمی بالوں پہ لب رکھ کے بولا۔

"میں کیسے سب کو یقین دلاؤں گی کہ میں بدکردار نہیں ہوں۔ میرا شوہر مجھ پہ جان دیتا ہے۔ میں کیسے سب کی بے رخی سہوں گی۔ اس ساری صورتحال میں اگر دل سے کسی کی غلام ہوئی تو وہ مرجانہ ہے۔ جس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس بات پہ یقین نہیں کیا کہ مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے۔"

"وہ مجھ سے بھی بہت لڑی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، جسے اس نے تھام لیا اور واپس حویلی آگئی۔

مرجانہ بھاگ کے اس سے لپٹ گئی اور آرشین جان کو بھی ربیط کے چہرے کا اطمینان سکون دے گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ سجدے میں ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ عمر خان نے کندھے سے تھام کے انہیں اٹھایا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"ایسا کیا طے کر آئی ہیں وہاں جو اتنا تکلیف دہ ہے۔ پہلی دفعہ آپ کو یوں روتے دیکھا ہے۔" عمر خان نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ذومعنی بات کی۔ فاطمہ بی بی نے گھبرا کے آنکھیں چرا کر جلدی جلدی جائے نماز تہ کرنے لگیں۔

"آپ کی حکم عدولی کی ہے، اسی کی شرمندگی ہے۔" وہ اپنا درد چھپا کے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"ملیں ان لوگوں سے ..... کیسے تھے۔"

"بہت اچھے لوگ ہیں اور سب سے بڑی بات کہ میں وہاں سے ایک نہیں بلکہ دو دو خوشخبریاں لائی ہوں۔ پتا ہے وہاں ثوبانہ عمر خان سے بھی ملی۔" وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھیں۔ عمر خان خاموش رہے۔

"وہ آپ کی عزت ہیں خان اور حق رکھتی ہیں کہ ان کی محبت کا حق انہیں ملے۔ آپ انہیں عزت و احترام سے اس حویلی میں واپس لائیں۔ وہ آپ کے بیٹوں کی ماں ہیں۔"

اس کا مطلب ہے کہ فاطمہ سے ملنے کے بعد ثوبانہ کو اپنا بے رحمانہ فیصلہ بدلنا ہی پڑا۔ اگر ایسا کیا ہے تو تم نے اپنی محبت کی عظمت بہت اونچی کر لی ہے۔ ثوبانہ! انہوں نے اسی رات لائبہ واحدی کا فون پہ شکریہ ادا کیا

وہ سمجھ رہے تھے۔ انہیں دو جہاں کی دولت مل گئی ہے۔

ربیط دو دنوں کے لیے ایک میٹنگ کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا کہ لالئی کی طبیعت بگڑ گئی۔ اسے فوراً ہسپتال لے جایا گیا، جہاں اس کا بی پی لو ہو جانے کی وجہ سے فوراً آپریشن کر دیا گیا۔ اللہ نے اسے بیٹی کی نعمت سے نوازا مگر بجلیاں اس وقت گریں، جب بچی کے بارے میں لالئی نے پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ مری ہوئی پیدا ہوئی تھی۔

"نہیں ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے میری بچی کو مار دیا ہے۔ وہ زندہ تھی میں نے خود اس کے رونے کی آواز سنی تھی۔ میری بچی زندہ تھی۔" وہ چیخ چیخ کے بے ہوش ہو گئی۔

مرجانہ نے ربیط کو اطلاع دی تو پہلی فلائٹ سے واپس آگیا۔

"ربیط! میں نے خود اس کے رونے کی آواز سنی تھی ... میں ہوش میں تھی۔" وہ اپنی بچی کے لیے مچل مچل رہی تھی۔ فاطمہ بی بی اسے بمشکل سنبھالے ہوئے تھیں۔ وہ بے بس تھیں۔ کیا کہتیں۔

"اماں! میری بچی کہاں ہے۔" وہ آرشین جان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"وہ تمہاری بچی نہیں تھی۔ جس کی تھی ہمیں نے اس ۔۔۔۔ لے کر دی۔" انہوں نے چھپانا مناسب خیال نہ کیا۔

"اماں ... آپ نے میری بچی۔" اس کی آواز صدمے سے پھٹ گئی۔

"ہاں میں نے اسے شیر خان کے گاؤں بھجوا دیا ہے اور ساتھ ہی کچھ رقم بھی کہ اسے شہر لے جائے اور وہیں پالے۔" وہ بول رہی تھیں اور ربیط کی سانس رکنے لگی ... وہ پاگلوں کے طرح پورے دو دن اپنی بچی کو ڈھونڈتا رہا شہر تک گیا مگر مایوس ہی لوٹنا پڑا۔ نجانے شیر خان معصوم بچی کو لے کے کہاں چلا گیا تھا۔

لالئی کی حالت کے پیش نظر اسے ہاسپٹل میں ہی رکھا گیا تھا۔

"ربیط! تو اس کا دکھ کیوں لے رہا ہے بچے۔ وہ کون سا تیرا خون تھی۔" آرشین جان نے کہا تو اس سے پہلے کہ وہ بولتا جبار خان اندر آگئے۔

"اس میں اتنی ہمت نہیں کہ جواب دے سکے۔ مجھ سے پوچھو کہ وہ کس کا خون تھی۔ وہ جبار خان کی ہی پوتی تھی۔ تیرے اسی لاڈلے کا خون تھی۔ اگر اس میں ذرا سی بھی انسانیت ہے تو آگے کا سچ یہ خود بتائے گا۔" وہ دہاڑے تو ربیط خان کے لیے سچ بتانا ناگزیر ہو گیا۔

جبار خان نڈھال سے ہو کے صوفے پہ گر گئے۔

"ربیط ... بچے۔" آرشین جان کو سکتہ طاری ہو گیا۔

"لالہ!" مرجانہ کی آواز چیخوں میں بدل گئی۔ ربیط شرمندگی سے باہر نکل گیا۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ہاسپٹل میں پڑی لالئی کا بھی سامنا کرتا۔

☼ ☼ ☼

فیض کو جب علم ہوا کہ وہ یونیورسٹی ہی چھوڑ گئی ہے تو اس کی حالت دن بدن پہلے سے زیادہ خراب ہونے لگی ... پہلے ہی کم بولتا تھا۔ اب تو بالکل ہی زبان پہ تالے پڑ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے تمام ٹیسٹ کیے، سب کلیئر تھے۔ اس کے باوجود اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ کمزوری سے بار بار چکر آنے لگے۔ شبیر کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ماما کی طبیعت فیض کی وجہ سے ڈسٹرب تھی اور وہ خود تو تنہا ہی رہ رہا تھا۔

لائبہ واحدی الگ پریشان تھیں کہ ساریہ کی شادی کے دن قریب تھے وہ ثوبانہ کو کیسے سنبھالیں۔ لاکھ کہنے کے باوجود فیض گھر سے جانے کو بھی تیار نہ تھا۔ ساریہ ہر روز اس کی طرف چکر لگاتی۔ وہ بھی اس کی حالت دیکھ کے ہاتھ پاؤں چھوڑ رہی تھی۔ کوئی میڈیسن اثر نہیں کر رہی تھی۔

"وہ واقعی تمہارے خوابوں والی چڑیل تھی اس نے تمہیں پتھر بنا دیا ہے۔ تم اس کی خاطر ہم سب کو بھول گئے ہو۔" بالآخر تھک کے شبیر ہمت ہار گیا اور اس کے سامنے ہی رو پڑا۔

"شبیر! یقین جانو ایسا کچھ نہیں ہے۔" فیض نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"ایسا ہی ہے۔ وہ جو کل تمہاری زندگی میں آئی تھی وہ تمہیں ہم سے زیادہ عزیز ہو گئی ہے کہ تم نے ہماری طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" وہ پھٹ پڑا۔ شام ساریہ آئی تو زیاد کو مجبوراً آنا پڑا کہ وہ فیض کے لیے رونے لگی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے فیض! ایک لڑکی کی خاطر تم نے خود کو روگ لگا لیا ہے۔" ساریہ اس کی حالت دیکھ کے خود پہ ضبط نہ کر سکی۔ دھچکا تو زیاد خان کو بھی اس کی حالت

دیکھ کے لگا تھا۔

ثوبانہ شاہ ۔ اس چھ فٹ سے نکلتے قد والے نوجوان کو دیکھ کے اس احساس سے دور نہ ہو سکیں کہ وہ ان کا بیٹا اور ان کے فیض اور شبیر کا بھائی ہے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ وہ ان کے فیض کو سنبھال لے گا۔

فاطمہ بی بی کو تو تم قبول کر نہیں رہیں ثوبانہ عمر خان! اس کا بیٹا تمہارے بچوں کا بھائی کیسے ہو گیا۔ کوئی اس کی خوش فہمی پہ ہنسا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کوئی روگ نہیں پال رکھا تم لوگ خواہ مخواہ افسانہ بنا رہے ہو۔" فیض زیاد کے سامنے شرمندہ ہو گیا۔ زیاد کا دل چاہا وہ وہاں سے بھاگ جائے۔

"اس کا ایڈریس وغیرہ کچھ پتا ہے۔ شاید زیاد کو اس علاقے کی کوئی معلومات ہوں۔" ساریہ نے پوچھا۔

"اس کا تو موقع ہی نہیں ملا۔"

"فیض! میں کوشش کروں گا اسے ڈھونڈنے کی۔" زیاد کو کہنا پڑا۔

اس کی بات پہ ثوبانہ کا پورا وجود جل اٹھا۔

جب بھی زیاد خان کو تمہارا اصل چہرہ دکھائی دے گا تو کیا ہو گا۔ کوئی ثوبانہ کے اندر ہنس کے بولا۔

"زیاد! میں اب پانے اور کھونے کی کیفیت سے نکل چکا ہوں۔ میں نے اسے مجسم پانے کی آرزو ترک کر دی ہے۔ اس کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کی تو وہ اتنا دور ہو گئی۔ اس سے آگے کی طلب کی تو نجانے کیا ہو ۔ڈرنے لگا ہوں۔" فیض نے حسرت سے کہا تو زیاد کے کانوں کی لوئیں بھی سرخ پڑ گئیں۔

وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اس میں بیٹیوں کے ناموں کو بھی سات پردوں میں رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساریہ بھی اس حقیقت سے لاعلم تھی کہ اس کی بہن اس یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، جہاں فیض اور شبیر ہیں اور زیاد خان کی بدقسمتی کہ فیض کی نظریں اس پہ پڑ گئی تھیں۔

اس کے بعد اس سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ شبیر ان دونوں کو رخصت کر کے آیا تو فیض ثوبانہ کے ساتھ باتوں میں لگا تھا۔

"ماما بڑا زبردست بندہ ہے یہ اپنا زیاد بھی۔۔۔ ساریہ یقیناً" اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔" شبیر نے کہا۔

"ان شاءاللہ۔۔۔" ثوبانہ شاہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ دعا نکلی۔

لیکن ایک دن بعد ہی لائبہ واحدی کی زبانی جو کچھ ان دونوں نے سنا، کتنی ہی دیر ان کی قوت گویائی نے ان کا ساتھ نہ دیا کہ وہ کوئی سوال کرتے۔

"خالہ جانی۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" فیض کے لب بمشکل ہلے۔

"بیٹا! تمہاری ماں نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے۔ اس کی پسند کی شادی اس کا جرم بن گئی اور اس کی پاداش میں وہ اپنے شوہر سے دور کر دی گئی۔ تم دونوں کے سہارے اس نے زندگی گزاری ہے۔" لائبہ واحدی نے کہتے ہوئے ثوبانہ عمر خان کا سرد ہاتھ تھام لیا۔

"مگر ماما تو کہتی تھیں کہ ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" شبیر نے کہا۔

"تو اور کیا کہتی پھر اس کے سوا۔"

"لیکن ماما وہ ہیں کون۔۔۔" ساریہ نے پوچھا۔

"بیٹا! وہ عمر خان ہیں۔۔۔" ایک بم تھا جو ان سب پہ گرا تھا۔

"ماما۔۔۔" ساریہ کی آواز پھٹ گئی۔

فیض اور شبیر کی حالت یہ تھی کہ اگر کوئی ان کے وجود کو کاٹ کے دیکھتا تو یقیناً" ایک قطرہ خون نہ ملتا۔

لائبہ واحدی نے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ ان کے اندر کیا چل رہا ہے۔

"خالہ جانی! زیاد کے بابا جان ہمارے بھی بابا جان ہیں۔" شبیر کے لب مسکرا اٹھے۔

"یعنی زیاد خان ہمارا بھائی ہے۔" فیض نے کھوئی کھوئی آواز میں یقین کرنا چاہا تو لائبہ واحدی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا اور تشکر کے آنسوؤں نے بات مکمل ہی نہ ہونے دی۔

"اور۔۔۔ اور یہ مصیبت وہاں بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔" شبیر نے یکدم ساریہ کے بالوں کو کھینچتے ہوئے ماحول ہی بدل ڈالا۔ سب خوش تھے اور ثوبانہ عمر خان کے سارے خدشات دور ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔۔۔" زیاد کے تو ہوش ہی اڑ گئے سب سن کے۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ فاطمہ بی بی کو اندازہ لگانے میں ایک لمحہ نہ لگا کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔

"زیاد خود کو قابو میں رکھو بیٹا۔۔۔ میری بات تو سنو۔" وہ پستول لے کے نکلنے لگا تو وہ اس کے سامنے آ گئیں۔

"کیا قابو رکھوں۔۔۔ اتنا ذلیل اور گھٹیا نکلا ہے یہ شخص۔۔۔ بے غیرت۔۔۔ اس کی بہن کے ساتھ میں نے کون سے عشق و محبت کے لمحات گزارے تھے کہ اس نے اتنا گھناؤنا کھیل کھیلا۔" وہ ان سے خود کو چھڑا کے سیدھا جبار خان کی حویلی آ گیا۔ وہ اس وقت حویلی میں نہ تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ رہیط خان پہ پستول تانتا" آرشین جان اور لالئی درمیان میں آ گئیں۔

"تجھے تیرے رب کا واسطہ ہے زیاد خان! میری بات سن۔"

"چلو لالئی تم میرے ساتھ۔۔۔ میں جرگہ بلوا کے اس شخص سے تمہیں آزاد کراؤں گا۔" زیاد خان نے لالئی کو ہاتھ سے پکڑ کے کھینچا۔

"آپ کو کیسے دعویٰ ہے کہ آپ میرے بھائی ہیں۔ آج آپ مجھے بے گناہ سمجھ رہے ہیں۔۔۔ اس وقت آپ نے ایک بھی گواہی مانگی تھی اپنی بہن کی بدکرداری کی۔۔۔ کل کو کوئی اور الزام لگا دے گا تو آپ اس پہ بھی یقین کر لیں گے۔ رہیط نے الزام لگایا اور آپ نے یقین کر لیا۔ آپ میرے کردار سے ناواقف تھے۔ میرا گلہ اپنی ماں سے بھی ہے جو اپنی بیٹی کو بھی نہ جان پائی۔ وہ کیسی ماں تھیں۔۔۔ میں تو ان کا ایک ایک دکھ بنا ان کے بتائے جان جایا کرتی تھی اور آج میں سب کے سامنے آپ سے اور اماں سے اپنا تعلق ختم کرتی ہوں۔ میرا کوئی مخلص تعلق اگر کسی سے ہے تو وہ مرجانہ ہے، جو اس وقت بھی میری بے گناہی پہ ڈٹی رہی جب کوئی بھی میری پارسائی کا یقین نہیں کر رہا تھا۔ لالہ! میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے رہیط کو معاف کر دیا ہے۔ میں تائی اماں کو بھی معاف کر رہی ہوں مگر میں آپ کو اور اماں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اب آپ چلے جائیں اور میرے شوہر کو میرے ساتھ زندگی گزارنے دیں۔ جتنے رشتے مجھ سے چھین چکے ہیں اتنے بہت ہیں۔ اب اور ظلم مت کریں۔ جائیں۔" وہ اپنی بات کر کے روتی ہوئی نکل گئی۔ زیاد اسے پکار بھی نہ سکا۔

رہیط خان دروازے میں ہی پتھر ہو گیا۔ لالئی نے تو زیاد خان کے ساتھ ساتھ اسے بھی مار دیا تھا۔ وہ اس سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہ تھا۔ فاطمہ بی بی تو سناٹو گنگ رہ گئیں۔ لالئی نے یہ کیسا وار کیا تھا کہ وہ پھر بھی نہ پھڑپھڑا سکیں۔ وہ دیوانوں کی طرح اس کی طرف آئیں مگر اس نے خود کو کمرے میں قید کر لیا۔ وہ روتی تڑپتی رہیں مگر اس نے اپنی قسم نہ توڑی۔

ملالئی رو رو کے اسے پکارتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"میں اپنے ہی جال میں پھنس گیا ہوں بابا! میں لالئی سے نظریں نہیں ملا پاتا۔۔۔ اور میری معصوم بچی نجانے کہاں ہو گی۔" اسے آخری سہارا جبار خان ہی نظر آئے جو اسے اس اذیت سے نکال سکتے تھے۔ اسے معافی دلا سکتے تھے فاطمہ بی بی اور زیاد خان سے۔

"تمہیں اپنی جنگ خود ہی لڑنی پڑے گی رہیط خان۔۔۔ اور اس کے رشتے بھی اسے لوٹانے ہوں گے۔ وہ اس وقت جذباتی ہو رہی ہے۔ تمہیں اسے واپس لانا ہو گا اور تمہارا رشتہ میں تجھے لوٹاؤں گا۔"

"کیا مطلب۔۔۔"

"تو بھلے اندھے پن میں رشتوں کو بھول جائے رہیط خان! مگر میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا

ہوں۔ میرا خون اتنا ارزاں نہیں کہ ادھر ادھر رلتا۔ اس لیے میں ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہا۔ تیری ماں کے ارادوں سے میں اچھی طرح واقف تھا' اس لیے میں نے کوتاہی نہیں کی۔" وہ مسکرائے۔

"بابا! کہاں ہے میری بچی....." وہ بے تابی سے بولا۔

تو انہوں نے اپنے پرانے ملازم کو آواز دے کر بلایا۔ ان کی پوتی تو ان کے نمک خوار کی بیوی سنبھال رہی تھی۔ انہوں نے زیاد خان کو دی اپنی زبان کی لاج رکھنی تھی۔

ربیط نے فرط مسرت سے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ مرجانہ نے دیکھا تو وہ بھی بھاگتی ہوئی آئی۔

"اوہ پھپھو کی جان....." وہ چھوٹی سی گڑیا کو اٹھاتے ہوئے بولی۔

آر شین جان نے بچی کو ڈھیروں پیار کرتے ہوئے اس کے حوالے کیا۔

"لالئی! یہ رہا تمہاری منہ دکھائی کا تحفہ....." وہ کمرے میں داخل ہو کر چھوٹی گڑیا کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تو وہ ساکت رہ گئی۔ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چھو کے محسوس کیا۔

"یہ میری بچی ہے نا ربیط....."

"یہ ہماری بچی ہے لالئی اور مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولا۔

"زیاد پلیز! مجھے معاف کر دو میں مرجانہ کی محبت میں اندھا ہو گیا تھا۔ یہ رشتے ہوتے ہی بہت ظالم ہیں انسان کی آزمائش بن جاتے ہیں۔" ربیط نے آگے بڑھ کے زیاد خان کو بازو سے پکڑ لیا۔

وہ خاموش رہا تو جبار خان آگے بڑھے اور زیاد کو تھام لیا۔

"زیاد بچے آج بالآخر اولاد کی وجہ سے وہ دن آ ہی گیا ہے جب مجھے اپنے احسانوں کا بدلہ چاہیے۔ آج میرے ہاتھ جڑے ہیں۔" انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑنے چاہے۔

"کاکا جی....." زیاد کی آواز گلے ہی میں دب گئی۔

"خان لالا....." فاطمہ بی بی تڑپ کے آگے بڑھیں۔ "خدا کبھی وہ وقت نہ لائے کہ آپ کو ہاتھ جوڑنے پڑیں۔ زیاد کو آپ حکم کریں۔" لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور وہ دونوں گلے مل گئے۔

"لالہ! اب جلدی سے بھانجی کو پہلی دفعہ دیکھنے کا تحفہ بھی تو دیں۔" ملالئی نے بھی مسکراتے ہوئی مہ وش کو اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

عمر خان نے فاطمہ بی بی کے کہنے پہ جبار خان کو بلوایا اور انہیں اپنے بچوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کا کہا جو کہ عمر خان اور فاطمہ بی بی کی زندگی میں آ چکی تھی۔ زیاد خان کی شادی سے پہلے اس حقیقت کا بچوں پہ کھلنا اور بھی ضروری تھا۔

زیاد خان لالئی اور ملالئی پہلے تو یوں بلانے پہ پریشان ہو گئے مگر بابا جان اور اماں کے پر سکون چہرے انہیں بھی پر سکون کر گئے۔

جبار خان نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس سے سب کے ملے جلے احساسات سامنے آئے تھے۔ البتہ زیاد خان پہ تو جیسے آسمان سے بجلیاں گری تھیں۔ وہ بنا حرکت کیے خالی خالی نظروں سے ایک ہی سمت دیکھے جا رہا تھا۔

"زیاد..... بچے۔" جبار خان نے اسے کندھوں سے ہلایا تو وہ چلا اٹھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے..... نہیں..... ہرگز نہیں..... یہ جھوٹ ہے سب جھوٹ ہے۔" وہ بنا کسی مروت لحاظ کے بولنے لگا۔ اس کی آواز اونچی اور اونچی ہوتی چلی گئی۔

"زیاد میرے بچے..... کیا ہو گیا ہے تجھے۔ ثوبانہ ایک حقیقت کی طرح ہمیشہ سے ہمارے درمیان موجود رہی ہیں۔ تمہارے دو بھائی ہیں تم تو قسمت والے ہو۔" فاطمہ بی بی گھبرا کے اسے تھامنے لگیں۔

"نہیں ہے کوئی میرا بھائی اور جہنم میں جائے یہ سارہ بھی۔ مجھے نہیں کرنی اس سے شادی۔" وہ دھاڑا

ہوا وہاں سے نکل گیا۔

جبار خان نے ربیط کو فون کر کے اس کے پیچھے جانے کو کہا کہ اس وقت وہ بہت بری حالت میں تھا۔ اسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہ تھا۔ عمر خان سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ ان کی اولاد کو یہ سن کے شاک لگے گا مگر اتنا خوفناک رد عمل..... انہیں توقع نہ تھی۔

ابھی زیاد خان کو یہ سن کے اتنا صدمہ ہوا ہے اگر اسے پتا چل جائے کہ اس کی اور سارہ کی شادی ایک معاہدے کی بنیاد پہ ہو رہی ہے تو وہ تو پاگل ہو جائے گا۔ فاطمہ بی بی کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

ادھر زیاد خان پہ ایٹم بم گرا تھا۔ وہ جنگل کی طرف نکل آیا۔ اس کے ذہن میں دو ہی نام گھوم رہے تھے۔

شمیلا..... اور..... فیض..... محبت..... ملالئی..... بھائی..... بہن..... محبت..... محبت..... گندگی..... گناہ..... کیا ہے سب..... میں نے اسے اس کی لیے تڑپتے دیکھا ہے' سنا ہے۔ کیا کچھ اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے سے نکلنے سے انکاری تھا۔ ربیط اپنی سی کوشش کر چکا تھا۔ یہاں تک کے اس نے شادی سے بھی انکار کر دیا تھا۔

بارات میں ایک دن تھا۔ نیچے ہال میں رسمیں ہوتی تھیں۔ جب وہ کمرے سے نہ نکلا تو فاطمہ بی بی کو خود ہی آنا پڑا۔ دروازہ بجا کے آئیں تو وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ فاطمہ بی بی کو دیکھ کے کھڑا ہونا چاہا تو لڑکھڑا گیا۔

"نیچے آؤ سب انتظار کر رہے ہیں۔"

"اماں! پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا ہے۔" اس کا انداز فاطمہ بی بی کو چونکا گیا۔

"کیا چھپا رہے ہو تم مجھ سے....."

"اماں..... ملالئی کو یونیورسٹی میں ایک لڑکے سے محبت ہو گئی ہے اور اسے بھی" وہ اس اذیت سے نکلنا چاہ رہا تھا۔

"تو ایسا کون سا گناہ کر ڈالا ہے اس نے' سوائے باپ اور بھائی کے نقش قدم پہ چلنے پہ..... تم مرد تھے اس لیے بری ہو گئے اور وہ لڑکی ہے اس لیے گناہ گار ٹھہرا دی تم نے۔" وہ تلخ ہو گئی۔

"اماں! ایسا نہیں ہے وہ..... وہ گناہ کبیرہ کی مرتکب ہو رہی ہے۔" اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچ لیں۔

"کیا مطلب....." وہ سمجھ نہ پائیں۔

"اماں! ہم نے ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا..... فیض اور شبیر نے ساری زندگی باپ کے بغیر کاٹ لی ہے۔ آگے بھی گزر جائے گی۔ مجھے سارہ سے بھی نہیں ملنا..... سب سے رشتہ توڑ دیں اماں....." وہ رو پڑا۔

"بچے! پہلے تم ملالئی کی بات کر رہے تھے اب تم سارہ اور فیض' شبیر کی طرف نکل گئے ہو۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔" فاطمہ بی بی کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہونے لگیں۔

"اماں ملالئی شہر میں جس لڑکے سے..... میرا مطلب ہے فیض..... دونوں یونیورسٹی فیلو....." ٹوٹا پھوٹا جملہ فاطمہ بی بی کو مکمل تباہی سے دوچار کر گیا۔

"ہائے میں مر گئی۔" انہوں نے اپنا دل کر تھاما۔

"اماں! خدا کے لیے خود کو سنبھالیں۔" زیاد نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"زیاد! میں ملالئی کو لے کے ندی والی حویلی چلی جاتی ہوں..... یہاں رہتے ہوئے یہ رشتہ چھپ نہیں پائے گا۔"

"اماں! ہم یہ رشتہ ان سے تعلق توڑ کے بھی ختم کر سکتے ہیں۔"

"وجہ کیا بتاؤ گے..... کیا اس کے بعد ملالئی باپ سے یا کسی اور سے نظریں ملا پائے گی۔" فاطمہ بی بی نے سمجھایا۔

"میں بابا جان کو ملالئی کے حوالے سے نہیں بلکہ اصل بات بتاؤں گا کہ انہوں نے آپ سے کیا منوایا

ہے۔" اس نے گویا بم پھاڑا۔

"نہیں۔۔۔ میں جو کہہ رہی ہوں وہ زیادہ بہتر ہے۔" وہ اپنے آپ کو سنبھال کر بولیں۔ "تو مجھ سے وعدہ کر' میری بات مانے گا۔"

زیاد خاموش رہا۔

☼ ☼ ☼

"میں تو یہاں بھی ہار گئی۔ کوئی رشتہ میرے لیے نہیں بنا۔ ماں باپ مجھ سے ناراض قبر میں اتر گئے۔ جس سے محبت کی وہ بھی دور ہو گیا۔ بیٹوں کی خوشی ملی تو وہ بھی نوکیلی تلوار کی طرح تمام عمر خوف زدہ کرتی رہی اور آج وہ خوف حقیقت بن کے سامنے آہی گیا۔ فاطمہ سے یہ غرور چھیننا چاہا کہ وہ عمر خان کے بچوں کی ماں مجھ سے پہلے نہ بن جائے مگر یہاں بھی میں شکست خوردہ ہی رہی۔

اگر جیتنا چاہتی ہوں تو فیض ہار جائے گا۔۔۔ اور اگر شکست تسلیم کرلوں تو یہ عمر بھر کی ریاضت بے کار جائے گی۔

کیا میں ماں ہوں۔۔۔ ماں تو فاطمہ ہے، جو زیاد کی خوشی کے لیے ایک لمحے میں سب کچھ ہارنے پہ راضی ہو گئی۔ مجھے کیوں سوچنا پڑ رہا ہے۔ یعنی ثابت ہو گیا کہ میں واقعی فیض کی ماں نہیں ہوں۔

ہاں۔۔۔ ہاں میں فیض اور شبیر کی ماں نہیں ہوں۔ میں نے انہیں جنم نہیں دیا۔۔۔ میں نے انہیں جننے کی اذیت نہیں سہی۔۔۔ وہ کسی اور کی اولاد تھے۔۔۔

میں صرف ان کی دایہ ہوں۔ میں نے صرف انہیں پالا ہے۔۔۔ میں نے جسے جنم دیا تھا اس نے تو چند سانسیں ہی میری گود میں لی تھیں۔۔۔ یہ دونوں بچے تو خدا نے میری ممتا کو تسکین دینے کے لیے میری گود میں ڈالے تھے اور میں نے انہیں دل سے لگا لیا۔ میرے مولا! تو جانتا ہے کہ میں نے صرف انہیں پیدا نہیں کیا' باقی ماں بننے کی ہر اذیت سے گزری ہوں۔ ان کے ساتھ میری سانسیں دھڑکتی رہی ہیں۔

میں اب کیسے انہیں اس حقیقت سے آگاہ کروں گی۔ ان کے معصوم دل دکھی ہو جائیں گے۔ کیا وہ مجھ معاف کردیں گے۔

وہ آہستگی سے اٹھیں اور الماری کھول کے اس سے وہ تصویر اور نکاح نامہ نکالا۔۔۔ کچھ چیزیں تمام عمر انسان دل کی خواہش کے خلاف بھی اپنے ساتھ لگائے رکھتا ہے۔ جیسے یہ تصویر اور نکاح نامہ۔۔۔ "کتنی دفعہ آپ نے کہا تھا اس ثبوت کو جلا دو۔۔۔ لیکن اللہ کا شکر ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ورنہ میرا فیض زندہ نہ رہتا۔

صبح وہ دونوں یونیورسٹی گئے تو ثوبانہ نے لائبہ کو بلا کے تمام بات بتادی۔

"تو پھر۔۔۔" وہ خدا کے نظام پہ حیران رہ گئیں۔ فاطمہ بی بی اور ثوبانہ۔۔۔ دونوں کو اپنی اولاد کی خاطر ایک مقام پہ آکے رشتوں کو تسلیم کرنا پڑا۔

"آپی۔۔۔ میں نے زیاد کو ساری بات بتادی ہے میں اپنی شرط سے پیچھے ہٹ گئی ہوں۔" ثوبانہ نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ کہیں لائبہ ناراض نہ ہو جائیں مگر وہ پرسکون ہو گئی تھیں۔ آخر یہ ان کی بھی بیٹی کی زندگی کا سوال تھا۔

"اچھا کیا ثوبانہ۔۔۔ اب ہمیں سب حقیقتوں کو تسلیم کرنا ہی ہے کہ رب نے ہمارے بچوں کی خوشیاں جو مشروط کردیں۔" وہ مسکرائیں۔

☼ ☼ ☼

رواج کے مطابق دلہن لینے مردوں کا ایک جرگہ ہی جانا تھا مگر یہ شہر کا معاملہ تھا اس لیے کچھ خواتین کو بھی جانا تھا۔ آرشین بیگم' بڑی بوبو جی اور دور پرے کی خاندان کی بڑی بزرگ ہستیاں اور۔۔۔

فاطمہ بی بی اور لالئی نے جانا تھا مگر لالئی کو جھٹکا لگا جب فاطمہ بی بی نے اسے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اپنے نہ جانے کے متعلق بتایا۔

"مگر اماں۔۔۔"

"آہستہ بول۔۔۔ خان کو نہ پتا چلے۔ مرد پہلے نکلیں گے تا' انہیں اندازہ نہیں ہو گا۔" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کے خاموش کیا۔

"ارے فاطمہ! باہر آؤ۔ دیکھو زیاد تیار ہو کے آگیا ہے۔" وہ کمرے میں کسی کام سے آئیں تو عمر خان بھی پیچھے آگئے۔

"بس آرہی ہوں۔" وہ مسکرائیں۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے یہ سوٹ تم پہ۔" وہ فاطمہ کو اپنے لائے ہوئے کپڑوں پہنے دیکھ کے بولے۔

زیاد اداس اداس سا نظر لگ جانے کی حد تک اچھا لگ رہا تھا۔ جاتے وقت ماں کے گلے لگا تو بے قابو ہو گیا۔

"اماں! ایک بات یاد رکھیے گا۔ داؤ مجھے بھی کھیلنا آتا ہے۔ اگر آپ اس حویلی سے گئیں تو ساریہ بھی کبھی اپنے والدین کی شکل نہیں دیکھ پائے گی۔"

فاطمہ بی بی زیاد کی بات سن کر دنگ رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"ماما! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔" شبیر اور فیض پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا یہ حقیقت جاننے کے بعد کہ وہ ان کی ماں نہیں ہیں۔ ابھی تو باپ ملا تھا اور اب ماں۔۔۔

"جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔۔۔ میں نہیں مانتا۔۔۔ اس جھوٹ کو۔۔۔ اگر ایسا تھا تو آپ نے ہم سے اس بات کو کیوں چھپایا۔" خلاف توقع فیض کے مقابلے میں شبیر کو اس تلخ حقیقت کو سن کے زیادہ تکلیف ہوئی تھی۔

"کیا تمہارا اس بات پہ ایمان نہیں ہے کہ خدا کے ہر کام میں کوئی بہتری ہوتی ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کے بولیں۔

"سب کو پا کے دل نے کتنی خوشیاں منائی تھیں۔۔۔ میں نے اور فیض نے ہر رشتے کو خدا کی دین سمجھ کے قبول کرلیا تھا مگر میں بھول گیا تھا کہ۔۔۔ بے نام و نشاں لوگوں کے دروازے پہ کسی نام کی تختی نہیں لگتی۔ انہیں تو قبر میں بھی لاوارث کہہ کے دفنایا جاتا ہے۔" اس کی باتیں ثوبانہ کا دل چیرنے لگیں۔

"شبیر کیا ماں صرف جنم دینے والی ہوتی ہے۔۔۔ میرے جیسی بدقسمت کو کبھی کوئی رشتہ نہیں ملتا۔۔۔ اور تم کیا جانو اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میرا فیض مر ہی جاتا۔" وہ شبیر کے پاس آکے بولیں تو وہ نم آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"اگر مجھے یہ خوشی نہ ملتی تو میں بھی یہ سوچ کے ہی مرجاتی شبیر! لیکن اللہ نے بدلے میں مجھے جو دیا ہے وہ میری ہر تکلیف کا ازالہ ہے۔" وہ فیض کو دیکھ کے بولیں جو ہمیشہ کی طرح تکلیف میں بالکل چپ ہو جاتا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔" دونوں ہی متوجہ ہوئے۔

"بدلے میں مجھے میری بہو شمیلا مل گئی ہے۔" انہوں نے فیض کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ ہمیں سمجھ نہیں پایا۔" فیض نے پوچھا۔

"شمیلا۔۔۔ عمر خان اور فاطمہ کی بیٹی اور زیاد خان کی بہن ہے۔ اسی بات نے تو مجھے یہ راز کھولنے پہ مجبور کیا ورنہ جو ہوتا' تم اس کا تصور کرسکتے ہو۔" ثوبانہ نے کہا تو فیض نے ایک لمبی سانس سینے سے خارج کی۔

"ماما! وہ نہ ملتی تو شاید سنبھل جاتا مگر یہ سچ ہوتا تو میں یقیناً "خودکشی کرلیتا۔" فیض نے کہا تو شبیر خدا کی اس مہربانی پہ سجدے میں گر گیا۔

"ماما! آپ کو کس نے بتایا کہ شمیلا بابا جان کی بیٹی ہے۔" شبیر نے پوچھا۔

"زیاد خان نے۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ یاد ہے فیض! وہ دن جب ساریہ اور زیاد دونوں یونیورسٹی آئے تھے تو ہم نے اسے شمیلا سے ملایا تھا۔۔۔ اوہ اللہ کا شکر ہے اس دن خان کا دماغ نہیں گھوما تھا ورنہ فیض! تیرے بچنے کے چانسز بہت کم تھے۔" شبیر کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ وہ مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

بارات آئی تو وہ دونوں ہی شمیلا کو تلاش کرنے لگے مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔

لائبہ نے آتے ہی تمام حقیقت زیاد اور زیاد نے عمر

خان کو بتادی تھی۔ انہیں شدید دھکا لگا۔ ثوبانہ نے ان سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ کسی اور کی اولاد کو ان سے منسوب کر دیا۔ ایک بار پھر ثوبانہ کی محبت انہیں دھندلاتی نظر آئی تھی۔

زیاد مسلسل فاطمہ بی بی کو فون ملا رہا تھا مگر ان کا موبائل بند مل رہا تھا وہ انہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ اللہ نے کتنا کرم کیا ہے۔ لیکن رابطہ نہ ہو پا رہا تھا۔

رخصت ہو کے ساریہ ثوبانہ عمر خان کے گھر آگئی۔ باقی جرگے والے وہیں سے گاؤں واپس چلے گئے۔

فیض اور شبیر نے زیاد خان کا کمرہ تازہ گلاب کے پھولوں سے سجایا ہوا تھا۔ پورا کمرا مہک رہا تھا لیکن اس کا دل اندر سے گھبراہٹ کا شکار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اماں اگر چلی گئیں تو بابا جان بہت سخت ناراض ہو جائیں گے اور بہت ممکن تھا کہ وہ اماں کو واپس لانے سے ہی انکاری ہو جائیں۔ ندی والی حویلی والے ان کے ناپسندیدہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ کاش میں اماں کو جانے سے روک دیتا۔ انہیں اپنے ساتھ آنے پہ مجبور کر دیتا۔ طرح طرح کی سوچیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ ربیط بھی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مرجانہ کے موبائل سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔

"چلو بچوں رات کافی ہو گئی ہے اب دولہا میاں کو بھی اپنی دلہن کے پاس جانے دو۔" ثوبانہ لان میں ان کے پاس آکے بولیں جہاں فیض، شبیر زیاد اور ربیط بیٹھے تھے۔

ان کا معاملہ حل کر کے جبار خان اور آرشین جان کو اوپر لالئی اور ربیط کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا کر اپنے کمرے میں آگئیں۔

"عمر! فاطمہ کیوں نہیں آئیں۔" دل میں احساس شرمندگی تھا سو ایک توقف کے بعد پوچھا۔

"مجھے بھی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پہلے وہ تیار تھیں آخر میں آکے انکار کر دیا۔ ابھی رابطہ بھی نہیں ہو رہا۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ثوبانہ۔۔۔ تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارے پاس فیض اور شبیر کے ماں باپ کا فوٹو اور نکاح نامہ ہے۔" وہ الجھے ہوئے تھے۔

"جی۔۔۔" ثوبانہ نے لفافہ ان کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے بے دلی سے تھام لیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی کھولا تو نکاح نامے پہ موجود معلومات نے انہیں ہلا کے رکھ دیا۔ فوراً "تصویر اٹھائی اور کوئی شک و شبہ نہ رہا۔

"کیا بات ہے عمر۔۔۔ کیا آپ پہچانتے ہیں اس تصویر کو۔۔۔" ثوبانہ عمر خان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے بولیں۔ وہ بغیر جواب دیے جبار خان کی طرف دوڑ گئے۔

"خان لالہ! یہ تصویر دیکھیں۔۔۔" وہ تصویر ان کے سامنے کرتے ہوئے بولے۔

"ارے یہ تو۔۔۔" کچھ توقف کیا۔

"جی بالکل یہ دلاور خان ہے۔۔۔ یہ دیکھیں نکاح نامے پہ سب لکھا ہے۔" عمر خان نے نکاح نامہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ ہمارا ہی خون ہیں۔" فاطمہ بی بی دلاور کی سیکنڈ کزن تھیں۔

"دیکھو عمر خان! خدا نے فاطمہ کے گھر والوں کو بھی دوبارہ جوڑ دیا ہے۔ تم کہاں تک بھاگو گے، خدا نے تمہیں پھر ان سے قریب کر دیا ہے۔"

عمر خان اس حقیقت سے منہ پھیر نہ سکے کہ زیاد کے محبت بھرے قدم نے پورے خاندان کو ایک کر دیا تھا۔ ساریہ کے قدم مبارک ثابت ہوئے تھے۔ صبح یہ حقیقت جاننے کے بعد فیض اور شبیر کے اندر یہ اطمینان اور مضبوط ہو گیا کہ وہ اسی خاندان کا حصہ ہیں بلکہ چھوٹی اماں کے ہی بھتیجے ہیں تو اور روح کو تسکین ہوئی۔ زیاد نے تو باقاعدہ نوافل ادا کیے کہ اگر اماں وہاں چلی بھی گئیں تو یقیناً" بابا جان اس پہ تھوڑا بہت تو ناراض ہوں گے مگر بات بگڑے گی نہیں۔

"عمر خان! خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ دیکھا خدا نے دلاور خان کو اولاد نہ دے کہ اولاد کی بے قدری کرنے کی سزا بھی دی ہے۔" جبار خان نے کہا۔

"لیکن کیسے۔۔۔ اللہ نے نوازا بھی ہے اور دلاور خان سے پہلے ہم نے جانا ہے کہ اللہ نے انہیں دو جوان خوب صورت بیٹوں سے نوازا ہے۔" عمر خان کے چہرے پہ ایک عجیب سی طمانیت تھی۔

☼ ☼ ☼

"دلاور لالہ! آپ نے جو فصل عرصہ دراز پہلے بوئی تھی آج اس کو کاٹنے کا وقت آن پہنچا ہے۔" فاطمہ بی بی بھائی کے سینے سے لگ کے یوں روئیں کہ وہ بھی خود پہ جبر نہ کر سکے اور بہن کے دکھوں پہ اس کے ساتھ رونے لگے۔

دلاور خان پتھر کے بت بن گئے۔ عمر خان نے گویا اس عمر میں آکے ان سے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب لے لیا تھا۔ دلاور خان آج اپنے فیصلے کا سوگ منانے لگے۔ سزا بھی تو آج ہی ملی تھی۔

پھر تو شمیلا بھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بابا جان کی حویلی چھوڑنے پہ قطعاً" تیار نہ تھی۔ اس نے اپنے لالہ کی دلہن کے استقبال کے لیے کیا کیا خواب نہ سجائے تھے۔ اسے اپنے بھائیوں کے سینے سے لگنا تھا۔ اس عورت کو بھی ماں کہنا تھا، جو تمام عمر ان کے بابا جان کے نام سے نام جوڑے بیٹھی رہی۔۔۔ اور اماں۔۔۔ کیوں اسے زبردستی وہاں سے لے آئی تھیں۔۔۔ حالانکہ بابا نے ایک دفعہ واضح طور پہ بتا دیا تھا کہ اگر کسی نے ندی والی حویلی سے رابطہ رکھا تو وہ بابا جان کے لیے مر جائے گا۔۔۔ تو کیا وہ اور اماں آج سے بابا جان کے لیے مر گئی تھیں۔ کیا اماں بابا جان کے ساتھ دوسری ماں کو برداشت نہیں کر سکیں اور سب چھوڑ آئیں۔۔۔ مگر یہ سزا میرے حصے میں کیوں آئی؟

"اماں! مجھے یہاں نہیں رہنا مجھے اپنے بابا جان کی حویلی جانا ہے۔" ملالئی ماں کا ہاتھ تھام کے حسرت سے بولی۔

فاطمہ بی بی اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگیں۔

"اماں! میں جانتی ہوں کہ یہ بات کوئی بھی عورت سہ نہیں سکتی ہے۔ جس سے محبت ہوتی ہے اس کی خاطر زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں اور آپ کو بابا جان سے بے پناہ محبت ہے، اس کی گواہی میں دوں گی۔" وہ بول رہی تھی اور فاطمہ بی بی اپنی کشتی کو طوفانوں سے نکالنے کی کوشش میں ناکام ہوتی جا رہی تھیں۔

"اماں! میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ مجھے اچھا لگا مگر میں نے اس کے ساتھ کوئی وعدے نہیں کیے۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس کا کوئی ارادہ ہے تو اپنے والدین کو بھیجے بس۔۔۔ اور اس دن بھی۔" وہ فاطمہ بی بی کی طرف دیکھے بغیر بول رہی تھی مگر جب نظریں اٹھیں تو فاطمہ بی بی کا سرخ انگارہ چہرہ اسے زیاد خان سے بھی زیادہ خوفناک لگا۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

"ملالئی میری ایک بات مانے گی۔۔۔؟" وہ چپ رہی۔

"تو عمر خان کی حویلی واپس جانے کے خواب دیکھنا بھول جا۔۔۔ ان خوابوں کی تعبیر تجھے لہو رلائے گی۔ تیری آنکھوں سے آنسو نہیں بلکہ سرخ خون نکلے گا۔"

"اماں! خدا کے لیے مجھے اصل بات بتائیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔

"اصل بات تو یہی ہے کہ تو زہر کھالے۔۔۔ مر جائے۔"

"کھالوں گی اماں! مگر مجھے میرا جرم تو پتا چلے۔"

"تیرا گناہ یہ ہے کہ تو نے انجانے میں ہی سہی جس کی طرف محبت بھرا ہاتھ بڑھایا ہے، اس سے تیرا رشتہ وہی ہے جو زیاد خان سے ہے۔۔۔ فیض عمر خان اور ثوبانہ کا بیٹا ہے۔" انہوں نے بالآخر خود کو اس بوجھ سے آزاد کر کے اسے کالے ناگوں اور بچھوؤں کے حوالے کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"وزرے! تمہاری خانم کہاں ہیں۔۔۔؟" واپس آ کے عمر خان کی نگاہیں اگر کسی کی متلاشی تھیں تو وہ فاطمہ بی بی تھیں۔

لالئی اور زیاد خان کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا گویا وہ وقت آ ہی گیا تھا جس سے وہ ڈر رہے تھے۔

"وہ خانم تو ملالئی بی بی کو لے کے ندی والی حویلی چلی گئی ہیں۔" عمر خان کی ذات کے پرخچے اڑ گئے۔ فیض اور شبیر نے آگے بڑھ کے انہیں تھاما اور ان کے کمرے میں لے آئے۔

ثوبانہ نے تڑپ کے زیاد خان کی جانب دیکھا گویا اس نے فاطمہ بی بی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر وہ انہیں کیا بتاتا کہ فیض اور شبیر کی حقیقت کھلنے میں دیر ہو گئی اور وہ اماں اور ملالئی کو جانے سے نہ روک سکا۔ اسے یقین بھی تھا کہ وہ بابا جان کو سب بتائے گا تو وہ راضی بھی ہو جائیں گے۔

آرشین بھابھی نے ساریہ کی رسمیں بے دلی سے کیں اور لالئی اور مرجانہ سے اسے اس کے کمرے میں پہنچانے کا کہا۔

"عمر خان خود کو سنبھالو یار۔۔۔"

فاطمہ بی بی نے ان کا مان توڑا تھا۔ وہ کس کس بات کا حساب فاطمہ بی بی سے لیتے۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے میں تمہارے سامنے جھکا بھی فاطمہ! مگر محبت میں عزت کی قربانی نہیں دی جاتی۔

"میں جرگہ بلواؤں گا۔" عمر خان نے بہت ضبط کے بعد کہا۔ جس نے سنا دل تھام لیا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ میری اماں۔۔۔" لالئی چیخ اٹھی۔

"ہائے میں مر گئی۔۔۔" آرشین بھابھی نے سینہ پیٹ ڈالا۔

"عمر! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔"

"خان لالہ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" عمر خان نے سختی سے کہا۔

"بابا! تو پھر جرگے میں صرف ایک ہی فیصلہ نہیں ہو گا۔۔۔ بلکہ آپ کی بڑی بیگم اور بہو کا بھی ہو گا۔۔۔ طلاق صرف میری ماں ہی کو نہیں ہو گی۔" زیاد پھٹ پڑا۔

"بکواس بند کرو تم زیاد خان اور جاؤ یہاں سے۔" جبار خان نے آگے بڑھ کے اسے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ "تم سب نے زندگی کو تماشا بنا رکھا ہے۔ جو کے منہ میں آتا ہے بکواس کرنے لگتا ہے۔ کوئی شرم کوئی لحاظ ہے تمہیں کسی رشتے کا۔ دونوں باپ بیٹا خدا بن بیٹھے ہو۔" وہ غصے سے ہانپنے لگے۔

"بابا۔۔۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک دفعہ میری بات سن لیجیے گا۔" زیاد خان عمر خان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"بابا جان! میری ماں بہت صبر والی ہے۔۔۔ اس کے دل نے صرف اپنے دکھ درد اور تکلیف ہی نہیں سہی بلکہ ہم سب کی اذیت کو اپنے وجود میں انڈیل لیا ہے۔" ساری حقیقت جاننے کے بعد عمر خان کچھ نہ بول پائے۔ انہیں فاطمہ بی بی کی اذیتوں کا پتا ہی نہ چل سکا۔

"جاؤ۔۔۔ زیاد مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مگر یہ بات یاد رکھنا کہ اگر فاطمہ کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹا تو پھر نہ ثوبانہ اور نہ ساریہ۔۔۔ کچھ نہیں بچے گا۔" وہ اتنا کہہ کے خاموش ہو گئے۔

"بابا! میں انہیں واپس لاؤں گا۔ آپ نے حوصلہ کرنا ہے پلیز۔۔۔ اور پھر ہماری ملالئی بھی تو ہے وہاں۔۔۔ میں خود جاؤں گا انہیں لینے۔" وہ عمر خان کی گود میں سر رکھ کے بولا۔

"جاؤ زیاد! ساریہ انتظار کر رہی ہو گی۔ اللہ بہتر کرے گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" وہ مستحکم لہجے میں بولے تو زیاد خان نے ایک ٹھنڈی لمبی سانس بھری۔

"ثوبانہ! تم نے بہت زیادتی کی ہے۔" ثوبانہ کمرے میں آئیں تو عمر خان شکوہ کیے بنا نہ رہ سکے۔

"عمر میں خود لینے جاؤں گی فاطمہ کو۔۔۔ ہاتھ جوڑ کے معافی مانگوں گی۔۔۔" ثوبانہ شرمندہ ہو کر بولیں۔ زیاد کمرے میں آیا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔

"آئی ایم سوری یار۔۔۔ دراصل بہت مسئلہ ہو گیا تھا۔۔۔ لیکن اللہ نے کرم کر دیا ہے۔" وہ اسے اپنی مضبوط پناہوں میں لیتے ہوئے بولا۔

"اب سب ٹھیک ہے تم ٹینشن نہ لو۔" وہ اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا

اس کی شہادت کی انگلی پہ بندھا ریشمی دھاگا دیکھ کے گنگنا اٹھا۔ "یہ دھاگا نانی اماں نے باندھا ہو گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور اب اسے مجھے کھولنا ہے تاکہ صبح سب کو پتا چل جائے کہ دلہن کا سنگھار ضائع نہیں گیا۔" وہ اس کو اپنی مخمور نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔ شرم سے ساریہ کی نظریں جھک گئیں۔ گالوں پہ چھائی سرخی زیاد خان کو مدہوش کرنے لگی۔

وہ اس کے قریب ہوا تو زندگی مسکرا اٹھی۔

☼ ☼ ☼

ماماجی کی حویلی کو چاروں جانب سے باغات نے گھیر رکھا تھا۔ وہ آموں کے باغ میں بیٹھ گئی۔ عام حالات ہوتے تو شاید وہ وہاں سے جلدی جانے پہ کبھی راضی نہ ہوتی وہ جب بھی ندی والی حویلی آتی۔ زیادہ وقت اسی باغ میں گزارتی۔

"ملالئی۔۔۔" کوئی اس کے کان کے قریب سرگوشی میں پکارا۔

"لالہ۔۔۔ لالہ۔۔۔" یقین نہ آیا کہ وہ سامنے مجسم موجود تھا۔ وہ بے یقینی کی حالت میں اسے چھو کے محسوس کرنے لگی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی۔

"لالہ! آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے جو مجھے تڑپنے کے لیے اس اذیت کے ساتھ زندہ چھوڑ دیا۔ نیکی کرتے، مجھے مار دیتے۔"

"اور پھر میں فیض کے ہاتھوں بیوہ ہو جاتی، تم اچھی ہمدرد ہو بھابھی کی۔۔۔" ساریہ آگے بڑھ کے بولی تو لالئی اس سے لپٹ گئی۔

"سنو اب رونا نہیں ہے اللہ نے سب ٹھیک کر دیا ہے وہ صرف تمہارے لیے ہے۔ اللہ نے تم دونوں کا جوڑ لکھ دیا ہے۔" ساریہ نے اس کے کان میں دھیرے سے کہا۔ وہ حیرانی سے ساریہ کی شکل دیکھنے لگی۔

"سب جان جاؤ گی بس اتنا جان لو کہ تمہاری محبت نے ہر بلا ٹال دی ہے۔" ساریہ کی باتوں سے کچھ اچھا ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

"اچھا اب جلدی سے ہمیں اماں کے پاس لے کے جاؤ کہ بہو صاحبہ نے سلام کرنا ہے۔" زیاد نے کہا تو وہ جلدی سے اماں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"اماں مجھے معاف کر دینا، میں نے حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے ساری تکلیف آپ کے سپرد کر دی۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

پھر اس نے تمام کہانی انہیں کہہ سنائی۔

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے زیاد۔۔۔ فیض اور شبیر میرے دلاور لالہ کے بیٹے ہیں۔" خوشی سے ان کی آواز تھرتھرانے لگی۔

"جی اماں۔۔۔ سب ثبوت موجود ہیں۔۔۔ دونوں کے برتھ سرٹیفکیٹ سمیت۔۔۔" دروازے میں کھڑی ملالئی کو لگا کہ آسمان سے جیسے پھول ہی پھول برسنے لگے ہوں۔ دل کو کچھ سکون میسر آیا تو زیاد نے سرشار لہجے میں کہا۔

"اماں! آپ باہر آئیں آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔" اور جب وہ باہر آئیں تو بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔

"ساریہ۔۔۔!" انہوں نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"ارے زیاد تجھے کسی نے روکا نہیں۔۔۔ نئی دلہن کو گھر سے باہر اتنی جلدی نکال دیا۔" وہ ناراض ہوئیں۔

"اماں اس نئی دلہن کی ہی فرمائش پوری کی ہے۔" وہ ہنسا۔

"اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے اور دین و دنیا کی ہر خوشی دے۔" انہوں نے ایک ہی دعا میں انہیں سب کچھ دے دیا۔

☼ ☼ ☼
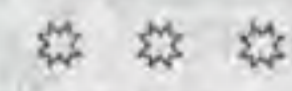
"عمر خان پسند کی شادی کر کے آیا تو تمہیں اور تمہارے خاندان کو یہ بہت بڑی بے عزتی لگی تھی، اس لیے تم نے ایک ایک مربع زمین رشوت دے کے منصفوں سے اپنی مرضی کا وہ ذلت آمیز فیصلہ کروایا اور عمر خان کی بیوی کو بے یار و مددگار شہر میں اس طرح سے پھینک آئے کہ وہ بے آسرا عورتوں کے مرکز پہنچ گئی۔

وہاں اس نے عمر خان کے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔۔۔ مگر اسی جگہ قدرت نے ۔۔۔ ایک اور لاوارث عورت کو دو جڑواں بچوں سے نوازا۔

اس عورت کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے بچے ثوبانہ عمر خان کے حوالے کردیے جائیں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنا نکاح نامہ' اپنی شادی کی تصویر' جس میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھی' وہ بھی حوالے کیں۔۔۔ ثوبانہ نے ان بچوں کو جنم نہیں دیا۔۔۔ باقی اس نے ان کی ماں ہونے کا مکمل ثبوت دیا۔ ان کی تعلیم و تربیت' انہیں زمانے کے گرم و سرد ہر صورت حال میں اپنے پروں تلے چھپائے رکھا۔

پتا ہے وہ بچے کس کے ہیں۔ ان کا باپ کون تھا؟" جبار خان آج عمر خان' زیاد' شبیر اور فیض کے ساتھ ندی والی حویلی آئے ہوئے تھے۔

"کک۔۔۔ کون جبار خان۔۔۔؟" دلاور خان نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"ان بچوں کے باپ تم ہو دلاور خان تم۔۔۔ تم نے یہ سب اس لیے کیا کہ جو سزا تم نے جرگے میں عمر خان اور اس کی بیوی کو سنوائی تھی اس سے کئی گنا زیادہ سزا مل سکتی تھی۔" ہر طرف ہی خاموشی چھائی تھی۔

"اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے دلاور خان! دیکھو ان بچوں کے علاوہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے پھر اولاد کی نعمت سے نہیں ۔ نوازا۔ ساری عمر اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بے اولاد رہے۔ اب بھی دعویٰ کرکے دکھاؤ۔۔۔ ہم بھی جرگہ بلائیں گے۔ دیکھتے ہیں کہ تم کیسے اپنے بچوں کو حاصل کرو گے۔" عمر خان نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

مگر دلاور خان کوئی حساب دیے بغیر ہی دل پہ ہاتھ رکھ کے ایک طرف جھک گئے۔ زیاد اور باقی سب بھاگ کے ان کی طرف بڑھے۔۔۔

"ہسپتال پہنچنا پڑے گا فوراً" ۔۔۔ ہارٹ اٹیک ہے۔" زیاد چلایا ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر سب ہسپتال دوڑے۔

عمر خان نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کہ اب ان سے رشتہ بہت قریب ہو گیا تھا فاطمہ کے بھائی اور فیض اور شبیر کے باپ سے بھلا کوئی دشمنی ہو سکتی تھی۔ کتنے ہی صدقے کیے گئے' کتنے ہی آنسو فیض اور شبیر کی آنکھوں سے بہے تب پانچویں دن ڈاکٹر نے حوصلہ افزا خبر سنائی۔

"دلاور خان! جب سب حساب ختم ہو گئے۔ تب تم نے ہمیں امتحان میں ڈالنے کی ٹھانی۔" عمر خان ہاسپٹل کے بیڈ پہ نڈھال پڑے دلاور خان کا ہاتھ تھام کے بولے تو وہ نقاہت سے مسکرائے۔

"عمر خان۔۔۔" ان کے ہاتھ کانپتے ہوئے اٹھے اور عمر خان کے سامنے جڑ گئے۔ "مجھے معاف کردو اور فاطمہ کو بھی۔ آج مجھ سے جو مانگو گے حاضر ہوں گا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بول رہے تھے۔

"دلاور خان۔۔۔ مانگوں گا تم سے کچھ۔۔۔ جب تم گھر جاؤ گے۔"

دلاور خان نے ربیط خان کو کہہ کے فیض اور شبیر کو بلوایا اور کتنی ہی دیر ان کا ہاتھ ہاتھ میں رکھا۔ یہ احساس کتنا خوش کن تھا کہ وہ دو جوان بیٹوں کے باپ تھے۔

"ثوبانہ بھابھی! ہمیں معاف کردیجیے گا۔" دلاور خان کی بیگم نے آگے بڑھ کے ثوبانہ عمر خان کے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بس کریں بھابھی! اب یہ سب بھول جائیں۔" ثوبانہ نے کہا اور ان کے گلے لگ گئیں۔

"ثوبانہ! ہم نے آپ کے ساتھ جو کیا' اس کی سزا ہم نے خود بھی سہی ہے۔"

"معافی کا معاملہ اوپر والے پہ چھوڑ دیں۔ اللہ نے اس حویلی کی خوشیاں لوٹا دی ہیں ۔۔۔ آپ کو آپ کے بچے مبارک ہوں۔" ثوبانہ کا اپنا دل یہ کہتے ہوئے رو پڑا اور ان کی آواز کا درد باقی سب کے دل بھی چیر گیا۔

یہ آسان تو نہ تھا کہ جن کے سنگ زندگی گزار دی' انہیں پل میں خود سے جدا کر دیتا۔

"نہیں بھابھی ۔۔۔ یہ آپ کے ہی بچے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہی رہیں گے ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ نے ہمیں بے نام نہیں رکھا۔" دلاور خان نے کہا۔

"لیکن یہ فیض کہاں ہے' وہ کیوں نہیں آیا۔" دلاور خان نے سب پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"دراصل وہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے شرم آرہی تھی۔" ثوبانہ مسکرا کے شہلا کو دیکھ کے بولیں۔

"شرم کیوں۔۔۔"

"بھئی' یہاں اس کی دلہن قبضہ جو جما کے بیٹھی ہے۔" اب کے انہوں نے ملالئی کو ساتھ لگالیا تو دلاور خان نے شبیر سے تصدیق چاہی۔

"کیا واقعی اسے ملالئی اچھی لگتی ہے۔"

"اف بابا جان! لیلیٰ مجنوں کی داستان ہے پوری۔" وہ باز نہ آیا۔

"اور تمہارا ابھی کوئی ہیر رانجھا والا قصہ تو نہیں ہے۔" وہ اسی کے انداز میں بولے تو حسرت سے آہ بھری۔

"ارے بابا جان ۔۔۔ نجانے کہاں کمی رہ گئی ماما کی تربیت میں۔" کہتے ہوئے وہ ثوبانہ کے ساتھ جا لگا۔

"ویسے دلہن تو بابا جان نے بھی لے کے جانی ہے مگر وہ تو نہیں شرمائے۔ دھڑلے سے آگئے ہیں۔" شبیر عمر خان کی طرف توپوں کا رخ کرتے ہوئے بولا۔ عمر خان کی نظریں فاطمہ بی بی کی طرف اٹھیں' جو اس پل انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

"میں اس لیے آگیا ہوں کہ مجھے اپنی بیٹی کو لے کے جانا تھا' جو میری اجازت کے بغیر آگئی تھی یہاں۔" گویا ناراضی بدستور جاری تھی۔

"عمر خان! اس بار انہیں ان کے بھائی خود اسی عزت و احترام سے چھوڑ کے آئیں گے جیسے باپ دادا کے گھر سے بیٹیاں رخصت ہوتی ہیں۔" دلاور خان نے بہن کا مان رکھا۔

"عمر خان تم اس دن کچھ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے کچھ مانگو گے۔"

"ہاں میں نے کہا تھا ۔۔۔ اور مانگنا بھی چاہ رہا ہوں۔"

"عمر خان! مجھے خوشی ہوگی۔" وہ شاید اس بندے کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا کچھ کفارہ ادا کرنا چاہ رہے تھے۔

"دلاور خان! میں چاہ رہا تھا کہ شبیر کا رشتہ اگر خان لالہ کی بیٹی مرجانہ سے ہو جائے تو۔" وہ جھجکتے ہوئے بولے تو دلاور خان ہنس پڑے۔

"عمر خان! میں نے ان کی ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوالیا۔ یہی بہت ہے۔۔۔ باقی ان کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار تم لوگوں کے ہی پاس ہے۔ ہاں ایک درخواست کروں گا کہ صرف ان کی شادیوں کے فرض مجھے ادا کرنے دینا کہ میں ان کے ساتھ اپنے رشتے کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔" دلاور خان نے حسرت سے کہا تو عمر خان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"عمر خان! فاطمہ کی غلطی کی معافی میں تم سے مانگتا ہوں۔" دلاور خان نے آخری بات بھی کردی' جو دل میں تھی۔

"فکر نہ کرو۔۔۔ وہ باقاعدہ احترام سے ہمارے ساتھ جائیں گی۔" عمر خان نے کہا تو انہوں نے پرسکون ہو کے آنکھیں بند کرلیں۔

بابا جان نے اسی جمعے کو زیاد خان کا ولیمہ طے کرلیا تھا اور اسی دن ملالئی کی فیض اور شبیر کی مرجانہ سے منگنی کا اعلان بھی ہونا تھا اور شادی پورے پندرہ دنوں بعد طے ہوئی تھی۔ عمر خان اور دلاور خان نے باہمی رضامندی سے یہ سب طے کیا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ سب سیٹل ہو تو وہ دونوں یونیورسٹی جائیں اور اپنی اسٹڈیز مکمل کریں۔ مگر اس سے پہلے ثوبانہ کی مکمل رضامندی سے فیض اور شبیر کو حویلی بھیج دیا گیا۔ انہیں اپنے بیمار بابا کی خدمت بھی تو کرنی تھی۔

"خان مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔" مسلسل نظر انداز کرنے پہ فاطمہ بی بی کو ہمت کرکے ان کے بیڈ روم تک آنا ہی پڑا۔

"آپ کو اس اذیت کا اندازہ ہے جو میں نے سہی ہے؟" وہ سخت لہجے میں بولے۔

"اور! آپ اس تکلیف کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس سے میں گزری ہوں؟"

"فاطمہ! آپ مجھ سے شیئر کر لیتیں تو ہم مل کے کوئی راستہ نکال لیتے۔" عمر خان فوراً" نرم پڑے۔

"میں نے تو زیاد اور آپ کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھرا میں نے جو سہا ہے آپ کی محبت میں اس کے مقابلے میں آگ کا دریا پار کرنا آسان تھا خان۔" فاطمہ بی بی نے پہلی دفعہ اپنی اذیتوں کا اقرار کیا۔

"تم ... حویلی سے جا کے مجھ سے سب اذیتوں کا بدلہ ایک ساتھ لے چکی ہو۔ اگر تم نہ لوٹتیں تو زندگی مجھے ایک دفعہ پھر وہاں لے جاتی جہاں سے میری اذیتوں کا سفر شروع ہوا تھا۔" عمر خان نے فاطمہ بی بی کو اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ نے اپنی انا کا جھنڈا پھر بھی نیچے نہیں ہونے دیا۔ کتنی شان سے میری خوش فہمیوں کو یہ کہہ کے توڑ دیا کہ آپ صرف اپنی بیٹی کو ہی لینے آئے ہیں۔" انہوں نے یاد دلایا تو اونچی آواز میں ہنس پڑے۔

"ارے اتنا ستانا بھی حق نہیں تھا... باقی میرے دل کی حالت اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے خود سے پوچھ لیں۔ میرے پاس تو کوئی گواہ نہیں ہے۔" وہ محبت سے بولے۔ فاطمہ جھینپ گئیں۔

☼ ☼ ☼

تو یہ تھی میری زندگی کی داستان... کیسے کیسے طوفان آئے اور گزرتے چلے گئے کچھ کی شدت کا اندازہ میں کر پایا اور کچھ کی مجھے ہوا بھی نہ لگی۔ اب جب سب اپنے اپنے مقام پہ پہنچ چکے ہیں شبیر بھی باہر ملک سے مرجانہ کی سرجری کروانے کے بعد خوش ہے۔ میرے فیصلے سے جو اسے دھچکا لگا تھا مرجانہ کی خدمت، وفا اور معصومیت سے پیار و محبت میں بدل گیا۔ اب تو مجھے پرسکون نیند آنی چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں اب بھی اپنے اندر ایک کسک سی پاتا ہوں۔ میری آزمائش تو اب بھی وہیں تھی۔

ثوبانہ میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت... اسے طویل مسافت کے بعد منزل ملی تھی۔ اسے اپنی محبت کو محسوس کرنا تھا اور اس میں وہ کئی دفعہ دوسروں کے جذبات کو بھول جاتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ فاطمہ میرے ساتھ ساری زندگی گزار چکی ہے اب اسے بھی میرے معاملات سنبھالنے کا اختیار ہے۔

وہ جانتی تھی کہ فاطمہ ایک عرصے سے عمر خان کا ناشتہ تیار کرتی تھی۔ مگر ثوبانہ نے یہ ذمہ داری اٹھائی اس لیے نہیں کہ مجھے فاطمہ سے چھیننا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ میری محبت کو محسوس کرنا چاہتی۔

"خان آپ کے کپڑے..." فاطمہ نے مجھے کپڑے لا کے دیے تو ثوبانہ نے اعتراض اٹھا دیا کہ عمر پہ یہ رنگ سوٹ نہیں کرتا۔

اس نے فاطمہ کے ہاتھ سے کپڑے لے کے الماری سے استری شدہ دوسرے کپڑے نکال کے میری طرف بڑھائے۔ مجھے فاطمہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کے افسوس ہوا تھا۔

"یہ تو سچ ہے کہ خان پر ہلکے رنگ بہت اچھے لگتے ہیں۔" فاطمہ نے بھی جھٹ حمایت کر ڈالی۔

"نہیں بھئی، آج تم دونوں کی پسند سے نہیں بلکہ میں اپنی پسند سے کپڑے پہنوں گا۔" وہ معاملہ میں نے اس طرح نمٹایا۔

ثوبانہ اکثر رات کو باتیں کرتے کرتے میرے کمرے میں سو جاتی۔ مگر فاطمہ کے چہرے سے اندازہ نہ ہوتا کہ اسے یہ برا لگا ہے۔

اب عمر کا وہ حصہ نہ تھا کہ نفس امتحان لیتا... اس معاملے میں تو تینوں کی زندگیوں میں تشنگی باقی تھی۔ بس ایک ساتھی کا سہارا پانے کی طلب تھی۔

مجھے کبھی کبھی لگتا زندگی میں بیک وقت دو محبوب بیویوں کے ساتھ انصاف کرنا سخت مشکل ہے۔

"خان اگر آپ اجازت دیں تو میں دلاور لالہ کی طرف کچھ دنوں کے لیے چلی جاؤں۔ بچے بھی سب آئے ہوئے ہیں اور شبیر کا وہ چھوٹا فیس تو بہت ہی یاد آتا ہے اور ملالئی کی طبیعت بھی آپ جانتے ہیں۔ ان دنوں بڑا حوصلہ ہو جاتا ہے۔" اس دن فاطمہ نے بہانے سے کچھ دن دور رہنا چاہا۔

"عمر... جانے دیں فاطمہ کو... میں ہوں نا۔" میں نے سوچنے میں تھوڑا وقت لیا تو ثوبانہ نے جھٹ کہا۔

"نہیں... ابھی جاؤ شام کو واپس آجانا فاطمہ... اور ثوبانہ! میرے فیصلوں میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہتر جانتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" پہلی دفعہ میں نے یہ لہجہ اختیار کیا تھا۔ ثوبانہ شرمندہ ہو گئی۔

"عمر... مجھے نہیں لگتا کہ تم دونوں میں انصاف کر پاؤ گے۔ وہ دونوں ہی انصاف کی حق دار ہیں... ثوبانہ نے ایک عمر تمہاری محبت میں گزاری۔ اس نے تمہاری خاطر بہت کچھ قربان کیا ہے۔ اپنے ماں باپ گھر بار حتیٰ کہ اپنی ساری عمر۔ وہ اب اگر تمہاری قربت اور سنگت میں رہنا چاہتی ہے تو کیا یہ غلط ہے؟" ایک دن جبار لالہ نے مجھ سے کہا۔

"فاطمہ نے بھی میری خاطر بہت کچھ سہا ہے، آج اگر ثوبانہ اس گھر میں ہے تو یہ فاطمہ کی اعلا ظرفی کی وجہ سے ہے۔" میں نے انہیں جواب دیا۔

"عمر خان! انصاف رکھنے کے لیے حق دار کے حق پہ سختی سے جم جایا کرو، چاہے وہ ثوبانہ ہو یا فاطمہ... تب ہی انصاف کی حرمت کو پا سکو گے۔ تمہاری تکمیل ان دونوں کے دم سے ہے۔ ثوبانہ تمہیں عمر اور فاطمہ خان کہتی ہے۔ تمہارے نامکمل پن کو وہ دونوں ہی مکمل کر سکتی ہیں۔"

ثوبانہ کو بھی اب زندگی مزا دینے لگی تھی۔ اب اسے کوئی خدشہ نہ ہوتا۔ یہ گھر اس کا اپنا تھا۔ مکمل حکمرانی تھی۔ زیاد خان اور ساریہ نے گھر کو جنت بنا لیا تھا۔

دوسری طرف فاطمہ کے چہرہ پہ بھی عجیب سی طمانیت تھی۔ فیض، شبیر مرجانہ، ملالئی دلاور لالہ ہر دوسرے دن آجاتے یا اسے آکے لے جاتے۔

"بابا جان کیسے دو دو بیگمات کو اتنا خوش رکھتے ہیں ہم سے تو ایک بھی نہیں سنبھالی جاتی۔" اس روز شبیر نے شرارت سے کہا تھا۔ اس کی بات پر سب مسکرا دیے تھے۔

"اس راز کی کنجی میرے پاس ہی رہنے دو۔ یہ نہ ہو کہ تم بھی ٹرائی مارنے لگو۔" میں نے بھی مذاقاً جواب دیا۔

"ارے توبہ کریں بابا جان! آپ نے جو بیگمات پسند کی ہیں ویسی بہت مل جاتی ہیں مگر میری بیگم جیسی ہے ہی نہیں دنیا میں کہ میں رسک لوں۔" وہ شرمانے والی مٹی سے تو بنا ہی نہیں تھا۔ مرجانہ کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا تھا۔

"اچھا تیری ماما اور اماں جیسی بہت ہیں اور مرجانہ جیسی کوئی نہیں، بہت نایاب ہے نا تمہاری بیگم۔" ثوبانہ نے اسے کان سے پکڑ کے کہا تو وہ بلبلا اٹھا تھا۔

مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آج اس باغ کا ہر پھول مسکرا رہا تھا۔ کالے بادل چھٹ چکے تھے۔ اداسی میں ڈوبے چاند کا کہر یکدم غائب ہو چکا تھا۔ ہر بلا رد ہو چکی تھی۔ خلوص دل سے مانگی ہوئی دعا اللہ کبھی نہیں ٹالتا کہ...

عشق دعا ہے... رد بلا ہے!

قانتہ رابعہ

منی واک کے لیے چار قدم چلنے نہ پائی تھی کہ اس کی سانس بری طرح پھول گئی۔ اگلا قدم اٹھانا اس کے لیے دو بھر ہو گیا۔ قریب ہی رکھے سنگی بنچ پر وہ دھپ کر کے بیٹھ گئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ پسینہ لگتا تھا جسم کا ہر مسام نل کی طرح بہہ نکلا ہے۔ سدرہ اور رافعہ نے چند سیکنڈ تو یہ سب دیکھا اور پھر پھٹ پڑیں۔

"منی! کمال کرتی ہو۔ آج تیسرا دن ہے اور رتی بھر فرق نہیں ہوا تمہارے ناز و انداز میں۔ نازک اندام شہزادی!"

"میں کیا کروں۔" منی روہانسی ہو کر بولی۔ "نہ کوئی مشقت کا کام ہوتا ہے نہ چلا جاتا ہے۔"

"تم صبح کتنے بجے اٹھتی ہو؟" دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔

"صبح جلدی اٹھنا چاہتی ہوں پر کیا کروں جیسے پورا وجود جکڑا ہوتا ہے۔ دو چار کروٹ بدل کر پھر لیٹ جاتی ہوں۔ نماز کے نام پر جو دو چار سجدے کر سکتی ہوں وہ بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے میرے لیے۔"

منی دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں تو یوں کہو ناں یہ سب دیر سے اٹھنے کی کرامات ہیں۔ ہمیں دیکھو صبح اٹھتے ہیں تو نماز اذکار کے بعد گھر کی چھت پر بھی چہل قدمی کے بعد چل سو چل..... صبح کا اٹھنا بڑا مشکل لیکن بابرکت ہوتا ہے۔" سدرہ بولی۔

"تو اور کیا۔ صرف برکت نہیں ہڈ جوڑ سب کھل جاتے ہیں۔ تم تجربہ تو کر کے تو دیکھو۔" رافعہ نے زور دیا۔

"کوشش تو کرتی ہوں پر کیا کروں..... سارا دن گدھوں کی طرح کام کر کے ہمت ہی کہاں ہوتی ہے۔" وہ مریل سی آواز میں بولی۔

"اف ایک تو تمہاری سسرال سے بڑا ڈرامہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اعلا پائے کا اداکار اور تم دونوں جہاں کی مظلوم بی بی!" سدرہ چڑ کر بولی۔ "جانے تمہیں سسرال میں رہنے کا سلیقہ کب آئے گا؟ ہر چھوٹے بڑے کو راضی کرتے کرتے اپنے آپ کو ختم کر لو گی مگر یہ سسرائیل کبھی نہ راضی ہو گی۔" نخوت سے اس نے ہونٹ سکوڑے۔

"مجھے دیکھو، سب کو ٹھکانے پر رکھا ہے۔ ہر آئے گئے سے اچھی طرح بولتی ہوں۔ حق حقوق بھی جہاں تک ہو سکتا ہے، ادائی کی کوشش کرتی ہوں مگر ذاتی زندگی میں مداخلت کی کسی کو اجازت نہیں، ایسے تو سارے ہی جوتوں سمیت سر پر چڑھ جائیں۔ اس لیے بڑے عیش میں ہوں۔ اپنی مرضی سے اٹھے، مرضی سے سوئے مرضی سے کام جتنا ہو گیا، مرضی نہ ہوئی تو مجال ہے کوئی کہہ سکے۔ ایک تم بے وقوف..... منکر نکیر جب قبر میں پوچھیں گے تم کون ہو؟ کہہ دینا سسرال کی پیاری..... عقل کرو عقل!"

منی بے بسی سے بولی "مجھ سے ایسے نہیں کہا جاتا..... میرا کون سا میکہ ہے جہاں چار دن رہ لوں گی اور دکھ بھول جاؤں گی۔ یہیں جینا مرنا ہے تو پھر چپقلش کا کیا فائدہ۔"

"آ..... آ آ.....!" سدرہ نے ایکٹنگ کی۔ "تو پھر مظلوم کیوں بنتی ہو؟ نمازیں جاتی ہیں جائیں..... صبح کو دن چڑھے تک سوؤ..... ہم تو بھئی آرام سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی تہجد کا ناغہ نہیں ہوا۔ نمازیں بھی پوری پڑھتے ہیں۔ بندے بھی خوش اور اللہ بھی خوش..... تم بیٹھی رہو۔ تمہیں کیا پتا صبح کتنا مزا آتا ہے جب ستاروں کی جھلملاہٹ میں رب کو پکارا جاتا ہے۔"

"اچھا بھئی بس کرو اب۔ بہت رات بیت گئی ہے۔"

رافعہ نے بے دلی سے کہا اور تینوں پڑوسنیں اکٹھی ہی اٹھ کر گھر کی طرف چل دیں۔ راستے میں خوب وعدے وعید ہوئے کہ کل صبح سے اسی پارک میں صرف دس منٹ کی واک کیا کریں گی اور بیس منٹ رات کو۔ تم جانے سے ہزار ہا بہتر ہے۔

"چلو ٹھیک ہے میں ان شاء اللہ ضرور آؤں گی۔" منی پرجوش ہو کر بولی۔ "کتنے بجے آؤں؟"

"صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی۔ مگر تمہیں کیا پتا فجر کی اذان کب ہوتی ہے۔" تھوڑے طنز اور تفاخر سے سدرہ نے کہا۔

منی شرمندہ ہو گئی۔ واقعی اسے علم نہیں تھا۔

"یوں کرو آج کل چار بجے فجر کی اذان ہو رہی ہے ہم سوا چار بجے پارک کے گیٹ پر ہوں گی۔ ٹھیک؟" رافعہ بولی۔

"بالکل ٹھیک.....!" منی نے خوشی سے کہا۔ اس کے جوڑوں کے درد کا علاج صرف واک میں تھا۔ جو اس کی نیند کی وجہ سے نہ ہو سکتی تھی۔ اب دونوں سہیلیوں کم پڑوسنوں نے غیرت دلائی تو اقرار کر بیٹھی..... رات خوب دعا کر کے سوئی۔

صبح ساڑھے تین بجے آنکھ کھلی۔ پہلے تو حسب عادت کروٹ بدلی پھر رات کا چیلنج اور وعدہ یاد آیا تو جلدی سے پاؤں نیچے اتارے۔

تاروں بھرا آسمان، چمکتا دمکتا چاند..... سناٹے میں عجیب سی لذت تھی۔ وضو کر کے دو نفل پڑھے لیکن اسے لگا یہ دو نفل ہی اس کی بتیس سالہ زندگی کا سرمایہ ہیں۔

رب سے قربت، لذت، معرفت، آگہی، آشنائی کا مزا تو انہی دو نفلوں میں ملا..... فجر کی نماز پڑھ کر وہ چادر لے کر گیٹ تک پہنچی..... موبائل پر نظر ڈالی۔ چار بج کر بارہ منٹ ہو رہے تھے۔ پارک کا فاصلہ ایک ڈیڑھ منٹ کا تھا..... جوتے پہن کر اس نے تیزی سے قدم بڑھائے..... آٹھویں دفعہ درود پڑھ رہی تھی کہ پارک

کے گیٹ تک پہنچ گئی۔ چند سیکنڈ بعد ہی رافعہ بھی پہنچ گئی۔۔۔ دو چار منٹ وہ وہیں کھڑی سدرہ کا انتظار کرتی رہیں، مگر سدرہ نہ آئی۔

"کمال ہے آج تک تو کبھی اس نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ پتا نہیں کیا ہوا۔" رافعہ نے پریشانی سے کہا۔

دونوں نے چار چھ منٹ واک کی لیکن بات چیت کی نوبت نہ آئی۔ بات سے بات، نکتے سے نکتہ نکالنے کی ماہر سدرہ تھی۔ ان دونوں کی نسبت منہ پھٹ اور حق گو بھی۔

بہر حال گھر پہنچے تو باری باری سب چھوٹے بڑے نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔ منیٰ کاموں میں جت گئی اور کاموں کے پہاڑ تلے اسے سدرہ کا نہ آنا یاد نہ رہا۔

دن کے دس گیارہ بجے اچانک اسے خیال آیا کہ حقوق ہمسائیگی میں سرفہرست تو حال احوال دریافت کرنا ہے۔ دو چار منٹ فراغت کے میسر تھے جلدی سے اس نے چادر گھسیٹی اور سدرہ کے گھر چلی گئی۔ سامنے والا گھر سدرہ کا تھا کافی منٹ وہ بیل بجاتی رہی۔ جنریٹر چل رہا ہے۔ آواز نہ پہنچ رہی ہو۔ قیافے، اندازے لگاتے لگاتے جب وہ واپس آنے کو تھی تو گیٹ کھلا۔ برے حال بانکے دھاڑے۔۔۔ نہ بالوں میں برش، نہ کپڑے پریس کیے۔ سامنے اجلی نکھری سدرہ کے بجائے پریشان حال سدرہ تھی۔

"کیا ہوا سدرہ! آج صبح پارک نہیں پہنچیں۔" اندر قدم رکھتے ہوئے منیٰ نے پوچھا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے ساری رات طبیعت بڑی بوجھل رہی ہے۔ نیند بھی نہ آئی۔ رات اڑھائی بجے کے قریب ہی آنکھ لگی تھی۔ پتا بھی نہ چلا کب فجر کی اذان ہوئی۔" لمبی جماہی پر قابو پاتے ہوئے سدرہ نے وضاحت کی۔

دو چار ادھر ادھر کی باتوں اور اپنے کامیاب طرز زندگی پر تعریفی کلمات سنانے کے بعد سدرہ کولڈ ڈرنک لانے کے لیے اٹھی مگر منیٰ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہ بھئی کوئی پینا پلانا نہیں چلے گا۔ میاں صاحب بریک میں آنے والے ہیں۔ ان کے لیے کھانا تیار ہے۔ ساس کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے جانے دو ہاں یہ بتا دو صبح پارک آؤ گی ناں؟"

"اف میرے خدایا، خدمت خلق کی ٹھیکے دار۔" سدرہ نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا مگر لہجہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

منیٰ خدا حافظ کہہ کر گھر آ گئی یاد ہی نہ رہا جانے کا وقت پوچھ لیتی۔

منیٰ کا سارا دن اچھا گزرا۔۔۔ رات سونے کے لیے لیٹی تو سدرہ کا میسج آیا ہوا تھا۔

"صبح تیار رہنا ہر صورت پارک جانا ہے۔ کہیں سسرال کی خدمت کرتے کرتے سب بھلا دو۔"

بڑی التجائیں دعائیں کرتے سو گئی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ آنکھ پھر ساڑھے تین کے قریب کھل گئی۔ آج اٹھنا بڑا آسان تھا۔ سارا وجود ہلکا پھلکا تھا۔ رات کو بازو سن ہونے کا بھی احساس نہ ہوا۔ آج تہجد کے نوافل کل سے بھی زیادہ اچھی طرح پڑھے گئے۔ خطائیں یاد کرتے کرتے وہ کئی بار روئی۔۔۔ کئی بار آنسو پونچھے۔

آج اسے صحیح معنوں میں آہ سحر گاہی کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ نماز کے بعد وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتی پارک پہنچی تو رافعہ موجود تھی۔ کل کی طرح دو چار منٹ انتظار کے بعد انہوں نے واک شروع کر دی۔ واک کے دوران کوئی خاص موضوع زیر بحث نہ آیا بس تسبیح اذکار میں ہی دس منٹ گزر گئے۔ دونوں گھر واپس آ گئیں۔

سہ پہر کے وقت کام والی ماسی نے خبر دی کہ سامنے والی سدرہ بی بی کے چوٹ لگ گئی ہے اور ہسپتال میں ہیں۔ رات گئے تک منیٰ نے کئی دفعہ پتا کروایا۔ بالآخر نو دس بجے کے قریب سدرہ گھر واپس پہنچی۔

گاڑی سے سدرہ کو میاں کے سہارے اترتا دیکھ کر کب کی رکی سانس بحال ہوئی۔ الحمدللہ بہت سیریس معاملہ نہیں ہوا۔ منیٰ نے مطمئن ہو کر سوچا۔

اگلے دن منیٰ اور رافعہ دونوں تیمارداری کے لیے حاضر ہوئیں۔ سدرہ کی ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور بیڈ پر لیٹی وہ خاصی نڈھال لگ رہی تھی۔ دونوں نے حتی الامکان اس کی دل جوئی کی۔ اس کے آنسو پونچھے۔ غیر اختیاری طور پر منیٰ کے منہ سے فقرہ برآمد ہوا۔

"میں نے تو رات تہجد میں تمہارے لیے بڑی دعا کی تھی سدرہ!" سدرہ نے حیرت سے زیادہ طنزیہ اسے دیکھا۔

"تم اور تہجد! تم تو گھوڑے گدھے سب بیچ کے سوتی ہو؟"

"نہیں بھئی واقعی یہ رات اٹھی تھی۔ ہم دونوں واک پر بھی گئی تھیں۔" رافعہ نے اسے جتایا۔

سدرہ نے دونوں کندھے اچکائے۔۔۔ جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"سدرہ! تم مکمل ریسٹ کرنا۔ کھانا میں بھجوا دوں گی۔" منیٰ نے پیشکش کی۔

"تم۔۔۔ ارے تم اپنی سسرال کے بکھیڑے تو نمٹاؤ۔" سدرہ نے پھر پلٹ کر حملہ کیا۔

"چلو چھوڑو۔۔۔ آج میں بھجوا دوں گی۔ کل منیٰ بھیجے گی۔ تم آرام کرو، جان بناؤ۔" رافعہ نے معاملہ رفع دفع کیا۔

✻ ✻ ✻

اگلی صبح پھر حیرت انگیز طور پر منیٰ کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔ آج اسے "سوئے جگ سنسار، جاگے رب پالنہار" کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ ہر چیز میں اسے عجیب سی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ وضو کرتے ہوئے ساری نیند اڑن چھو ہو گئی تھی۔ تسلی سے اس نے نوافل ادا کیے۔ آج اس کی آنکھوں سے ساری خطائیں پانی بن کر بہہ نکلی تھیں۔ دل پانی پانی ہو رہا تھا۔ زمین پر اپنا ماتھا کیا ٹکایا، سارے غم بھول گئی۔

واک کے لیے جاتے ہوئے اس کے قدم خود بخود اٹھتے چلے گئے۔

رافعہ بھی گیٹ کے باہر موجود تھی۔ دس منٹ کے بعد دونوں واپس آتے ہوئے، سدرہ کی صحت کے لیے دعا گو تھیں۔

✻ ✻ ✻

سدرہ کے پاس ہر دو چار دن کے بعد رافعہ اور منیٰ کا چکر لگ جاتا۔ پلستر اترنے میں تین ہفتے لگ گئے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پاؤں زمین پر رکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ پھر سے وہ زمین کو اپنے پاؤں سے چھونے کے قابل تھی۔ تاہم اب وہ حد درجہ محتاط تھی۔ پلستر تو تین ہفتے میں اتر گیا تھا، لیکن وہ اگلے چار ہفتے چھوٹے چھوٹے قدم ہی اٹھاتی رہی۔۔۔ رافعہ منیٰ دونوں بڑی تسلی دیتیں، لیکن ڈر اس کے اندر جمع ہو چکا تھا۔ دونوں کی ہمت بندھانے اور روزانہ دونوں کے علی الصباح واک کے تذکرے سن سن کر اس نے کہا۔

"منیٰ! میرا بھی دل چاہتا ہے میں تم لوگوں کے ساتھ جاؤں، پر مجھے ڈر بہت لگتا ہے۔ مسلسل اینٹی بایوٹک کے استعمال سے رات بس سونے جاگنے کی کیفیت میں ہی گزر جاتی ہے۔ کئی دفعہ تو فجر کی نماز بھی دن چڑھے نصیب ہوتی ہے۔۔۔؟"

"تو کوئی بات نہیں، جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو اپنی پرانی روٹین پر پہلے کی طرح ٹھونک بجا کر ہی آؤ گی۔" رافعہ نے ہنس کر کہا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے، رات کروٹوں میں ہی گزر جاتی ہے۔" شاید نیند کی کمی سے وہ بہت حساس ہو رہی تھی۔

"تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ہم تمہیں گلی کے دو چکر لگوا دیں گی، وقت بتا دو۔۔۔ رات میں یا دن کے وقت؟" منیٰ نے کہا۔

"رات میں تو تھکن بہت ہوتی ہے۔ صبح ساڑھے چار بجتے ہی میں گیٹ پر آ جاؤں گی۔" تھکے تھکے لہجے میں سدرہ نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے یہ اچھی بات ہے۔ تمہارا ذہن فریش ہو جائے گا۔" رافعہ نے کہا۔

لیکن اگلی صبح ساڑھے چار بجے وہ گیٹ پر نہیں تھی۔

رافعہ اور منی نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اب کیا کریں؟"

"رہنے دو۔ ایسا نہ ہو اس کی آنکھ ابھی لگی ہو۔" رافعہ نے کہا۔

منی نے سر ہلایا اور واک کے لیے قدم بڑھا دیے۔ وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھ رہی تھی اور واک پر جا رہی تھی۔ اس کی جسمانی صحت تو سب کو بہتر نظر آ رہی تھی۔ اپنی روحانی صحت کی بہتری اسے خود محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ اپنی قسمت پر شاکر تھی۔

چاروں طرف اسے اچھے لوگ مل رہے تھے۔ کسی کا اپنے مقدر پر صابر اور شاکر ہونا اس بندے کی ذہنی حالت، اعصابی قوت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ تقدیر پر راضی رہنے والا شکوے شکایتوں سے دور رہنے والا زندگی کو کارآمد بنانے کا ہنر جانتا ہے۔ سو اس کے پاس اب زندگی کا سب سے بڑا ہنر تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے چار چھ ہفتوں میں موسم خاصا تبدیل ہو چکا تھا۔ واک سے واپسی پر اسے درختوں کے پتے تالیاں بجاتے اور ہوا اٹھکھیلیاں کرتی محسوس ہوتی۔ واک پر ابھی رافعہ ہی جا رہی تھی۔ سدرہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہی رہتا۔ واک کے دوران کئی چہرے شناسا بھی نظر آتے اور ناشناسا بھی، وہ سلام کر کے تیزی سے واکنگ ٹریک پر چلتی رہتی۔

ایک دن مسز بیگ نے انہیں کچھ بند لفافے پکڑائے، پچھلے تین چار مہینوں سے ان سے علیک سلیک تو روزانہ ہی ہوتی تھی۔ اکثر کوئی نہ کوئی زیر بحث بھی آ جاتی...

وہ ایک اچھا معیاری اسکول تھا۔ تعلیم اور تربیت دونوں شعبوں کو بخوبی لے کر چل رہا تھا جو اکثر اسکولوں میں مفقود ہے۔

"یہ دعوت نامے ہیں نزہت بخاری کل ہمارے اسکول میں تشریف لا رہی ہیں ہم نے ان کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "سیلف گرومنگ" پر ایک اہتمام کیا ہے۔ آپ ضرور آیئے گا۔"

انہوں نے منی اور رافعہ کو دعوت نامے د[ئیے]
ہوئے کہا۔ دونوں نے نزہت بخاری کا نام سنا
لیکن بالمشافہ ملاقات یا لیکچر سننے کا موقع نہیں [ملا]
دونوں نے آنے کا وعدہ کیا اور ایک دعوت نامہ [سدرہ کے لیے]
بھی لے لیا۔ سدرہ کے سامنے دعوت نامہ رکھ [کر]
پوری تفصیل اسے بھی بتائی لیکن وہ کچھ بکھری [بکھری]
سی تھی۔

"پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے رافعہ! تہجد کے لیے [اٹھ]
سکتی ہوں نہ میں واک پر جا سکتی ہوں۔ گھر کے
دھندے بھی بس روٹین کے ہی ہوتے ہیں۔" [سدرہ]
نے کہا۔

منی نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "تو اسی لیے تو تمہیں
اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ سیلف گرومنگ [میں]
ہر کسی کو اپنی اپنی خامی کو ڈھونڈنے اور خوبی میں تبد[یل]
کرنے کا ہی تو بتایا جائے گا۔ تم ضرور چلنا، تم خود [بہتری]
محسوس کرو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پوری کوشش کروں گی۔" [اس]
نے کہا۔

"کوشش نہیں پکا وعدہ۔ ہم تمہیں لینے دو [بجے]
پہنچیں گے۔ تم گیٹ پر تیار رہنا۔" رافعہ نے آنکھیں
دکھائیں۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے وعدہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼
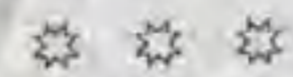
سلک کے ہلکے آسمانی رنگ کے سوٹ میں بھ[ی]
سدرہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے [پر]
زردی کھنڈ رہی تھی۔ دونوں کو دیکھ کر وہ ان کے ساتھ
چل دی۔

بالکل وقت پر پروگرام شروع ہو گیا۔ کافی بڑ[ا]
لائبریری ہال معزز خواتین شہر سے بھرا ہوا تھا... موضو[ع]
کے آغاز ہی میں بڑی جان تھی... نوٹس لینے وا[لے]
نوٹس لے رہے تھے۔ کچھ نے اپنے سیل فون [پر]
ریکارڈنگ بھی کی لیکن یہ تینوں غور سے سن رہی تھیں۔ ہر فقرہ ہر جملہ کسی نہ کسی کے حسب حال تھا۔ سب کا انہماک ظاہر کر رہا تھا۔ لینے والے کچھ لے کر ہی جائیں گے... جب سدرہ نے پہلو بدلا۔ رافعہ چونکی۔

نزہت بخاری نے رات کے وقت دن بھر کی کارگزاری چیک کرنے کی اہمیت بتائی۔ نزہت اپنے مخصوص لہجے میں بولیں۔

"یہ جو بچپن سے رٹے رٹائے لفظ اور اصطلاحات ہیں ہم بغیر غور و فکر کے ان کو سن کر اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہی لفظ اور اصطلاحات ہمیں آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ دن بھر کی کارکردگی کے بجائے اگر میں "اپنے اعمال" کا لفظ استعمال کرتی، چیک کرنے کی بجائے "محاسبے" کا لفظ بولتی تو کسی نے غور نہیں کرنا تھا۔ حالانکہ ہماری نیکی بدی کا انحصار ان ہی الفاظ پہ ہے... آپ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں... جب ہم صبح سویرے رب سے راز و نیاز کے لیے اٹھتے ہیں۔ یہ ہماری کسی خوبی یا اچھے کام کو سراہنے کی بنا پر ممکن ہوتا ہے اور جب نہیں اٹھ پاتے یا اٹھ کر بھی اپنے پیارے رب کو نہیں منا پاتے تو کان کھڑے کر لیں دن بھر کے اعمال میں کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہوئی ہے۔ آپ پوچھیں گی کیسے؟ تو سنیے! حضرت جنید بغدادی کا نام آپ سب نے پڑھا بھی ہو گا اور سنا بھی۔ وہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ان کے حلقہ درس میں ایک دفعہ کوئی نامی گرامی بدمعاش، جو سارے شرعی عیب اپنے اندر رکھتا تھا، شامل ہوا... درس دیتے دیتے حضرت جنید بغدادی کی نظر اس آدمی پر پڑی تو آپ چونکے۔

"ارے یہ اتنا برا آدمی اور یہاں۔" ابھی نہیں جب ان کے وعظ سے اس آدمی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو انہوں نے دل میں سوچا۔

"زمانے بھر کے گناہ کما کر اب کیسے آنسو بہا رہا ہے۔"

... درس ختم ہوا وہ آدمی مصافحہ کر کے رخصت ہوا لیکن اس رات حضرت جنید بغدادی کی تہجد کے لیے آنکھ نہ کھل سکی... سارا دن پریشانی سی رہی۔ اگلی رات پھر آنکھ نہ کھلی... اور اگر کبھی آنکھ کھلتی بھی تو کوئی مسئلہ ایسے آڑے آ جاتا کہ بارگاہ الٰہی میں اس وقت کے مقرب بندوں کی حاضری میں شامل نہ ہو سکے۔ معافی مانگی۔ توبہ استغفار کیا مگر تہجد کی توفیق نہ ملی۔ بالآخر کشف کیا... جواب آیا۔

"جنید! فلاں دن میرے بندے کو زندگی بھر کے گناہوں میں لتھڑا دیکھ کر تم نے کہا آنسو بہا رہا ہے... تم کیا جانو! ہماری توفیق سے اپنے کسی اچھے کام کے صلے میں وہ تمہاری مجلس میں پہنچا۔ جب ہم نے اس کے گناہوں کے زنگ کو دھو دھلا کر آنکھوں کے راستے نکالا تو تم نے کہا آنسو بہاتا ہے؟ جنید! یہ ہماری توفیق ہے، جسے چاہیں عطا کریں... جس سے چاہیں، چھین لیں۔"

جنید بغدادی کے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سجدے میں گر کر ایسی توبہ کی کہ اگلی رات ہی حاضری کا در کھل گیا۔"

"مجھے امید ہے آپ کی سمجھ میں بات آ گئی ہو گی..."

انہوں نے حاضرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور پروگرام کے آخری نکات پر بات شروع کر دی۔

پروگرام ختم ہوا... سب نے مسز بیگ کا شکریہ ادا کیا بلکہ دعائیں دیں۔

سب سے زیادہ حیرانی اور خوشی منی اور رافعہ کو ہوئی، جب اگلی صبح واک پر جاتے ہوئے انہیں غیر متوقع طور پر سدرہ پہلے سے تیار ملی... چادر میں لپٹی لپٹائی... پاکیزہ چہرہ... تازہ تازہ نوافل اور نماز کی بھی خوشبو محسوس ہو رہی تھی... البتہ خلاف مزاج سارے راستے اس نے کسی کی ذاتیات پر کوئی بات نہ کی۔ ادھر ادھر کی دو چار ہلکی پھلکی باتیں کر کے وہ کچھ پڑھتی جا رہی تھی۔

سدرہ کیا پڑھ رہی تھی؟ یہ پوچھنے کی کسی کو ضرورت تھی نہ حاجت... درود ابراہیمی ہو یا استغفار، رب کا ہی ذکر ہو گا... کیا یہ کافی نہیں۔

امایہ خان

رات ساحروں کے اعمال کی مانند سیاہ اور تاریک تھی۔ کسی ٹمٹماتے تارے کی روشنی کا نقطہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا آسمان پر۔ گہرا سناٹا کسی طوفان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے تمام پردے کھینچ کر برابر کر دیے اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

ابھی اس کی نماز ختم نہیں ہوئی تھی کہ کمرے میں کچھ سرسراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ نماز کی وجہ سے پیچھے مڑ کر نہ دیکھ سکی لیکن ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔
زبان ازبر آیات کو رٹے رٹائے سبق کی طرح پڑھنے میں مشغول رہی۔

ناولٹ

اس نے شہادت کی انگلی اٹھائی، پورے جسم نے گواہی دی بس ایک دل..... وہ خاموش رہا۔
سلام پھیرتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دہشت کے مارے اندر تک لرز گئی۔ اس کے کمرے میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے تھے۔ سیاہ چمکیلے سانپ۔ ایک دوسرے پر چڑھتے اترتے پورے فرش پر دندناتے پھر رہے تھے۔ دیواروں پر بھی اس کی تمام پورٹریٹس بھی ان لہردار اجسام کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ زمین پر رینگتے سانپ اس کی توجہ پاتے ہی اپنا پھن اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور جھومنے لگے۔ خوف کے مارے اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔ ایک سانپ رینگ کر نماز کے مقام پر پہنچ گیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے ڈس لیتا کہ اس نے زوردار چیخ مار کر آنکھیں بند کر لیں۔
کچھ دیر تک وہ یونہی کانوں پر ہاتھ رکھے آنکھیں میچ کر بیٹھی رہی۔ پھر کسی نے آہستگی سے اس کی کلائی

پکڑی اور ہاتھ کان سے ہٹا دیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو کمرا بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی سانپ نہ پھنکار نہ ہی سرسراہٹ۔۔۔ تو کیا میں خواب دیکھ رہی تھی؟ اس نے حیرت سے سوچتے ہوئے اپنی کلائی کی طرف دیکھا، جسے کوئی ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً گردن گھما کر دیکھا تو آنکھیں دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ خود اپنے سامنے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

کار کی مخدوش حالت سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔۔۔ یا تو وہ مر چکا تھا یا موت سے بدتر تکلیف میں مبتلا تھا۔ برائن نے کار میں بیٹھے ہوئے اندازہ لگایا۔

وہ اور اسمتھ سی ایچ پی (کیلی فورنیا ہائی وے پیٹرول) آفیسرز تھے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور جائے حادثہ پر پہنچے انہیں تھوڑا ہی وقت گزرا تھا۔ کار ایک طرف کھڑی کرنے کے بعد اسمتھ تو فوراً ہی اتر گیا تھا جبکہ برائن چاہتا تھا ایمبولینس کے وہاں سے چلے جانے کے بعد باہر نکلے جو زخمی شخص کو اسٹریچر پہ لٹا کر ہسپتال جانے والی تھی۔ وہ کمزور دل نہیں تھا۔ یہ اس کی جاب تھی مگر اس ہفتے میں تواتر سے ہونے والا یہ تیسرا ایکسیڈنٹ تھا۔

پہلے دو حادثے بھی اسی ہائی وے پر ہوئے تھے۔ سولہ سالہ فریڈی لائسنس نہ ہونے کے باوجود باپ کی SUV ہائی وے پر لے آیا تھا اور حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ دوسرا ایکسیڈنٹ اس سے زیادہ شدید نوعیت کا تھا۔ وہ گاڑی ٹرک سے ٹکرا کر ہوا میں اچھلی اور اس کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی کے اعضا سڑک پر بکھر گئے تھے جنہیں جمع کرنے کے بعد تشخیص کے لیے ان کے بچوں اور رشتہ داروں کے پاس لے جانے کی ذمہ داری برائن کے سپرد کی گئی تھی۔

اس کارروائی کی تکمیل کے بعد وہ تین راتوں تک سکون سے سو نہیں پایا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنا ذہن ان دل خراش مناظر سے ہٹا پایا تھا کہ آج ایک اور حادثہ رونما ہو گیا تھا۔ یہ بھی کوئی نوجوان لگ رہا تھا۔ برائن کار میں بیٹھا رہا، جب تک ایمبولینس روانہ نہیں ہو گئی۔ سائرن بجاتی ایمبولینس کے وہاں سے جاتے ہی وہ گاڑی سے اترا۔ Tow Truck کار کو سڑک سے ہٹانے کے لیے آ چکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے برائن جائے حادثہ کا پوری طرح جائزہ لینا چاہتا تھا۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا اسمتھ کے نزدیک آیا، جو ایک شخص کا بیان لکھ رہا تھا۔ اس نے وہ حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ بتانے لگا۔

"اس اسپورٹس کار نے اچانک ہی انڈیکیٹر دیے بغیر اپنی لین چینج کی اور دوسری لین میں پیچھے سے آتے تیز رفتار ٹرک کی ٹکر سے چکراتی ہوئی سڑک کے آخر جا کر الٹ گئی۔"

برائن نے پہلے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے سڑک کے کنارے الٹی کار کی جانب دیکھا، پھر ٹارچ آن کرتا کار کی طرف بڑھنے لگا۔ جس کا بونٹ کرش ہو چکا تھا اور دایاں حصہ لوہے کا پنجر نظر آ رہا تھا۔ ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے تمام شیشے چھوٹی چھوٹی کرچیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ برائن نے ٹارچ کی روشنی کار میں گھمائی۔ ڈرائیونگ سیٹ انسانی خون سے رنگی ہوئی تھی۔ پتا نہیں ایکسیڈنٹ کی وجہ کیا تھی؟ ذہنی دباؤ ڈرائیور کا نشے میں ہونا یا پھر موبائل پر گفتگو اور میسجنگ میں مصروف ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اب وہ اور اسمتھ مل جل کر اچھی طرح کار کی تلاشی لے رہے تھے۔ کار ٹوسیٹر تھی۔ برائن کو ایکسیلیٹر کے پاس میٹ میں پھنسا ہوا موبائل فون ملا، جس پر خون کے قطروں سے کرچیاں چمٹی ہوئی تھیں، اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر فون کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد آن کر لیا۔ آخری کال اب سے آدھے گھنٹے پہلے کی گئی تھی ساڑھے گیارہ بجے یعنی حادثے کے عین وقت شاید یہی وجہ تھی۔ برائن کو سخت افسوس ہوا۔ ذرا سی لاپروائی زندگی جیسی قیمتی شے سے محروم کر دیتی ہے مگر لوگ باز نہیں آتے۔ نوے فی صد کار کے حادثات اسی باعث ہوا کرتے تھے۔ اس نے آخری کال کا نمبر دوبارہ ملایا اور انگیج ٹون سن کر بند کر دیا۔ اسی اثنا میں اسمتھ ڈیش بورڈ سے تمام پیپرز نکال چکا تھا۔ جس میں ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود تھا۔ برائن نے اس کے ہاتھ سے لائسنس لے کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔

"معیز خان۔" ایک نہایت خوش شکل نوجوان کی تصویر کے ساتھ اس کا نام اور پتا درج تھا، جسے پڑھتے ہوئے اس کی نگاہوں کے سامنے خون میں لت پت وجود پھر سے آ گیا، جسے کچھ دیر قبل ایمبولینس لے کر ہسپتال روانہ ہوئی تھی۔ اگر یہ شخص بھی مر جاتا تو سات دن میں یہ چوتھی موت ہوتی۔۔۔ جس کا یقیناً برائن کو بہت عرصے تک افسوس رہتا۔ بظاہر آثار یہی دکھائی دے رہے تھے کہ وہ شخص زندہ نہیں بچے گا۔

☼ ☼ ☼

وہ عورت سر سے لے کر پاؤں تک ہو بہو اس جیسی تھی، رتی برابر فرق نہ تھا۔ ابھی وہ سانپوں کے غائب ہونے کے بعد ٹھیک طرح سے سکون کا سانس لے بھی نہیں پائی تھی کہ دل پھر سے اچھل کر حلق میں اٹک گیا تھا۔ بے اختیاری میں اس نے ہتھیلی کو زمین پر جما کر اپنا بوجھ اس پہ ڈالتے ہوئے پیچھے سرکنے کی کوشش کی۔ جہاں تک اسے یاد تھا، عبادت کے اس مقام پر کبھی بھی آئینہ نصب نہیں تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھا انسانی وجود اس کا عکس ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا تو لباس بھی مختلف تھا۔ وہ تو شاید اس پورٹریٹ سے باہر نکلی تھی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی سب سے حسین تصویر ہے۔ اس کا دل چاہا، وہ اسے چھو کر دیکھے کیا خبر یہ اس کا وہم ہو۔ پھر وہ رک گئی کہ ابھی تک کلائی پر اس کی گرفت کا احساس باقی تھا۔

"کون ہو تم؟" بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کر کے پوچھا تھا اس نے جس کا جواب ایک تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیا گیا۔ "میں تم ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اس عورت نے اس کی حیرت کا مزا لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ویسے تم اتنی حیران آخر کس وجہ سے ہو؟" بے نیازی سے اپنے ہاتھوں میں پہنی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے اس نے طنز کیا "ایسے بن رہی ہو جیسے خود کو پہچانتی ہی نہیں۔۔۔ کبھی آئینہ نہیں دیکھا کیا۔۔۔؟"

اب اس کا وہ بھلا کیا جواب دیتی۔ گونگوں کی طرح ٹکر ٹکر اسے دیکھے گئی۔ اس نے بھی کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر سرسراتی آواز میں گویا ہوئی۔

"مجھے غور سے دیکھو' میں تمہارا حسن ہوں' تم میری پرستش کرتی رہیں۔ تمہاری خواہش ہوں۔ جسے ہمیشہ تم نے مقدم رکھا' میرے آڑے آنے والی ہر رکاوٹ روندتی چلی گئیں۔ اور اب ایسے پیش آ رہی ہو جیسے مجھے جانتی ہی نہیں۔" پھر وہ غصے میں غراتی ہوئی بولی "مجھے دیکھ۔۔۔ میں تیرا تکبر ہوں۔۔۔"

یہ کہتی وہ اس کے عین مقابل آگئی تو اس نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اسے زوردار دھکا دیا اور عبادت کے مقام سے باہر نکل آئی۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ بے دلی سے ہی سہی' پر ان آیات کے ورد نے اس کی حفاظت کی تھی۔ ان سانپوں کو روک رکھا تھا اور ابھی وہ یہ سمجھ کر باہر آئی تھی کہ اپنے تکبر کو پیچھے دھکیل آئی ہے۔ جبکہ حقیقت میں خود اسے حصار پناہ سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔۔۔ اب وہ قطعی غیر محفوظ تھی۔

☼ ☼ ☼
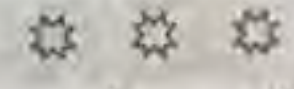
اس کا شمار دنیا کے ان چند لوگوں میں ہوتا تھا' جن پر خدا ہمیشہ مہربان رہتا ہے۔ مہرز اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور دنیا کی ہر نعمت اس کے قدموں میں ڈھیر تھی۔ اس کے باوجود وہ انتہائی منکسر المزاج اور حلیم طبیعت انسان تھا کیونکہ اس کے ماں باپ پڑھے لکھے اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خود بھی پڑھنے کا شوقین تھا۔ اسکول میں پوزیشن ہولڈر تھا اور انٹر کے بعد اس نے ملک کی مایہ ناز انجینئرنگ یونیورسٹی سے میکینیکل انجینئر کی ڈگری حاصل کی تھی' جس کے بعد اس نے امریکہ میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ ماجد خان' اس کے والد پہلے ہی اپنا کاروبار امریکی ریاست کیلی فورنیا منتقل کر چکے تھے اور اس کے مختلف شہروں میں ان کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز تھے۔ اس کے علاوہ بیکرز فیلڈ کنٹری سائیڈ پر ان کے فارمز بھی تھے' جہاں اعلا اقسام کے انگور کاشت کیے جاتے تھے۔ مائیکرو سافٹ میں جاب حاصل کرنے کے بعد مہرز باہر چلا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد اسے وہ جاب چھوڑنا پڑی۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والد زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے تھے۔

ان کی موت کے بعد اسے اپنی جاب اور اپنے کاروبار کے بیچ وقت کی تقسیم میں دقت پیش آنے لگی تو اس نے جاب چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی والدہ کو لے کر ایناہائم سے بیکرز فیلڈ منتقل ہو گیا۔ اس کے والد نے یہاں بھی ایک گھر خرید رکھا تھا۔ آس پاس کچھ اور مسلمان خاندان بھی آباد تھے' جن کے ساتھ جلد ہی مسز ماجد کے اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔

اس کے باوجود وہ اپنے شوہر کو بہت یاد کیا کرتی تھیں۔ مہرز نے ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا شروع کر دیا' مگر انہیں اپنے شوہر کے غم نے زیادہ دن جینے نہ دیا۔ ایک سال بعد وہ بھی انتقال کر گئیں اور مہرز اکیلا رہ گیا۔ اپنے اسٹورز کے تمام انتظامات کی دیکھ ریکھ کے لیے اسے آئے دن سفر کرنا پڑتا تھا' کبھی ایناہائم تو کبھی سان فرانسسکو' کبھی پاساڈینا اور کبھی سان ڈیاگو وہ ہر دم مصروف رہا کرتا تھا۔ بیکرز فیلڈ بہت سرسبز شہر ہے۔ اس کا گھر جس علاقہ میں واقع تھا' وہ قدرے اونچائی پر تھا۔ آس پاس بنے گھر ایک ہی لائن میں تھے۔ گھروں کے سامنے خوب صورت لان کے ساتھ تنگی فٹ پاتھ بنا ہوا تھا اور پھر کشادہ سڑک کو پار کرتے ہی گولف گراؤنڈ تھا۔ یہاں کا ماحول انتہائی پر سکون تھا۔ زیادہ شور شرابا اور افراتفری نہیں تھی۔ اس کے والد نے اپنی زندگی میں جیری بٹلر نامی ایک سیاہ فام ادھیڑ عمر آدمی کو ملازم رکھا تھا۔ جو ایک دیانت دار اور مخلص انسان تھا۔ ماجد خان کی مہربانیوں کے صلے میں وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں اور ان کے خاندان کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ مسز ماجد سے خود اصرار کر کے اس نے کچھ پاکستانی ڈشز بھی سیکھ لی تھیں۔ مہرز کے والدین کے انتقال کے بعد بھی اس نے یہ گھر نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ مہرز کا پورا خیال رکھا کرتا تھا۔ خود مہرز بھی جیری پر حد درجہ انحصار کرنے لگا تھا۔ جیری نے کبھی اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ گھر کی اچھی طرح حفاظت کیا کرتا

تھا۔

ایناہائم والا گھر ڈزنی لینڈ سے دس منٹ کی ڈرائیو پر واقع تھا۔ شہر کے اندرونی حصے میں بنا یہ گھر بھی کبھار ہی آباد ہوا کرتا تھا۔ جب مہرز اپنے اسٹور کے انتظامات دیکھنے یہاں آیا کرتا تھا۔ رضا سے دوستی ہو جانے کے بعد اس کے گھر بھی آنا جانا رہنے لگا۔ رضا کے والدین بہت اپنائیت سے ملتے اور اس کی بارہ سال کی چھوٹی بہن عنبر مہرز کو بھائی کہنے اور سمجھنے لگی تھی۔ مہرز اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اکثر رضا کے گھر چلا جایا کرتا۔ اگر نہ جاتا تو رضا خود اسے آ کر لے جاتا تھا۔

کل رات مہرز نے عید ملن پارٹی میں جس لڑکی کو دیکھا تھا' وہ اس کی پہلی چاہت تھی۔ وہ پہلی خواہش تھی جو اس کے دل نے کی۔۔۔ وہ پہلی دعا تھی جو اس نے رب سے مانگی تھی۔ پر وہ چاہت اسے مل نہ سکی تھی۔۔۔ وہ خواہش۔۔۔ وہ دعا پوری نہ ہوئی تھی اور یہ کسک آج بھی جان لیوا تھی۔

☼ ☼ ☼
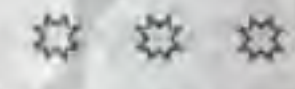
سرد دسمبر کی آخری تین راتیں باقی تھیں۔ اس کے بعد نیا سال شروع ہو گا۔ لیکن مجھے کیا؟ اس نے تیزی سے ہاتھ چلائے۔ کیا فرق پڑے گا؟ میری زندگی کون سا تاریخوں کے ساتھ بدلنے والی ہے' جیسی ہے ویسے ہی رہے گی۔ خاصا بے درد خیال تھا' جس نے سوجی ہوئی آنکھوں میں پھر سے نمکین پانی بھر دیا۔ اپنی ذات کے اس کمزور پہلو کا انکشاف اسے قدرے ناگوار گزرا' فوراً ہی بازو چہرے پر رگڑ کر آنسوؤں کو صاف کیا۔ "ہونہہ' بلاوجہ رونا آ جاتا ہے۔" اپنے آپ کو کوستی وہ پھر سے برتن دھونے لگی۔

شام سے لگی ہوئی تھی۔ نئے سرے سے سارا کھانا پکانے اور کھلانے کے بعد کچن صاف کرتے کرتے یہ وقت ہو گیا تھا۔ آج وہ خود ہی ذرا سست روی کا شکار تھی ورنہ اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ اب تو صرف چمچے باقی رہ گئے تھے۔ انہیں پانی سے دھوتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر جا رکی۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ باہر اندھیرا ہونے کے سبب کچھ صاف دکھائی تو نہیں دے رہا تھا مگر ہوا کے شور اور درختوں کے جھومتے ہیولے سخت موسم کا احوال سنا رہے تھے۔ آندھی آنے والی تھی۔ اس نے وقت دیکھا۔ بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ بارہ بجے لائٹ نے چلے جانا تھا۔

"بس یہ تھوڑے سے رہ گئے ہیں' انہیں دھو لوں پھر سو جاؤں گی۔" جانے کس سے مخاطب تھی۔

اور یہ کہہ کر گنگناتی ہوئی دوبارہ کام میں مصروف ہو گئی۔ اس کے پیروں کے ارد گرد پانی گر گیا تھا۔ حالانکہ سخت سردی کا موسم تھا مگر اس نے گھر میں رہتے ہوئے کبھی چپل نہیں پہنی تھی' سو اس وقت بھی ننگے پاؤں ہی کھڑی تھی۔ سنگ مرمر کے چکنے فرش پر کھڑے کھڑے پیر برف کی سل کی مانند ٹھوس ہو رہے تھے اور یخ پانی سے برتن دھوتے ہاتھ بھی شل ہو چکے تھے۔ متورم آنکھیں اب نیند کو بلاوے دے رہی تھیں۔ مگر وہ کام کرتی رہی۔

تمام برتن دھو لینے کے بعد انہیں پونچھ کر الماری میں رکھا۔ پھر وائپر سے فرش رگڑنے کے بعد اپنے ہاتھ صابن سے دھو کر انہیں دامن سے پونچھتی ہوئی کچن سے باہر چلی آئی۔ ساری روشنیاں بجھا کر اندھیرے ہال سے گزرتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک تیز ہواؤں کا شور بڑھ گیا اور ہال کی کھڑکیاں بج اٹھیں۔ اس نے پھرتی سے یکے بعد دیگرے تمام کھڑکیوں کے دھڑ دھڑاتے پٹ اچھے طریقے سے مقفل کر دیے۔

وسیع ہال کے وسط میں گھیردار زینے کی سیاہ پتھر کی تیرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سامنے تین کمروں میں سے ایک کمرا گیسٹ روم تھا۔ اس کمرے کی کھڑکیوں کا بند کرنا بھی ضروری تھا۔ اندھیرے کے باوجود وہ تیزی سے زینہ پھلانگتی ہوئی اس مستطیل کمرے تک پہنچ گئی' جس کے فالتو ہونے کی بنا پر شاید "رسماً" ان لوگوں سے منسوب کر دیا گیا تھا جو شاذ و نادر ہی اس گھر میں آتے تھے۔ قیام کرنا تو دور کی بات ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی بنگلے کا خوب صورت لان بگیٹ کے ساتھ سڑک اور پھر نہر کا کنارہ بخوبی دکھائی دے رہا تھا کہ پوری دیوار ہی شیشے کی تھی۔ جبکہ دونوں آخری سروں پر ہوا اور خوشبو کی آمد و رفت جاری رکھنے کی غرض سے بنائی گئی دو جالی دار کھڑکیاں نصب تھیں۔ شیشے کے پاس کھڑے ہو کر ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجے اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ دھیمے سے مسکراتی وہیں بیٹھ گئی۔ اسے بارش بہت اچھی لگتی تھی۔

سڑک کے ساتھ بنے فٹ پاتھ سے اتر کر نہر کے کنارے بید مجنوں اور سفیدے کے درختوں کی لمبی قطار تھی۔ بید مجنوں تو حسب عادت اپنے باریک پتوں کی جھالر نہر کے پانی میں ڈبوئے کھڑے تھے پانی کا بہاؤ ہر دم انہیں ساتھ لے جانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہ دن میں کئی بار دیکھ چکی تھی 'اب رات کے وقت بھی وہی نظارہ تھا مگر رنگوں کی تبدیلی نمایاں تھی۔ سفیدے کے بے شمار قد آور درخت اپنے مضبوط تنے کی طاقت پر نازاں 'فقط بالائی حصے ہوا کا ساتھ دیتے برابر جھوم رہے تھے۔ بڑھتی بارش کے ساتھ مٹی کی سوندھی خوشبو ہوا میں شامل ہونے لگی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اس بھیگی رات کا حصہ بن گئی۔

لیمپ پوسٹ کی روشنی میں نظر آتی نیالی سڑک دھل دھلا کر سیاہ رنگت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس نے شاید ارتکاز۔۔۔ کی غرض سے بائیں آنکھ کو انگلی کی پور سے بند کیا اور پھر کھلی آنکھ سے سڑک پر گرتی بارش کے قطروں کا بغور جائزہ لینے لگی۔ پھر اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ یہ عام پانی کے معمولی قطرے نہ تھے زمین کو ستاروں کی دید سے محروم رکھے جانے پر آسمان کا اظہار برہمی تھا کہ بادلوں کا سینہ چیر کر بہ قوت زمین کی طرف پھینکے جانے والے ستارے پاش پاش ہو رہے تھے۔۔۔ نہیں۔۔۔ تو پھر ہیرے ہوں گے تب ہی اس قدر جگمگا رہے ہیں۔۔۔ ورنہ بارش کے پانی میں اتنی چمک کیسے ہو سکتی ہے کہ آنکھوں میں چبھنے لگے اور شاید انہی ان گنت ہیروں کے چکنا چور ٹکڑے اڑ کر آنکھ میں چبھے تھے کہ اس نے فوراً" آنکھ میچ لی۔۔۔ درد سا ہو رہا تھا۔

وہ کچھ پل یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ پھر جیسے ہی دوبارہ آنکھیں کھولیں 'لائٹ چلی گئی۔ سڑک اندھیری ہو گئی۔ اب صرف پانی کی آواز تھی۔ ہیروں کی چمک نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ کمرے میں پہلے ہی اندھیرا تھا اور ویسے بھی اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔۔۔ مگر نہیں شاید صرف اس کمرے میں ڈر نہیں لگتا تھا' اسے ورنہ ویسے تو وہ ہر دم بس خوفزدہ ہی رہا کرتی تھی۔ یہ کمرا صرف انتہائی ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ایک بیڈ اور ٹیبل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی لیے بطور گوشہ عافیت اس نے اس جگہ کا انتخاب کر رکھا تھا کہ یہ سادہ سا کمرا اس عالی شان گھر سے اتنا مختلف تھا کہ اس کا حصہ ہی نہیں لگتا تھا۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اس کمرے سے دکھائی دینے والے منظر نے آسمان و زمین کی وسعتوں کو اس کی دسترس میں دے رکھا تھا۔ باوجود اس کے کہ زمین کچھ بیچ تنگ تھی اس کے لیے اور آسمان کھلا مگر جو بھی تھا غنیمت تھا۔

لائٹ چلے جانے کے کچھ لمحوں بعد تک تو سب کچھ غیر واضح تھا پھر جب آہستہ آہستہ آنکھوں کو اندھیرے سے انسیت ہو گئی تو بیرونی منظر اپنی جزئیات سمیت قدرے بامعنی نظر آئے۔ رات بالکل سیاہ بھی نہ رہی تھی۔ شاید بادلوں کے سبب جن کی عجیب سرمئی سی روشنی نے تاحد نگاہ آسمان کا احاطہ کر رکھا تھا کہ زمینی اجسام بھی وجود کھونے کے بجائے فقط سایوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تھوڑی بہت بجلی چمک جاتی تو لمحہ بھر کو نظر چندھیا جاتی اور پھر دوبارہ وہی سرمئی اجسام۔۔۔

مسلسل بارش نے خنکی میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر تو پہلے ہی ٹھنڈے برف ہو رہے تھے مگر زمین پر اتنی دیر تک بیٹھے رہنے کے باعث اب ریڑھ کی ہڈی میں بھی درد ہو رہا تھا۔ وہ کپکپاتے بدن کو

بانہوں میں سمیٹتی آہستگی سے اٹھی اور بستر پر رکھا کمبل اٹھا کر اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ کر دوبارہ قالین پر بیٹھ کر بارش دیکھنے لگی جواب ترچھی ہو کر شیشے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا رخسار کانچ کی دیوار سے اس قدر نزدیک کر لیا کہ ٹھنڈک اور نمی سے چہرہ تر ہونے لگا۔

اتنی کڑاکے کی سردی میں وہ بارش میں بھیگنے کا رسک تو نہیں لے سکتی تھی۔ مرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود خودکشی کی ہمت نہیں تھی اس میں اور وہ مرنا کیوں چاہتی ہے۔۔۔ اپنے دل کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ منتظر نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے جواب وہاں سے ملنے والا ہو۔۔۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی امید باندھے بیٹھی تھی کہ شاید وہ دیکھ پائے گی۔۔۔

خواہش اوقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ آگے پیچھے بہت سے لمحے سرک گئے اور نظر اس کی طرف ناکام پلٹ آئی۔

"آج بھی کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا۔" طنزیہ ہنسی خود کو بے عزت کرنے کے لیے تھی۔ تب ہی سرگوشی سنائی دی۔

"کوئی بات نہیں، تم نہ سہی پر وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اور وہ جانتا ہے کہ تم بے قصور ہو۔۔۔"

آواز دل کے پاس سے ہی ابھری تھی، شاید اس کی جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے مگر ضمیر اس تسلی دینے والے بحث پر آمادہ نظر آتا تھا۔

"نہیں، غلطی میری ہی تھی۔ میں نے انہیں غصہ نہ دلایا ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔۔۔" پر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ کوئی نہ کوئی وجہ مل ہی جاتی تھی انہیں، چاہے وہ کچھ کہتی یا پھر چپ رہتی۔

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔۔۔ باقی ماندہ جسم کی چوٹیں ہمیشہ سے قابل برداشت تھیں۔ کام کرنے کی عادت کی وجہ سے جسم کو سختی سہہ جانے کی عادت ہو چکی تھی۔ اس لیے زیادہ دقت نہیں ہوتی تھی لیکن زہر بھرے جملے ہر شب سیاہ ناگ کا روپ دھار۔۔۔ کے اسے ہراساں کرتے تھے۔ ابھی بھی اس کا آدھا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ کیا وجہ تھی؟ آج کا واقعہ اتنا غیر معمولی تو نہ تھا کہ پانچ گھنٹے گزر جانے کے باوجود درد کا احساس باقی ہے۔ وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جو یائے زخم کاری ہے

وہ دھیمے سروں میں گنگنانے لگی۔ بارش کے قطرے سادہ موسیقی چھیڑ رہے تھے۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اسے معلوم بھی نہ ہو سکا اور آنسو اس کے چہرے پر پھسلتے چلے گئے۔ آج شاید رو کر ہی دل ہلکا ہونا تھا۔ ورنہ اکثر تو گیت ہی مرہم بن جایا کرتے تھے۔ اشعار کی محفل میں ہر خیال مجسم صورت اس کے سامنے آ موجود ہوتا۔ درد ہو یا امید وہ اپنے جذبات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رات بسر کرتے اکثر اس خالی کمرے میں آ جایا کرتی تھی۔ اس کا اپنا کمرا۔۔۔ صرف صبح کے لیے تھا، ہر نئے دن کی شروعات وہیں سے ہوا کرتی تھی مگر رات۔۔۔ کو وہ یہاں بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ پھر اسے کسی اور کی موجودگی کا بھرپور احساس ہونے لگا۔ کوئی اور بھی ہے، جو رات کے اس پہر اس کی تنہائی میں شریک ہے اور جو کچھ بھی وہ سوچ رہی ہے، کہہ رہی ہے۔۔۔ اسے نہایت توجہ سے سن رہا ہے۔ اس لیے اب ہمیشہ وہ اسی سے مخاطب ہوتی اور اپنے تمام دکھ درد کہہ دیتی۔ حالانکہ وہ سب کچھ جانتا تھا، پھر بھی وہ کہتی رہتی۔ ہنستے روتے گیت گاتے اپنے دل کی ہر بات اسے جتاتی۔ اب بھی ہولے سے گنگناتے ہوئے وہ اپنے بالوں کی چوٹی کھولنے لگی۔

ہلکے ہاتھ سے بل کھولتے ہوئے اس نے اپنی انگلیوں سے گردن کو بھی سہلایا۔ درد کو تھوڑا آرام ملا تو وہ بار بار یہ عمل دہرانے لگی۔ تب ہی اس کے ہاتھ اکھڑے ہوئے ڈھیر بالوں کے گچھے میں الجھ کر رہ گئے۔ وہ حیرت سے اپنے ہاتھ میں آئے ٹوٹے بالوں کو دیکھنے لگی۔

"اوہ تو اس لیے اتنی تکلیف ہو رہی تھی۔"

شام کو کیا ہوا تھا؟ اسے یاد آنے لگا۔ جب ان کی ہر بات سے اختلاف کرتی وہ اٹھ کر جانے لگی تو انہوں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر اسے واپس اپنی طرف کھینچا تھا۔ اس کی چیخ نے انہیں اس کی تکلیف کا احساس دلایا تو پھر انہوں نے اس کے بالوں کو چھوڑا ہی نہیں۔ اسی طرح سر کو خوب جھٹکے دے کر چہرے پر ربڑ کی چپل مارتے ہوئے اسے بلبلاتے دیکھ کر انہیں تسکین ہو رہی تھی۔ جتنی تکلیف وہ انہیں دیا کرتی تھی، اس سے کہیں زیادہ سزا دینی تھی اسے۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ زبان بھی شعلے اگل رہی تھی۔

"کمینی ذلیل۔۔۔ زبان چلاتی ہے آگے سے۔۔۔ دیکھ اب کیا بولے گی بول؟" منہ پر چپلیں مارتے ہوئے بار بار اس سے یہی کہا جا رہا تھا۔ ہر مزاحمت چھوڑ کر وہیں کھڑی وہ مار کھاتی رہی۔ اب تو کوئی بچانے والا نہ رہا تھا۔ انہیں روکنے والے ہاتھ منوں مٹی تلے دب چکے تھے۔

خوب مار چکنے کے بعد بالآخر تھک کر انہوں نے اس کی جان چھوڑ دی اور کھانا لانے کے لیے کہا۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی کچن میں چلی آئی۔ شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک وہ کام کرتی رہی تھی۔ ہر روز اسی طرح کام میں خود کو الجھا کر اپنا وقت گزارنا آسان تھا۔ مار تو وہ اتنے عرصے سے کھاتی آ رہی تھی کہ جسم ہر درد سے عاری ہو چکا تھا۔ مگر وہ ان گالیوں اور کوسنوں کا کیا کرتی، جو اس کا دل چھلنی کر دیا کرتی تھیں۔ اب بھی اس نے گڑگڑا کر اپنی موت کی دعا مانگی تھی۔

"یا اللہ! مجھے اس تکلیف دہ زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دے دے۔ اب اس قید سے آزاد کر دے مجھے۔۔۔"

اور اس رات اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ دعا قبول کر لی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہریز خاموشی سے اپنے مشروب کے گھونٹ بھرتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ رضا کے گھر عید ملن پارٹی تھی۔ مسلم کمیونٹی کے بہت سے لوگ شریک تھے۔ دیار غیر میں اپنوں کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس محرومی کے ازالہ کے طور پر تمام پاکستانی آپس میں دیرینہ تعلقات بنائے رکھتے ہیں۔ مل جل کر ون ڈش پارٹیز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کبھی باربی کیو، کبھی سمندر کے کنارے پکنکس تو کبھی عید ملن۔ یوں کیلی فورنیا میں ہوتے ہوئے، بھلے کچھ دیر کے لیے ہی سہی ہم اپنے آپ کو پاکستان میں محسوس کرتے ہیں۔

رضا اور مہریز کی دوستی محض ایک اتفاق تھی۔ رضا نے نئی نئی ڈرائیونگ شروع کی تھی اور بے دھیانی میں مہریز کی پارک شدہ اسپورٹس کار کو زوردار ٹکر دے ماری تھی۔ مہریز اپنی کار سے کچھ قدم کے فاصلے پر ہی موجود تھا۔

رضا اس کی کار کو ٹکر مارنے کے بعد حواس باختہ ہو کر اپنی کار سے باہر نکلا اور منہ کھول کر ہنستے ہوئے مہریز کو دیکھنے لگا۔ اس کی کار کی پچھلی لائٹ توڑ دینے کے بعد وہ مہریز سے زبردست گھونسے کی توقع کر رہا تھا لیکن وہ۔۔۔

"آئم سوری میں نے۔۔۔" رضا نے منمنا کر معافی مانگنی چاہی تو مہریز نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ پھر بمشکل اپنی ہنسی روک کر اس سے گویا ہوا۔

"ایکچوئلی! یہ لائٹ خراب ہو چکی تھی۔ کل ہی میں اپنی کار کو مکینک کے پاس لے جانے کا سوچ رہا تھا۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ آج لے جاؤں گا۔۔۔ آپ پلیز اتنا شرمندہ نہ ہوں۔ اٹس اوکے۔"

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے رضا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ آج ان کی دوستی کو تین سال ہو چکے تھے۔ مہریز کے والد کے انتقال کے بعد جب وہ دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ رضا نے زبردستی اسے اپنے ساتھ ان ہی پارٹیز میں لانا شروع کیا تھا۔

لذیذ پاکستانی کھانوں کے ساتھ محفل موسیقی۔۔۔ یہ

دونوں باتیں رضا کے حوالے سے بہت مشہور تھیں۔ اسے آئے دن ایسی تقاریب منعقد کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے بہت سے دوست تھے۔ جبکہ مہرز کا حلقہ دوستی محدود تھا۔ ایک حسن تھا' جو لاہور میں رہتا تھا لیکن انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے میں رہا کرتا تھا۔ دوسرا دوست رضا' ایناہائم میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے اصرار پر مہرز اس کی زیادہ تر تقریبوں میں شرکت کرتا تھا۔ جس کی اہم وجہ رضا کی بے لوث دوستی کے ساتھ ساتھ محفل موسیقی بھی تھی۔

آج عید ملن پارٹی کی وجہ سے لوگ بھی کافی زیادہ تھے اور رضا اسے وقت نہیں دے پا رہا تھا مہرز بیکرز فیلڈ سے رش آورز میں ڈرائیو کرنے کے باعث تین گھنٹوں میں ایناہائم پہنچا تھا۔ اگلے دن ہفتہ تھا۔ اس کا ارادہ اتوار کی شام تک ایناہائم میں موجود اپنے گھر میں گزارنے کا تھا۔ کچھ گھنٹوں کے لیے اسے اپنے اسٹورز کا حساب کتاب چیک کرنے بھی جانا تھا۔ قریباً" ہر ہفتے ہی اس کا ایناہائم چکر لگا کرتا تھا اور ویک اینڈ اسی طرح تھوڑا کام اور تھوڑا آرام کرنے میں گزر جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اگلے دن کے معمولات کے بارے میں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اپنا مشروب ختم کر رہا تھا۔ تب ہی نگاہ ایک لڑکی پر جم کر رہ گئی۔

وہ لڑکی اپنی گود میں ایک ڈیڑھ سال کی بچی کو لیے بیٹھی تھی اور اسے کوئی نظم گا کر سنا رہی تھی۔ بچی بے حد خوب صورت تھی اور اس لڑکی سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ بس دونوں کی آنکھوں کا رنگ مختلف تھا۔ اس بچی کی آنکھیں نیلی تھیں جبکہ اس لڑکی کی ہلکی بھوری شہد رنگ چمک دار آنکھیں تھیں لیکن معصومیت دونوں چہروں پر یکساں تھی۔

"بالکل وہی چہرہ... ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔" مہرز کی نگاہوں کا مرکز وہ لڑکی تھی۔ باقی سب کچھ جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اس کی نگاہ کی مستقل تپش سے چونک کر لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا۔ مہرز جیسے یکدم ہوش میں آگیا۔ وہ خود کو ہرگز اس کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ انتہائی غیر محسوس انداز میں وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

غزل پروگرام شروع کرواتے ہوئے رضا کی نگاہیں مہرز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ ایسا نہ کرتا۔ اگر جانتا ہوتا کہ مہرز ایک گھنٹہ پہلے ہی وہاں سے جاچکا ہے۔

رات کو رضا نے اس کے سیل پر بار بار کال کی لیکن اس نے ریسیو نہیں کی تھی۔

اگلی صبح جب وہ سو کر اٹھا تو کچھ دیر بستر میں ہی لیٹا رہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذہن بار بار اس لڑکی کو سوچ رہا تھا۔

"مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔" خود کو سرزنش کرتا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور باتھ روم میں جاکر چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ آئینے میں اپنی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ پوری رات کتنی بے چین نیند سویا ہے۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور جسم بے تحاشا ست... وہ تو یہاں آرام کرنے آتا تھا۔ رت جگے مناتے نہیں۔

دوبارہ اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے پکا ارادہ کیا تھا کہ وہ اب اس لڑکی کے بارے میں نہیں سوچے گا۔

☼ ☼ ☼
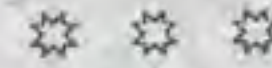
سر پر تیز چمکتے ہوئے' آگ برساتے سورج کی تپش تھی اور تاحد نظر پھیلا ہوا ویران صحرا آنکھوں کے سامنے تھا۔ جس کی جلتی بھنتی ریت پر چلتے چلتے اس کے پاؤں آبلوں سے بھر گئے تھے۔ ریت میں دھنستے ہوئے قدم اٹھانا بے حد دشوار تھا... وہ پھر بھی چلتی رہی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے کی کھال جھلس چکی ہے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ پیاس کے مارے برا حال تھا مگر وہ رکی نہیں۔ شاید کوئی سایہ نظر آئے' اس نے سوچا اور سائے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر دور دور تک بس صحرا تھا اور کچھ نہیں۔

اس نے پھر دیکھا تو اس بار اسے پانی نظر آگیا۔ وہ بے اختیار مسکرائی تو خشک ہونٹوں نے پھٹ کر خون جاری کر دیا۔ وہ بمشکل اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نظر آتے پانی کی سمت میں بھاگنے لگی۔ گرتی پڑتی وہ پانی تک پہنچنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی اور پانی تھا کہ اس سے نزدیک ہونے کے بجائے مسلسل دوری بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ رک گئی۔

بھاگتے بھاگتے اس کا سانس پھول چکا تھا۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اور جسم خشک لکڑی کی مانند چٹخنے لگا تھا۔ اس نے ہاتھوں کا چھجا بنا کر پانی کی طرف دیکھا اور مایوس ہو کر ہاتھ نیچے کر لیے۔ وہ سراب تھا' چمکتا ریت جسے پیاسا دور سے دیکھے تو پانی سمجھے۔ اس نے بھی یہی غلطی کی تھی۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی۔ کھولتی ریت اس کا بدن جھلسا رہی تھی۔ پر اب اسے کوئی پروا نہیں تھی... آگے جانا اس کے بس میں نہیں تھا... اب وہ اور نہیں چل سکتی تھی۔

گرم سانسیں تیزی سے اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا لیکن باوجود کوشش کے آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں ٹپکا تھا۔ وہ بھی خشک ہو چکی تھیں... بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی اور ہنستی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

مہرز کا سیل وائبریشن پر تھا' کئی بار تکیے کے نیچے لرزش ہوتی مگر وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اسے احساس نہ ہوا۔ رضا کا پریشان ہو جانا فطری تھا۔ دوپہر کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اس نے فوراً" مہرز کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بستر سے اتر کر ادھ مندی آنکھوں سے دروازہ کھولنے تک رضا نے بیل پر مزید دو ہاتھ دے مارے۔

"آرہا ہوں یار!" وہ جانتا تھا کہ رضا کے علاوہ اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے کے بعد مہرز نے ایک جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ رضا..." اس سے خفا ہونے کے باوجود رضا کو ہنسی آگئی۔ "جناب! مارننگ صاحبہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے رخصت ہو چکیں... دوپہر ہو رہی ہے۔"

"اچھا مجھے وقت کا پتا ہی نہیں چلا..."

رضا نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو سہلا رہا تھا۔

"تم کسی وجہ سے ڈپریس ہو؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہوں..." مہرز نے چونک کر سر اٹھایا۔ رضا کے چہرے پر فکر کی لکیریں دیکھ کر اس کی تسلی کے لیے تھوڑا سا مسکرا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "نہیں تو... ڈپریشن کیسا؟"

"پھر رات کو اس طرح بغیر بتائے کہاں چلے گئے تھے...؟"

رضا اس کا بہت اچھا دوست ہونے کے باوجود اس کے ماضی سے واقف نہیں تھا۔ مہرز نے سختی سے لب بھینچ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے روک لیا۔ رضا نے کچھ لمحوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن اس کی طویل خاموشی نے اسے سمجھا دیا۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو رہنے دو... میں اصرار نہیں کروں گا۔ مجھے تو صرف تمہاری خیریت نیک مطلوب ہے۔"

مہرز اس کی بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔ "تم کیا مجھے خط لکھ رہے ہو؟"

رضا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔ "اٹھو منہ ہاتھ دھو شیو کرو' شاور لو' جو کرنا ہے جلدی سے کرو' ماما نے کھانا بھیجا ہے کھا کر چلیں گے۔"

مہرز نے ابرو اچکائے۔ "کہاں؟"

"Toysrus۔ مجھے عنبر کے لیے گفٹ لینا ہے۔" رضا نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا۔ "اس کا برتھ ڈے ہے کل..."

"اوہ... سوری میں بھول گیا تھا۔" مہرز نے بے

اختیار اپنا سر پیٹ لیا۔

"کوئی بات نہیں..... ہم بس گھر پر ہی سیلیبریٹ کر رہے ہیں فیملی کے ساتھ بس تم ہی ہو گے....."

"پھر بھی میں ہمیشہ اسے گفٹ تو دیتا ہوں نا..... مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا۔" اس نے رضا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ٹوائزرس جا رہے تھے۔ رضا کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو کر مہریز رات والی لڑکی کو بالکل بھول چکا تھا۔ ہفتہ بھر کی تھکن اتر چکی تھی۔ گہری نیند لینے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑا تھا۔

رضا، مہریز کی اسپورٹس کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب وہ پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو مہریز نے ہنستے ہوئے اسے تنبیہہ کی۔

"یہاں کسی گاڑی کو مت ٹھونک دینا۔"

رضا بھی وہ دن یاد کر کے ہنس پڑا۔ "مجھے آج تک اس بات پر حیرانی ہے کہ تم نے غصہ میں آ کر میرا منہ کیوں نہیں توڑ دیا۔ تمہاری نئی اسپورٹس کار کی لائٹ توڑی تھی میں نے اور تم ہنس کر مجھ سے ہاتھ ملانے لگے تھے کیوں؟"

"مجھے تمہاری شکل دیکھ کر ہنسی آئی تھی۔ ویسے بھی مجھے کسی کو اس طرح شرمندہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔ جو پہلے ہی اپنی غلطی پر نادم ہو اس سے کیا کہا جائے..... سو میں نے تمہیں ریلیکس کرنے کے لیے تم سے ہاتھ ملا لیا۔" پھر وہ رضا کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ "اور ہاتھ ملا کر آج تک پچھتا رہا ہوں۔ چھوڑ دو میرا پیچھا۔"

"اب بھی نہیں..... اب اترو۔" کار پارک کرنے کے بعد رضا نے اسے اترنے کے لیے کہا۔ مہریز جیسے ہی کار سے باہر آیا۔ ایک اور گاڑی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی۔ ٹوائزرس میں کچھ دیر گھومنے کے بعد مہریز کو احساس ہوا کہ ایک شخص اور بھی ہے۔ جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ گیارہ سال بعد بھی نہیں.....

☼ ☼ ☼

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے، اک بات ٹھہر جائے

وہ اپنے کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل کے نیچے گھس کر اس نے کرسی کو ممکنہ حد تک اندر کھینچ رکھا تھا۔ اس کے خیال میں یہ سب کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ مگر دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ایک گہرا سانس اندر کھینچا تو فضا میں بکھری کافور اور اگربتی کی مہک سمٹ کر اس کی سانس میں شامل ہو گئی۔ ایک خوف سا رگ و پے میں سمانے لگا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا..... اب میں کیا کروں؟"

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے قرآن پاک کی تلاوت سنائی دینے لگی۔ نہ جانے کون تھا جو سورۂ یاسین قرأت سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کرسی کو آگے دھکیلا اور گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی میز کے نیچے سے نکل آئی۔ پھر اسی انداز سے چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچی اور کی ہول سے باہر جھانکا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

"اتنے سارے لوگ کیوں آ گئے ہیں ہمارے گھر میں..... میں نے تو بس تایا جان کو فون کیا تھا۔" وہ ڈر کے مارے وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور دانتوں سے ناخن چبانے لگی۔ عجیب سے ہول اٹھ رہے تھے۔ نہ سانس قابو میں آ رہی تھی نہ ہی دل کی دھڑکن۔

یکدم وہ اچھل پڑی..... دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"دروازہ کھولو رامین....." آواز مانوس معلوم ہوئی تو ہمت مجتمع کر کے اٹھی اور دروازہ کھول دیا مگر دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ ارد گرد کھڑے لوگوں کو نظر انداز کرتی ہال کے بیچوں بیچ اپنی ماں پر جا رکی۔ اسے حیرت ہوئی۔

"یہ اس طرح سب کے بیچ میں کیوں لیٹی ہوئی ہیں؟ اور یہ سفید کپڑے پہلے تو نہیں تھے ان کے پاس۔"

وہ سوچ میں گم میت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پھر کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنے آس پاس نظر دوڑائی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی اس کی دونوں پھوپھیاں کھڑی تھیں اور وہ دونوں روتے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن وہ ان کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس قدر شور تھا کہ ہر لفظ نے اپنے معانی کھو دیے تھے۔ وہ سب کو دیکھ تو سکتی تھی مگر سن نہیں سکتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک شیشے کی چار دیواری میں قید ہے، جس کے باہر ہونٹ ہلاتی مورتیاں کھڑی ہیں۔

پھر کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ اس کی بڑی پھپھو آمنہ بیگم تھیں، جو اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے اسے میت کے قریب لے کر جا رہی تھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح خاموشی سے ان کے ساتھ چلتی ہوئی اپنی ماں کے قریب پہنچ گئی پر جیسے ہی اس کی نظر اپنی ماں کے چہرے پر پڑی وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور مڑ کر اپنے کمرے میں واپس جانے لگی۔ آمنہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آمنہ بیگم نے دوبارہ انتہائی سختی سے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

"نہیں.....!" تو وہ ان کی منت پر اتر آئی۔

"پلیز پھپھو! مجھے جانے دیں....." اس کی خوف زدہ ہرنی جیسی آنکھیں دیکھ کر آمنہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اسی دم وہ بھاگتی ہوئی دوبارہ اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

لیکن اس دفعہ اس نے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ قدسیہ نے آمنہ بیگم کو اشارہ کیا اور دونوں بہنیں مل کر اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ فرش پر بیڈ سائیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا۔

آمنہ بیگم نے غور سے اسے دیکھا تو ان کا دل بھر آیا۔ اس کا حلیہ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ کپڑے انتہائی میلے، جن پر جا بجا چکنائی کے بڑے بڑے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ پیر کالے سیاہ اور ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، سوکھے ہونٹ الجھے بال اور چہرے پر خوف کی پرچھائیں۔

"کتنی پیاری ہوا کرتی تھی اور اب..... کیا حال ہو گیا ہے اس کا..... ہمیں اسے بھابھی کے پاس نہیں چھوڑنا چاہیے تھا....." انہیں پچھتاووں نے گھیر لیا۔ وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔ انہیں نزدیک آتا دیکھ اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئیں، پھر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"رامین..... گڑیا باہر آجاؤ....."

"نہیں....." اس نے ان کی بات ماننے سے فوراً انکار کر دیا۔ "اگر میں باہر گئی تو....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ آمنہ بیگم کے عقب میں قدسیہ پھپھو کو دیکھ کر اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ آمنہ بیگم کے نزدیک ہو کر ان کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ قدسیہ کو اس کی حرکت سے الجھن ہونے لگی۔ آخر ایسی کیا بات تھی، جو وہ ان کے سامنے کہنے سے اجتناب کر رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے نزدیک ہی بیٹھ گئیں۔ آمنہ بیگم نے اس کی سرگوشی کے جواب میں ترحم آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور بولیں۔

"تم گھبراؤ مت۔ وہ اب تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ مر چکی ہیں....." انہوں نے بہت مشکل سے کہا۔ رامین کا دل ایک لمحے کو سکڑ کر سمٹ سا گیا۔

"مر چکی ہیں؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"نہیں پھپھو! میں نے ابھی دیکھا ہے، ان کی آنکھیں ذرا سی کھلی ہوئی ہیں۔ وہ ایسے ہی سوتی ہیں۔ آپ پلیز انہیں اٹھائیں جا کر....." آمنہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا تو وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"جائیں پھپھو..... جا کر دیکھیں نا..... میں صحیح کہہ رہی ہوں..... وہ سو رہی ہوں گی۔ وہ مر نہیں سکتیں۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے مار کر مریں گی۔ پھر اکیلی کیسے مر گئیں.....؟" وہ بری طرح ان کا کندھا پکڑ کر انہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔ آمنہ بیگم نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنے لب کس کر بھینچ لیے اور دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ ان سے مایوس ہو کر رامین خود ہی اٹھی اور بھاگتی ہوئی میت کے پاس پہنچ کر اپنی مری ہوئی ماں کو جھنجھوڑنے لگی۔ "اٹھ جائیں پلیز..... اٹھیں نا ماما..... یہ لوگ کہہ رہے ہیں آپ مر گئی ہیں....." اس کے لاکھ جگانے پر بھی اس کی ماں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کی ماں کی رشتہ دار عورتوں نے زبردستی پکڑ کر اسے پیچھے ہٹایا۔ ایک بولی۔

"لگتا ہے اس کا دماغ الٹ گیا ہے..... صدمہ بھی تو گہرا ہے۔" دوسری عورت نے تاسف سے سر ہلاتے اسے تسلی دیتے ہوئے بٹھانے کی کوشش کی۔

"حوصلہ کرو بیٹے..... اپنی ماں دی مغفرت لئی دعا کر..... جان والے نوں اساں موڑ کر نئیں لا سکدے۔"

"ارے عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے..... آخری بار اسے اس کی ماں کا چہرہ دکھا دو....." نہ جانے کس کی آواز آئی تھی۔ پھر وہی عورت جو پہلے اسے زبردستی بٹھانے پر مصر تھی، اب اٹھانا چاہ رہی تھی۔

"چل آجا..... اخیر واری اپنی سوہنی ماں دا مکھ ویکھ لے....." مگر رامین اٹھنے کے بجائے وہیں جم کر بیٹھی رہی۔

"اس کا مطلب ہے..... ماما سچ مر چکی ہیں..... اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے ان کے مرنے کا دکھ ہے۔" وہ باری باری سب کی روتی شکلیں دیکھنے لگی۔ روتے ہوئے لوگ کتنی عجیب سی شکلیں بناتے ہیں..... وہ ایک ایک کی شکل دیکھتی سوچ رہی تھی اور پھر طیبہ خالہ کی شکل دیکھ کر تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

رونے والے اپنا رونا بھول کر حیرت سے اسے تکنے لگے۔ ان کے بدلتے تاثرات نے اسے کھل کر ہنسنے پر مجبور کر دیا..... اور وہ بے تحاشا قہقہے لگا کر ہنستی ہی چلی گئی۔

اس کا خواب سچ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جس کی ایک جھلک نے پوری رات اسے بے چین رکھا تھا، وہ لڑکی پھر اس کے سامنے تھی۔ مہریز ایک شاپ کے سامنے کھڑا تھا جب اس کی نظر بل چکاتی اس لڑکی پر جا رکی۔ اس وقت بھی وہی چھوٹی بچی اس کے ہمراہ تھی۔ رضا اپنی شاپنگ مکمل کر چکا تھا اس نے مہریز کو دیکھ کر اشارہ کیا تو اس نے جواباً ہاتھ کے اشارے سے پانچ منٹ میں آنے کا کہا اور شاپ کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس لڑکی کے اسٹور سے باہر نکلتے ہی مہریز شاپ کے پیچھے سے نکلا اور پے منٹ کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ عنبر کو دینے کے لیے اس نے ایک باربی فراری کار پسند کی تھی۔ اسے گفٹ پیک کروانے کے بعد اس نے اپنا والٹ کھول کر ایک نوٹ کیشئر کے سامنے رکھ دیا اور رضا کی طرف دیکھنے لگا جو ایک طرف کھڑا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ تبھی کیشئر نے اس کی توجہ دلائی۔ مہریز تھوڑا سا شرمندہ ہوا۔ اس نے فوراً وہ ایک ڈالر کا نوٹ اٹھا کر واپس اپنے والٹ میں رکھا اور پھر نہایت دھیان سے مطلوبہ رقم گن کر کیشئر کے حوالے کی اور اپنا باکس اٹھا کر رضا کے ساتھ کار پارکنگ کی طرف چلا پڑا۔

راستے بھر وہ رضا کی تمام باتوں کو بے دھیانی سے سنتا رہا۔ یہ کیفیت کچھ دیر کے لیے ختم ہوئی۔ جب وہ رضا کو مطمئن کرنے کے لیے زبردستی مسکراتا ہوا اسے اپنے گھر سے رخصت کرنے لگا لیکن اپنے خالی گھر میں داخل ہونے کے بعد کسی کو کھو دینے کا ملال پھر سے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا۔

اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ لڑکی آج بھی اول روز کی طرح اس کے ذہن و دل پر قابض تھی۔ حالانکہ سولہ سترہ سال کی عمر میں کی گئی محبت تو وقتی اثرات کی حامل ہوتی ہے جیسے پانی کی سطح پر ابھر کر معدوم ہوتے

بلبلے۔ کم از کم اس نے لوگوں سے یہی سنا تھا، اور یہی سمجھا تھا کہ وقت گزرتے ساتھ اس یاد کا زخم بھر جائے گا اور نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ پر جانے کیوں اس کا دل دنیا والوں کے تجربے کو غلط ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

اس نے ٹی وی آن کر لیا اور بے مقصد چینل تبدیل کرتا ایک میوزک چینل پر رک گیا۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو آمادہ کرنے لگا کہ اس لڑکی سے منسلک ہر وہ چیز یاد کرے جس سے مہریز کو دکھ پہنچا تھا۔ مگر ناکامی یہاں بھی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا، وہ بالکل بے بس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا خود کو یقین دلانے کے لیے کہ اس کی موجودہ کیفیت محبت، ہرگز نہیں ہے لیکن یہی جھوٹ دہراتے دہراتے وہ تنگ آچکا تھا۔ اگر وہ محبت نہیں تھی تو میں اب تک اسے کیوں یاد رکھے ہوئے ہوں۔ اگر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو اتنے سالوں بعد اسے دیکھ کر۔۔۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ شیشے کا سلائیڈنگ دروازہ کھول کر وہ اپنے کمرے سے باہر کے عقبی حصے کی طرف نکل آیا اور وہاں موجود سوئمنگ پول کے پاس رکھی کین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھک کر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ذہن ماضی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اتنی آسانی سے رہائی کیونکر ملتی؟

☼ ☼ ☼

تعزیت کرنے کے لیے آنے والوں کو جمگھٹا سوئم کے بعد کم ہوتا جا رہا تھا۔ آمنہ بیگم کی تین گھنٹے بعد فلائٹ تھی۔ وہ چند دنوں کے لیے بھائی کے پاس رہنے آئی تھیں کہ یہ سانحہ ہو گیا۔ عبید کے انتقال کے بعد اب رامین کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی موت کے ساتھ ہی سب گلے شکوے بھی دم توڑ گئے تھے۔ وہ رامین کے کمرے میں آئیں تو وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹی کنارے سے ہاتھ لٹکا کر زمین پر انگلیوں سے نادیدہ نقش و نگار بنا رہی تھی اس نے آمنہ کی آمد کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ وہ چلتی ہوئی اس کے نزدیک آئیں اور جھک کر الجھے بالوں میں چھپے چہرے کو اپنے ہاتھ سے سہلا کر اسے متوجہ کیا۔

"اٹھو رامین! مجھے کچھ دینا ہے تمہیں۔"

وہ بدستور اوندھی لیٹی اپنے پیر ہلاتی رہی۔ اس کا چہرہ پہلے ہی ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گدے کے کنارے اپنی ٹھوڑی ٹکا کر مسلسل زمین پر ہاتھ چلائے جا رہی تھی۔

"دے دیں۔" اسے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ آمنہ پھپھو اسے کیا دینا چاہتی ہیں۔ آمنہ نے ادھر ادھر دیکھا تو ڈریسنگ ٹیبل پر انہیں ایک ہیئر برش نظر آ ہی گیا۔ وہ ہیئر برش اٹھا کر اس کے پیروں کے پاس بستر پر بیٹھ گئیں۔

"لیٹے نہیں دے سکتی۔ پہلے تم اٹھ کر بیٹھو۔"

ان کے بیٹھنے کے باعث رامین کا پیر جھلانا موقوف ہو چکا تھا۔ اگر وہ پیر ہلاتی تو پھپھو کو لگ سکتا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ پھر اسے لگا کہ ان کا کہنا ماننا پڑے گا۔ اپنے بازوؤں کے بل وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ پھپھو کے چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ نظر آئی۔

"چلو، اب میرے پاس آؤ۔ پہلے تمہارے بال بناؤں گی۔"

رامین ان کے کہنے پر عمل کرتی ان کے سامنے بیٹھ گئی آمنہ نے پہلے اس کے بال سلجھائے، پھر انہیں سمیٹ کر چوٹی بنانے لگیں۔ وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ جس کے جواب میں رامین نے ہوں ہاں کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا تھا۔ بال اچھے طریقے سے بندھ گئے تو رامین پوری کی پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

"آپ مجھے کیا دینے والی تھیں؟" آمنہ بیگم نے اس کی یاد دہانی پر "فوراً" اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور اسے کھول کر کچھ جیولری نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تین ہیرے کی انگوٹھیاں، دو سونے کے کڑے اور نازنین کے نام والا لاکٹ اور چین۔

"یہ تمہاری ماما کے جسم سے اتارا تھا میت کو غسل دینے سے پہلے۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیے تھے۔ اب تم انہیں ان کی جگہ پر رکھ دو۔" پھر کہنے لگیں۔ "بلکہ ایسا کرو تم انہیں پہن لو۔" رامین جواب تک بے تاثر چہرے سے ان کی ہر بات چپ چاپ سن رہی تھی، یک دم کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

"نہیں۔ میں نہیں پہنوں گی۔" آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا، وہ ان زیورات کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے سامنے بستر پر وہ زیور ایک سیاہ سانپ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ چیخ پڑی۔

"پھپھو! اسے لے جائیں۔ یہ سانپ مجھے کاٹ لے گا۔" رامین بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"کیا ہوا رامین؟" آمنہ بیگم نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنا چاہا مگر وہ بار بار ان سے زیورات ہٹانے کا کہتی رہی۔ انہوں نے پلٹ کر وہ زیور بستر سے اٹھایا۔

"اچھا دیکھو میں لے کر جا رہی ہوں۔ تمہاری ماما کی دراز میں رکھ دوں گی۔ ٹھیک ہے۔ تم گھبراؤ مت۔ میں ابھی رکھ کے آتی ہوں۔"

اس وقت اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بحث کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ سیدھی نازنین کے کمرے میں گئیں سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر زیور اس میں ڈالا اور واپس رامین کے پاس پہنچ گئیں۔ اس کی نگاہیں دروازے پر ہی لگی تھیں۔ آمنہ بیگم نے اسے بتایا۔

"میں نے ہٹا دیا ہے وہ زیور۔ ٹھیک ہے؟"

رامین نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ آمنہ نے "فوراً" آگے بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اسے چومنے لگیں۔

"کیوں ڈر گئی تھی میری بچی! ہاں۔ کیا ہوا؟"

"پھپھو! آپ ماما کا سارا زیور یتیم خانے کو دے دیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

آمنہ نے حیران ہو کر اسے خود سے الگ کیا۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"پھپھو پلیز! آپ ان سانپوں کو گھر سے نکال دیں۔ ماما نے اس کی زکوٰۃ نہیں دی تھی۔ آپ یہ زیور لے جائیں یا اسے پھینک دیں۔ ڈونیٹ کر دیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھائی صاحب سے کہوں گی۔ تم جیسے چاہو گی ویسا ہی کر دیں گے، ٹھیک ہے؟ اب یہ رونا دھونا چھوڑو اور مجھے ہنستے ہوئے رخصت کرو۔ میں اب واپس جا رہی ہوں۔" وہ اس کا سر سہلانے لگیں۔

"کیوں؟ آپ کیوں جا رہی ہیں؟" رامین ان کے جانے کا سن کر واقعی پریشان ہوئی تھی۔

"تمہارے پھوپھا کا آپریشن ہے بیٹا! مجھے جانا ہو گا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں تو بس چھ دن کے لیے ہی آئی تھی کہ یہ سب ہو گیا۔" وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "میں کچھ مہینوں بعد دوبارہ چکر لگاؤں گی۔ پھر زیادہ دن رہوں گی تمہارے پاس۔ ٹھیک ہے؟"

رامین نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ کسی کو جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ اگر روک سکتی تو آج اکیلی نہ ہوتی۔ اسی وقت عمر نے کمرے کا دروازہ بجایا اور اندر آگیا۔ اس کے پیچھے قدسیہ بیگم بھی داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر رامین نے سر جھکا لیا۔ قدسیہ نے آمنہ کو دیکھتے ہوئے ایک ترچھی سی نظر رامین پر ڈالی تھی۔ عمر نے آمنہ سے کہا۔

"پھپھو چلیں۔ ڈرائیور گاڑی لے آیا ہے۔"

آمنہ بیگم نے اس سے اپنا سوٹ کیس گاڑی میں رکھنے کا کہا۔ وہ تین دن سے یہیں پر تھیں اور ان کا سامان بھی۔ عمران کا سوٹ کیس اٹھا کر چلا گیا۔ قدسیہ بیگم آمنہ سے بولیں۔

"چلیں آپا بیگم! بھائی صاحب سے مل لیں۔ پھر میں آپ کے ساتھ ایئرپورٹ چلوں گی۔"

آمنہ نے دھیرے سے سر ہلایا اور رامین کو الوداع کہتے ہوئے ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ انہیں رامین اپنے بچوں کی طرح عزیز تھی۔

شفیق الرحمان سے ملنے کے بعد وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئیں۔ قدسیہ بھی ساتھ تھیں۔ انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر انہیں اپنے گھر واپس چلے جانا تھا۔ ڈرائیور نے

گاڑی اسٹارٹ کی اور ایرپورٹ کے راستے پر ڈال دی۔ کچھ دیر بعد قدسیہ بیگم نے اپنے نادر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے رامین کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی تھوڑی ڈسٹرب ہے۔ لوگوں سے ملے جلے گی تو آہستہ آہستہ اس کا خوف کم ہو جائے گا۔" آمنہ بیگم نے بہن کو تاکید کرنا ضروری سمجھا۔ "تم آتی جاتی رہنا۔۔۔ خیال رکھنا اس کا۔"

قدسیہ نے ہنکارا بھرا۔ "میرے آنے سے کیا ہوگا؟ اسے تو آپ اچھی لگتی ہیں۔ ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتی بالکل اپنی ماں جیسی ہے۔" نازنین سے نفرت کا اظہار کرنا وہ ہمیشہ یاد رکھتی تھیں۔ آمنہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"شاید اسی لیے وہ تم سے گھل مل نہیں پاتی کہ میں اسے اپنے بھائی کی اولاد سمجھتی ہوں اور تم نازنین کی بیٹی سمجھ کر ملتی ہو۔"

"ماں کا اثر تو آتا ہے اولاد پر۔" قدسیہ نے کندھے اچکائے۔

"باپ کا بھی آتا ہے اور رامین بہت اچھی بچی ہے۔ سب کی بہت عزت کرتی ہے۔"

"خدا کو مانیں آپا بیگم۔۔۔ اب بچی کہاں رہی؟ پچیس کی تو ہو گئی ہوگی۔"

"میں عمر کی بات نہیں کر رہی' رشتے کی بات کر رہی ہوں۔ وہ ہماری بیٹی جیسی ہے۔۔۔ تم پیار کرو گی تو پیار پاؤ گی۔" آمنہ کو جب بھی موقع ملتا' وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ قدسیہ پر کیا اثر ہوتا تھا؟ وہ کچھ جاننے کے لیے بے چین تھیں' بالآخر پوچھ بیٹھیں۔

"ویسے۔۔۔ کافی دیر رہیں آپ اس کے کمرے میں۔ کیا کہہ رہی تھی رامین؟" آمنہ بیگم سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔ قدسیہ ہمیشہ سے کن سوئیاں لینے کی عادی تھیں۔

"وہ اپنی ماں کا سارا زیور ڈونیٹ کرنا چاہتی ہے۔" آمنہ نے سیدھے سادے لفظوں میں انہیں بتا دیا۔

"میں نے بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے۔ جو رامین کہے۔۔۔ کر دیجئے۔" قدسیہ کو اعتراض ہوا۔

"ایسے کیسے ڈونیٹ کر دے گی؟ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے۔"

"قدسیہ۔۔۔ نازنین کے زیور میں ہمارا حصہ کہاں سے بنتا ہے؟" آمنہ کو حیرت ہوئی۔

"کیوں نہیں؟ بہنوں کا بہت حق ہوتا ہے بھائیوں پر۔۔۔ ہمارے بھائی کا پیسہ تھا۔" قدسیہ اپنی ماں کی زبان بولی تھیں۔ آمنہ کو ان کی اس منطق سے ہرگز اتفاق نہیں تھا۔

"بھائی کی محبت پر بہنوں کا حق ہوتا ہے اس کے روپیہ پیسہ جائیداد پر نہیں۔۔۔ ہمارے بھائی کی اولاد کو اللہ زندگی دے۔ وہ اپنے ماں باپ کی دولت کو جیسے چاہے برتیں' رکھیں یا پھینک دیں۔۔۔ اس میں تمہارا ہمارا کیا لینا دینا؟"

اپنے طور پر انہوں نے قدسیہ کو شرمندہ کرنا چاہا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح ناکام ہوئی تھیں۔

"اس میں لالچ کی کیا بات ہے؟ بری کا زیور تو ہماری ہی طرف سے تھا نا۔"

"اس پر بھی ہمارا حق نہیں ہے۔ جسے دیا وہی مالک تھی۔" آمنہ بیگم اپنے حجاب کی پن ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ قدسیہ کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔

"کیوں؟ ہماری ماں کی نشانی ہے۔ میں تو ضرور کہوں گی بھائی صاحب سے۔۔۔"

ان کی مسلسل تکرار سے آمنہ بیگم کو بھی غصہ آیا۔

"قدسیہ ہوش کے ناخن لو۔۔۔ کیسی بری۔۔۔ کیسا زیور؟ کیا باتیں لے بیٹھی ہو؟" وہ انہیں ڈانٹ کر بولیں۔

"اور تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ نازنین نے امی بیگم کا زیور بدل کر دوسرے سیٹ لے لیے تھے۔ اب کس نشانی کی بات کر رہی ہو تم؟" آمنہ کو آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔

بہن کو قائل کرنے میں ناکام ہو کر قدسیہ کا غصہ ان پر اترنے لگا۔

"ناز بھابھی کو تو اللہ پوچھے گا جو کچھ انہوں نے کیا تھا میرے ساتھ۔۔۔ میں تو ہرگز معاف نہیں کروں گی۔"

آمنہ کو بہن کے خیالات جان کر سخت افسوس ہوا۔

"قدسیہ۔۔۔ وہ مر چکی ہے۔ اپنا دل صاف کر لو۔ مرے ہوئے لوگوں سے بیر پال کر کیا ملے گا؟" آمنہ بیگم ان کا ہاتھ تھام کر نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"اللہ تعالیٰ اگر ان سے بازپرس کرے گا تو یقیناً" ہم سے بھی ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے ہمیں بھی اس کی معافی کی ضرورت ہو۔ اس کے مرنے کے بعد ہمیں کیسے معافی ملے گی؟ کبھی سوچا ہے؟"

"ہم نے ایسا کیا ظلم توڑا تھا؟ امی بیگم نے؟ میں نے؟ عبید بھائی نے تو رانی بنا کر رکھا تھا اسے۔"

"ناز کا رانی بننا ہی تو برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ذرا سا دل کشادہ کر لیتیں امی بیگم تو عبید کو الگ نہ ہونا پڑتا۔ اسے دل سے قبول کر لیتے تو وہ بھی ہمارے خاندان کو اپنا سمجھتی۔ تم سارے قصور ان کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتیں قدسیہ! تھوڑا یا زیادہ۔ کہیں نہ کہیں قصور تم لوگوں کا بھی تھا۔"

"آپ یہاں نہیں تھیں۔ آپ نہیں جانتیں جب انہوں نے ہمیں دنیا بھر میں رسوا کیا تو ہم پر کیا بیتی تھی۔"

آمنہ بیگم شادی کے بعد ابوظہبی میں رہ رہی تھیں۔ ان کے شوہر بینک میں کام کرتے تھے۔ عبید الرحمن کی شادی میں شرکت کی غرض سے وہ کچھ دنوں کے لیے آئی تھیں اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ واپس چلی گئیں۔ اس دوران وہاں سے کبھی کبھار جب ان کا لاہور آنا ہوتا تو وہ اپنے مشاہدے کی نظر میں حالات کا جائزہ لیتی تھیں' اور ساتھ ہی ساتھ ماں اور بہن کے سامنے ناز کی شخصیت کے مثبت پہلو لے کر آتی تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ کوئی بھی شخص صرف برا نہیں ہوتا اور آپس میں ایک دوسرے کی کمزوریوں کو تھوڑا سا نظرانداز کر کے ہی زندگی آسان بنائی جا سکتی ہے۔

ناز نے قدسیہ کے ساتھ جو کیا تھا۔ انہیں اس کی تفصیل معلوم تھی' اسی لئے انہوں نے قدسیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں جانتی ہوں اس نے جو کیا تھا۔ امی بیگم نے سب بتایا تھا مجھے فون پر۔ لیکن قدسیہ! ناز سے غلطی ہوئی تھی اور یوں دیکھا جائے تو وہ شخص تمہارے نصیب میں تھا ہی نہیں۔ اللہ نے تمہیں اس سے بہتر شخص کی بیوی بنایا ہے۔ شکر کرو' ان لوگوں کی اصلیت پہلے معلوم ہو گئی۔ اور یہ سب ناز کی اس غلطی کی وجہ سے ہوا۔"

قدسیہ بیگم کو بڑی بہن کا یوں ناز کی سائیڈ لینا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا' اور انہوں نے اسی وقت اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"آپ ہمیشہ ناز بھابھی کی طرف داری کرتی آئی ہیں اور آج بھی ہمیں قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔ میں آپ کی بہن ہوں۔ امی بیگم ہماری ماں تھیں۔ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ ہم دونوں سے زیادہ آپ کو ناز بھابھی سے ہمدردی ہے۔"

آمنہ بیگم نے ان کی بات کی سختی سے تردید کی۔

"نہیں قدسیہ! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں اور ہر انسان کو حق بات ہی کہنی چاہیے۔ چاہے معاملہ اس کے قریبی رشتہ دار کا ہی کیوں نہ ہو۔

اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بہن ہونے کی حیثیت سے میں تمہاری غلطیوں کی نشاندہی نہ کروں تو مجھے ناز کی کمزوریاں اچھالنے پر مجبور بھی مت کرو۔ امی بیگم میری بھی ماں تھیں لیکن وہ فرشتہ تو نہیں تھیں۔ انسان تھیں۔ بالکل ناز کی طرح ایک عام انسان۔ جس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور گناہ بھی۔ زیادتی انہوں نے بھی کی تھی۔ ناز اور عبید کے تعلقات کشیدہ کرنے میں بہرحال ان کا ہاتھ بھی تھا۔"

وہ ایک پل کے لیے سانس لینے کو رکیں پھر گویا ہوئیں۔

"میں ہمیشہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ میری ماں کی مغفرت کرے۔ اور میں یہ دعا بھی ضرور کروں گی کہ اللہ تعالیٰ ناز کو بھی معاف کر دے۔ بلکہ میرے اور

تمہارے بھی کبیرہ و صغیرہ تمام گناہ معاف فرمائے۔ تم بھی معافی مانگا کرو۔ اپنے لیے۔ ہم سب کے لیے۔ جو عذاب ہم نہیں سہ پائیں گے، کسی دوسرے کو اس عذاب میں مبتلا دیکھنے کی خواہش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ بس اللہ معاف کردے۔ ہم سب کو معاف کردے۔" خوف خدا سے لبریز دل اور زبان سے اس کی رحمت کی طلب گار ہو کر آمنہ بیگم بے اختیار رو پڑی تھیں۔ قدسیہ نے تسلی کی خاطر اپنی بہن کے کندھے پر ہاتھ تو رکھا لیکن دل کے سوتے خشک تھے اور بنجر زمین پر سبزہ نہیں اگا کرتا۔

☼ ☼ ☼

اسکول کا پہلا دن تھا۔ مہریز زیر لب مسکراتے ہوئے مس ریکا کو روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کی کوشش میں ہلکان ہوتا دیکھ رہا تھا۔ کلاس ون کے زیادہ تر بچے اپنی ماؤں کو یاد کرتے گلا پھاڑ پھاڑ کر روئے جارہے تھے لیکن اس کی یہ مسکراہٹ اس وقت غائب ہوگئی جب اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی نے بھی اچانک رونا شروع کردیا۔ پتا نہیں اسے یک دم کیا ہوا تھا؟ کافی دیر سے وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی اور ایک لفظ نہیں بولی تھی۔ وہ اسکول آکر بہت خوش تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس لڑکی کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہوگیا۔

دوپہر کو اس نے گھر واپس آکر اپنی امی سے اس کا ذکر کیا تو وہ اسے پیار سے سمجھانے لگیں۔

"بیٹا! آپ اسے چپ کروا دیتے۔ کل آپ اسے سمجھائیے گا کہ اچھے بچے تو اسکول جاکر خوش ہوتے ہیں۔ روتے نہیں ہیں۔" مہریز نے ان کی نصیحت گرہ سے باندھ لی۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اگلے دن وہ اسکول پہنچا تو وہ لڑکی بہت خوش لگ رہی تھی۔ کلاس میں وہ بار بار اپنی نئی رنگین پنسلیں گھڑتی رہی اور ڈرائنگ بناتی رہی۔ آج وہ خود میں ہی اتنی مگن تھی کہ ارد گرد روتے ہوئے بچوں کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ بریک ٹائم میں وہ جھولوں کے پیچھے بیٹھی اپنا لنچ باکس کھول رہی تھی کہ مہریز اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا، پھر زبردستی اپنا آدھا فرنچ ٹوسٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ اسے مزے سے کھا رہا تھا۔ وہ لڑکی اپنا آدھا ٹوسٹ ختم کرنے کے بعد بولی۔

"تمہارا نام مہریز ہے نا؟"

"ہاں۔" وہ تھوڑا حیران ہوا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"میں نے تمہارے پنسل باکس پر لکھا دیکھا تھا۔" اس نے مزے سے جواب دیا۔

"تمہیں پڑھنا آتا ہے؟"

"ہاں! مجھے پڑھنا اچھا لگتا ہے۔" یہ جان کر مہریز پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تو پھر کل رو کیوں رہی تھیں؟" جواباً وہ منہ بسورتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرے ہاتھ میں بہت درد ہو رہا تھا، ماما نے مارا تھا۔"

"کیوں مارا تھا تمہاری ماما نے؟" مہریز نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بس ایسے ہی اور میں نے تو ان کی ہیلپ کی تھی۔ وہ ناراض ہوگئیں۔ میرا ہاتھ مروڑ دیا۔ یہاں سے۔" اس نے اپنا بایاں بازو اس کے سامنے کردیا۔

"لیکن مارا کیوں تھا؟" مہریز کا تجسس برقرار تھا۔

"وہ دادی کے کپڑے دھو رہی تھیں۔" وہ راز سے پردہ اٹھانے پر رضامند ہوگئی۔ "انہوں نے بھائی سے کہا، ہانڈی کا چولہا بند کردو۔ بھائی اور میں کھیل رہے تھے۔ بھائی نے جاکر چولہا بند کیا اور بھاگ گیا۔ میں نے پھر سے سارے چولہے کھول دیے۔ بے چاری ماما پہلے ماچس جلاتیں پھر چولہا کھولتی تھیں، میں نے ان کی ہیلپ کردی کہ انہیں بار بار چولہا نہیں کھولنا پڑے گا بس۔ ماچس جلائیں گی اور کھٹ سے چولہے میں ڈال کر ہانڈی پکالیں گی۔ ماما نے مجھے تھینک یو بھی نہیں کہا۔ اتنا چلائیں اور زور سے میرا ہاتھ مروڑ دیا اور کہا اب کچن میں مت آنا۔" وہ انگلی اٹھا کر اپنی ماما کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔ مہریز سر کھجاتا ہوا بولا۔

"انہوں نے گھر میں مارا تھا اور تم کلاس میں رو رہی تھیں؟"

"ہاں۔ میں نے دیکھا سب بچے رو رہے ہیں۔ میری چوٹ میں تو درد بھی ہو رہا تھا۔ میں بھی رونے لگی۔" اس کا لہجہ بہت دکھی تھا۔ "پتا ہے مہریز۔ جب ماما ڈانٹتی ہیں اور مجھ پر غصہ کرتی ہیں نا میرا دل چاہتا ہے میں نمک مرچ میں زہر ملا کر کھالوں اور مر جاؤں۔"

"تم چولہا کھول کر بیٹھ جانا۔ خود ہی مر جاؤگی۔" مہریز کو ہنسی آرہی تھی۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟" وہ غصے سے بولی۔

"تم بالکل بدھو ہو، تمہیں نہیں پتا، چولہے کی گیس سے لوگ مر جاتے ہیں۔"

"کیا؟ تمہیں کیسے پتا؟" وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔" مہریز فخریہ لہجے میں بولا۔ "میری امی نے بتایا تھا۔ تم بہت بے وقوف ہو۔ اس لیے تمہاری ماما نے مارا تھا۔"

"ان سے تو میں سوری کرلوں گی۔ تم مجھے بتاؤ تمہیں اور کیا کیا معلوم ہے؟"

مہریز کی معلومات نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس لیے وہ کلاس میں اسی کے ساتھ بیٹھنے لگی۔ بریک میں بھی وہ لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کے بجائے اس سے باتیں کرتی رہتی۔ مہریز نے اس باتونی لڑکی کی خاطر اپنے بہت سے پسندیدہ کھیل کھیلنے موقوف کردیے تھے۔ وہ پکڑم پکڑائی نہیں کھیلتا تھا کہ وہ اسے پکڑنے میں ناکام ہو کر رونے لگ جاتی۔ منکی بار زینہ چڑھنا اسے پسند تھا لیکن رامین ایک بار گرنے کے بعد اب دوبارہ اس پر جانا نہیں چاہتی تھی اسی لیے مہریز کی دلچسپی بھی ختم ہوچکی تھی۔

کلاس ٹو میں آنے کے بعد بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایک دن گیمز کے پیریڈ میں پی ٹی کے بعد وہ دونوں گراؤنڈ کے کنارے بینچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ مہریز نے رامین سے سوال کیا۔ "تم بڑی ہو کر کیا بنوگی؟"

رامین نے دو منٹ تک نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ "میں مس فینسی بنوں گی۔ وہ بہت پیاری ہیں۔" اس نے اپنی ڈرائنگ ٹیچر کا نام لیا، جو برطانوی شہری تھیں اور سرخ و سفید رنگت کے ساتھ ان کی آنکھوں کا رنگ ہلکا سبز تھا۔

"اور تم بڑے ہو کر کیا بنوگے؟"

مہریز نے فوراً کہا۔ "میں Muscle man (طاقت ور آدمی) بنوں گا۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟"

"Muscleman بہت اسٹرانگ ہوتا ہے۔ بگ مین۔ جیسے میرے پاپا۔ تمہارے پاپا۔" اور رامین کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ اس نے پوچھا "تم بڑے ہو کر مجھے ماروگے؟"

مہریز الجھ کر پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ "میں تمہیں کیوں ماروں گا؟"

"بگ مین لڑکیوں کو مارتے ہیں نا کیونکہ وہ اسٹرانگ ہوتے ہیں۔ میرے پاپا کی طرح۔" اس کے تصور میں بگ مین کا جو خاکہ بنا تھا، وہ مرد طاقت ور ہونے کے ساتھ ساتھ عورت پر ہاتھ بھی اٹھاتا تھا۔ لیکن یہ بات صاف صاف وہ مہریز سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ بس وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ مہریز بڑا ہو کر اس کے پاپا جیسا بنے۔ "مہریز! تم اسٹرانگ بنوگے تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ ہماری دوستی ٹوٹ جائے گی۔" اس نے مہریز کی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی۔

"رامین! میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ میں کسی کو نہیں ماروں گا۔ میں اچھا والا بگ مین بنوں گا نا۔" سات سالہ مہریز کے لیے بڑا ہونا بے حد اہم تھا۔

"دیکھو۔ ٹیوزڈے کو تم نے مجھے مارا تھا۔ پر میں نے تمہیں نہیں مارا نا۔"

"تو میرے ہاتھ تو اتنے سوفٹ ہیں تمہیں چوٹ بھی نہیں لگی۔ اور تم مارو گے تو میں نیچے گر جاؤں گی۔"

"نہیں۔ میں نہیں ماروں گا۔ میں اچھا بچہ ہوں۔ میری امی کہتی ہیں اچھے بچے لڑکیوں کی ریسپکٹ

کرتے ہیں۔ میں تو تم پر غصہ بھی نہیں کرتا۔ تمہاری ساری باتیں مانتا ہوں پلیز مجھے بڑا ہو کر Muscleman بننے دو۔"

وہ اس سے باقاعدہ التجا کرنے لگا جیسے رامین کی اجازت کے بغیر اس کا بڑے ہونا ناممکن ہو۔ رامین چاہتی تو نہیں تھی پر مہرز کی دوستی کی خاطر اس نے مجبوراً "اجازت دے ڈالی۔

☼ ☼ ☼
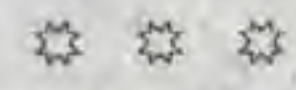
کلاس تھری میں ٹیچرز نے لڑکے لڑکیوں کو الگ بٹھانا شروع کردیا۔ اگر وہ دونوں اپنی سیٹ چھوڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ آکر بیٹھتے تو کلاس ٹیچر انہیں دوبارہ الگ بٹھا دیتیں۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ اب وہ کلاس میں اکٹھے نہیں بیٹھ سکیں گے۔ اپنی باتوں کا کوٹہ وہ بریک اور چھٹی کے وقت پورا کرنے لگے۔

کلاس فور تک پہنچتے ان کی دوسرے لڑکے لڑکیوں سے بھی تھوڑی دوستی ہونے لگی۔ مہرز اپنے دوستوں کے ساتھ وہی کھیل پھر سے کھیلنے لگا جو رامین کی وجہ سے چھوڑ چکا تھا اور رامین اپنی ہم مزاج سہیلیوں میں گھلنے ملنے لگی۔ ساتھ بیٹھنے کے کم کم مواقع ملتے مگر دوستی ہنوز برقرار تھی۔

ایک صبح کلاس ٹیچر نے ان کی کلاس کا ایک نئے لڑکے سے تعارف کروایا۔ حسن چوہدری ... وہ نیو ایڈمیشن تھا۔ چھوٹے قد کا ڈرا سہما حسن پہلے دن سے ہی شرارتی لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بننے لگا۔ کوئی ٹیچر سے آنکھ بچا کر اس کی پینسل اٹھا لیتا تو کوئی پیچھے سے بال کھینچ دیتا اور وہ بس ڈیسک پر سر رکھ کر رونے لگ جاتا تھا۔

ایک دفعہ کلاس کے شرارتی بچے احمد نے اسے ٹانگ اڑا کر گرا دیا جب وہ اپنی کاپی چیک کروا کر واپس اپنی ڈیسک پر آرہا تھا۔ اس دن پہلی بار حسن نے ٹیچر سے شکایت کی۔ اس کے گھٹنے پر بہت چوٹ آئی تھی۔ ٹیچر نے احمد کو کان پکڑوا کر کونے میں کھڑا کردیا اور چھٹی ہونے تک وہیں کھڑا رہا تھا لیکن چھٹی کے بعد اس نے حسن کو جالیا۔ وہ اپنی شکایت لگانے کا بدلہ نکالے رہا تھا۔ رامین یہ ماجرا دیکھ کر ان کے سر پر پہنچ گئی اور زور سے اپنا اسکیل احمد کے کندھے پر مارا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تو رامین نے دوبارہ ہاتھ اٹھا دیا۔ احمد ڈر کر وہاں سے بھاگ گیا۔ حسن اپنے آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رامین نے اسے اپنے تھرماس سے پانی نکال کر دیا۔ مہرز بھی نزدیک آکر اسے تسلیاں دینے لگا۔

اس دن سے حسن اور مہرز کی دوستی پکی ہوگئی تھی۔ اب رامین اور مہرز کے ساتھ حسن بھی دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔ وہ بھی رامین کی طرح باتونی واقع ہوا تھا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ تینوں ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتے رہتے اور بہت مزے کرتے تھے۔

لیکن اس مثلث کو ٹوٹنے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ ایک چھوٹے سے واقعے نے اس رشتے کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔ فیورٹ ٹافی اسٹیکرز اور کھیلوں سے متعلق جملوں پر مشتمل معصوم گفتگو کرنے والے، لمس کے جادو سے ناآشنا تین بچوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر جانے رامین کے پاپا نے کیا سمجھا تھا۔ وہ چھٹی کے وقت اسے لینے آئے تو وہ حسب معمول ان دونوں کے درمیان بیٹھی ہنستے ہوئے باتیں کررہی تھی۔ اس کے پاپا نے ان دونوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زور سے تھپڑ مار کر ڈانٹنے لگے کہ وہ لڑکوں کے ساتھ باتیں کیوں کررہی ہے؟

مہرز اور حسن گھبرا کر فوراً" وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ رامین روتی ہوئی گھر گئی تھی۔

مہرز اس کے لیے بے حد فکر مند تھا۔ جانے اس کے پاپا نے گھر پہنچ کر اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ اسے سخت تشویش ہورہی تھی۔

اگلے تین دن رامین اسکول نہیں آئی تھی۔ ویک اینڈ کے بعد جب پیر کو وہ اسکول آئی تو خاموشی سے کلاس میں جا کر بیٹھ گئی۔ مہرز کو توقع تھی کہ وہ خود اسے اپنا حال بتائے گی، جس طرح ہمیشہ وہ ہر چیز اس سے شیئر کرتی تھی مگر شاید اس کی نظر نہیں پڑی تھی مہرز پر۔ وہ

خود حسن کو لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن رامین کا رویہ بے حد روکھا اور عجیب تھا۔ اس نے کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے اپنی کاپی پر سوال حل کرتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں شرمندہ ہو کر وہاں سے ہٹ گئے۔

مہرز بددل نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا وہ کچھ دنوں بعد خود اس کے پاس آئے گی اور وہ پھر سے اچھے دوست بن جائیں گے لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔

☼ ☼ ☼

مہرز کا مکمل دھیان پڑھائی کی طرف ہوگیا۔ اسے ہر سبجیکٹ پسند تھا اور پوزیشن لینا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ رامین اور اس کی دوستی اب اس کی ترجیحات میں شامل نہیں تھی۔ وہ انتہائی بدلحاظ اور بدتمیز ہوچکی تھی۔ اس کے مزاج کی یہ تبدیلی مہرز سمجھنے سے قاصر تھا۔ ویسے بھی وہ لوگ آپس میں بات نہیں کرتے تھے۔ دو سال پہلے ان کی دوستی ختم ہوگئی تھی اور جس طرح ہوئی تھی اس کے بعد رامین سر تاپا بدل سی گئی تھی۔ اس کی ہنسی، کھلکھلاہٹیں، دوستانہ مزاج، بے فکری، خوشی سب کچھ جیسے جادو کی چھڑی کے زور پر غائب کردیا گیا تھا پہلے مہرز کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی مگر اب ہر شکایت اسی کی ذات سے وابستہ ہوچلی تھی۔ ایک ہی کلاس میں ہونے کے باعث کچھ نہ کچھ واسطہ تو پڑتا رہتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں آپس میں ضروری حد تک بات چیت کرتے ہی تھے۔ مگر تمام لڑکیوں میں رامین کا رویہ انتہائی غیر مناسب تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ مخالف جنس اس کی ناپسندیدہ ترین مخلوق بن چکی ہے۔ کسی بھی معمولی سی بات پر وہ شعلے اگلتی، ایسی تیسی کردیتی تھی۔ اسی باعث لڑکے اس سے الجھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور ذرا دور دور ہی رہا کرتے۔ اسے پروا نہیں تھی وہ شاید یہی چاہتی تھی کہ اسے "ناپسند" کیا جائے۔

مہرز اس کے اس رویے سے بہت مایوس ہوا تھا۔ وہ اس کی دوست رہ چکی تھی۔ اس لحاظ سے اس کے ساتھ تھوڑی رعایت برت سکتی تھی، لیکن اس نے ماضی کی ہر اچھی یاد کو اپنے بدصورت رویے سے ڈھانپ دیا تھا۔

اپنی تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کرنے کے بعد مہرز فرسٹ پلیس کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ فرح علیم، رامین کی بہترین دوست۔ تعلیمی میدان میں اس کی حریف بن کر سامنے آئی۔ وہ فرسٹ آنے لگی اور مہرز سیکنڈ۔ محض ایک دو نمبروں کے فرق سے وہ پیچھے رہ جاتا تھا۔ اسے فرح علیم سے چڑ ہوتی جارہی تھی۔ ایک وہی اس کی کامیابی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ورنہ فرسٹ پوزیشن حاصل کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔

فرح علیم سبجیکٹ ٹیچرز کے ساتھ کافی بے تکلف تھی۔ وہ پراعتماد تھی اور کلاس کے علاوہ اکثر بریک ٹائم میں ٹیچر سے مشکل موضوعات پر بھی سوالات کیا کرتی تھی۔ تمام ٹیچرز اسے پسند کرتے تھے اور اس کی پوزیشن کی وجہ سے اہمیت بھی دیتے تھے۔

فرح علیم سے منسلک منفی جذبات کے زیر اثر مہرز نے ایک دن کلاس میں اسے "مس کی چمچی" کہہ کر پکارا۔ جواب بہت سخت ملا لیکن فرح کی جانب سے نہیں بلکہ رامین کی طرف سے، جو اپنی سہیلی کی توہین برداشت نہیں کرپائی تھی۔ اس نے جواباً "مہرز کو کھری کھری سنائی تھیں مہرز مزید کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس وقت یہ لوگ کلاس سیونتھ میں تھے۔

مقابلہ بازی نے مہرز کو اور زیادہ محنت پر اکسایا تھا۔ یہ محنت رنگ لائی تھی۔ مہرز اور فرح کے نمبرز کا درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا تھا اور بالآخر مہرز اپنی سخت حریف کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔

فرسٹ پوزیشن پر اب مہرز کا قبضہ ہوچکا تھا۔

دن مہینے سال گزرتے رہے۔ وہ اب نائنتھ کلاس میں آگئے تھے۔ اس دن رامین کی سالگرہ تھی۔ اسکول کی طرف سے اسٹوڈنٹس کو اپنی برتھ ڈے پر یونیفارم

کے علاوہ لباس پہننے کی اجازت تھی۔ رامین نے سیاہ جارجٹ کا عام سا شلوار قمیص پہن رکھا تھا' لیکن وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔

اپنی طرف سے اس نے کوئی اہتمام نہیں کیا تھا' لیکن یہ وہ عمر ہوتی ہے جب لڑکیوں کو کسی بھی قسم کے بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ اس کے بنا ہی پرکشش لگتی ہیں۔ کلاس کی سب لڑکیاں اسے سالگرہ کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ ستائش بھی دے رہی تھیں اور ان کے سراہنے پر وہ خوش ہونے کے بجائے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کبھی خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں نا دانستگی میں سب کی توجہ کا مرکز بن جانے سے وہ کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ "پذیرائی" ہر ایک کو اچھی لگتی ہے' لیکن رامین کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔

اسمبلی کے بعد وہ سب کلاس میں بیٹھ کر ٹیچر کی آمد کے منتظر تھے۔ یونہی ادھر ادھر دیکھتے مہریز کی نظر رامین پر جا رکی۔ وہ فرح کے ساتھ بیٹھی اس کے دیے گفٹ کو کھولتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ چھوٹے سے باکس میں سفید نگینوں والی بالیاں تھیں۔ فرح کو شکریہ کہتے ہوئے نہایت شوق سے رامین نے ایک بالی اٹھا کر اپنے کان کے پاس لے جا کر پوچھا۔ "کیسی لگ رہی ہے؟"

"بہت اچھی... ابھی پہن لو...." فرح نے تعریف کے ساتھ ہی اصرار شروع کر دیا۔ رامین نے ملائمت سے کہا۔ "اچھا نہیں لگے گا اسکول میں اس طرح سج بن کر بیٹھ جاؤں۔ بلاوجہ سب گھوریں گے۔ میں گھر جا کر پہن لوں گی۔ پرامس۔" مہریز ان کی گفتگو باآسانی سن سکتا تھا۔ وہ دونوں ساتھ والی لائن میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ رہنے دو.... گھر جا کر پہن لینا۔ ویسے تم یوں سادہ بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب تمہیں دیکھ رہے ہیں۔" فرح نے پیار سے اس کے ہلکے براؤن سلکی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اٹکا دی۔ رامین نے سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس کی رائے کی تردید کی لیکن مہریز... وہ شاید پہلی بار فرح کی رائے سے دل ہی دل میں اتفاق کر رہا تھا۔ رامین واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج بات بے بات ہی مسکرائے جا رہی تھی۔ ورنہ تو ہر دم اس کی تیوریاں چڑھی رہتی تھیں۔ یہ نیا منظر ہر تھوڑی دیر بعد مہریز کی توجہ کھینچ رہا تھا۔ "خوش، مطمئن اور مسکراتی ہوئی رامین...."

غیر ارادی طور پر اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کرتی رہیں لیکن یہ مشغلہ صرف ایک دن پر محیط رہا۔ اگلے دن سے اس کا وہی پرانا انداز واپس آ گیا اور مہریز کی توجہ پھر سے پڑھائی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

میٹرک کے فزکس ٹیچر نہیں آئے تھے۔ ان سب کو فری پیریڈ مل گیا تھا۔ آدھی کلاس باسکٹ بال کورٹ میں پہنچ گئی۔ باقی ادھر ادھر بکھر گئے۔ مہریز کچھ دیر حسن کے ساتھ باتیں کرتا رہا پھر لائبریری کی طرف نکل آیا۔ ریفرنس بک سے اپنے مطلوبہ نوٹس لینے کے بعد وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اسے رامین نظر آئی۔

وہ لائبریری میں آخری کونے والی میز پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس چیز نے مہریز کو ٹھٹکنے پر مجبور کیا۔ وہ رامین کے آنسو تھے۔ جنہیں وہ بار بار ٹشو سے پونچھ رہی تھی۔

وہ پوری کوشش سے اپنی آواز دبائے ہوئے تھی۔ پھر بھی اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں اور جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مہریز کا دل بے اختیار پگھل سا گیا اور یک دم ہی اس کی ذات سے وابستہ ہر شکایت ختم ہو گئی۔

لائبریری بالکل خالی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مہریز جب اس کے عین سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا تو وہ چونک گئی۔ اپنے آنسو چھپانے کے لیے اس نے جلدی سے سر جھکا کر اپنی نوٹ بک کھول لی اور تیزی سے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟" مہریز نے نرمی سے پوچھا۔

"میں نہیں رو رہی۔" اس نے سر اٹھائے بغیر اسی چڑچڑے لہجے میں جواب دیا جو اس کا خاصا بن چکا تھا۔ لیکن مہریز نے برا نہیں مانا۔ وہ یکلخت اس کے دل کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی دوری آئی ہی نہیں تھی۔ یہ وہ رامین تھی جو اس کی دوست تھی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اس سے شیئر کیا کرتی تھی۔ جس کے ننھے منے دکھ اس کے دلاسوں کے محتاج تھے۔

"بتاؤ نا کیوں رو رہی ہو؟" رامین نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔ کنچوں سی چمکتی شہد رنگ آنکھوں میں شفاف پانی ہلکورے لے رہا تھا۔ مہریز دیکھتا رہ گیا۔

کھڑکیوں سے اندر آتی سردی کی نرم دھوپ مہریز کی پشت سے چمکتی ہوئی رامین کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سورج سے بڑھ کر تپش اس کی سنہری آنکھوں میں تھی۔ دہکتے رخسار اور ادھ کھلے ہونٹ کپکپاتے ہوئے دل کی بات کہتے کہتے رک سے گئے تھے۔

وہ بمشکل گویا ہوئی۔ "میری نانی امی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اور اتنا کہتے ہی وہ پھر سے رونے لگی۔ وہ اسے تسلی دینے لگا۔ رامین سسکتے ہوئے اپنی پیاری نانی کے جانے کون کون سے قصے سناتی رہی۔ مہریز خاموشی سے اس کی ہر بات سنتا رہا۔ یونہی لگاتار بولتے ہوئے یک دم اسے شرمندگی کے شدید احساس نے گھیر لیا۔ مہریز نہایت انہماک سے اس کے نزدیک ہو کر اس کی ہر بات توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ نظریں چرا کر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مزید ایک لفظ کہے بغیر اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور تیز تیز چلتی ہوئی لائبریری سے باہر نکل گئی۔ مہریز چپ چاپ اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اپنے گھر واپس آ کر بھی اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ تنہائی میں بہت دیر تک وہ اپنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ رامین نے دوبارہ اسے اسی منصب پر فائز کر دیا تھا۔ جہاں پر وہ نو سال پہلے تھا لیکن... اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہواؤں میں محسوس کر رہا تھا بالکل نیا اور انوکھا جذبہ لہو بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

ہر روز اسے دیکھتے رہنے کے باوجود ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے آج پہلی بار دیکھا ہے۔

آج سے پہلے تو وہ کبھی اس طرح بے خود نہیں ہوا۔ یہ تبدیلی اس کے اندر آئی تھی یا رامین پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں تو وہی چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ مہریز گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ابھی تک اس کے آس پاس تھی۔ اس کے روبرو تصور میں اس کی صورت نقش ہو چکی تھی۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ایک لمحے نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دے رہی تھی' جو کسی اجنبی دھن پر دھڑک رہا تھا۔ پورا جسم جیسے مسحور کن مدہوشی کے عالم میں تھا۔ لب خود بخود مسکرانے لگے تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا اسے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔

بس اتنا معلوم تھا کہ رامین کا خیال خمار بن کر لحظہ بہ لحظہ روح کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔

وہ آج بھی اسے یاد کر رہا تھا اتنی ہی محبت اور لگاوٹ سے جتنا گیارہ سال پہلے اس شام اپنے گھر میں یاد کر رہا تھا۔ محبت اسے اس دن ہوئی تھی رامین سے' جب اس کی آنکھوں میں ڈوب کر وہ ارد گرد کی ہر شے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس رات بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اور آج کی رات بھی وہ سو نہیں پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آراستہ محل سے گٹھلیاں' سیپارے اور سفید چاندنیاں باہر نکالی جا چکی تھیں۔ لان میں رکھی کرسیوں کو اٹھا کر سوزوکی میں لادا جا رہا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں قناتیں بھی ہٹائی جانی تھیں۔ شفیق

الرحمان کا ڈرائیور آمنہ بیگم اور قدسیہ کو ان کی منازل پر پہنچا کر واپس آچکا تھا اور اب باہر کے کاموں میں دیگر ملازمین کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

آمنہ بیگم نے انہیں نازنین کے زیور کے بارے میں بتا دیا تھا۔ رامین کی نشاندہی پر انہوں نے عافیہ سے کہہ کر سارا زیور نکلوایا تھا کیونکہ وہ خود اپنی ماں کے زیورات کو چھونے سے انکار کر چکی تھی۔ عافیہ نے مشورہ دیا کہ زیور کو بیچ کر اس کی رقم عطیہ کر دی جائے۔ اس طرح ڈھیر سونا گاڑی میں یتیم سینٹر لے کر جانا ذرا مشکل ہوتا۔ شفیق الرحمان آمنہ بیگم سے کہہ چکے تھے کہ جیسا رامین نے کہا ہے' ویسا ہی ہوگا۔ انہوں نے عافیہ کو بھی سمجھا دیا کہ اس معاملے میں کوئی رائے دینے کے بجائے وہی کریں' جیسا کہا گیا ہے۔ عافیہ نے مزید ایک لفظ کہے بغیر شوہر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تمام زیور ایک مناسب سائز کے بیگ میں ڈالا اور عمر کو لے کر ڈرائیور اور سیکیورٹی گارڈ کے ہمراہ آدھے گھنٹے میں جا کر واپس بھی آگئیں۔

شفیق الرحمان نے رامین کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آئے تو وہ کھڑکی کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم اپنا ضروری سامان لو اور میرے ساتھ چلو۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ رامین نے اپنا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے لہجے میں شفقت تھی اور آنکھوں میں فکر و ملال کے سائے لرز رہے تھے۔ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ بہت مہربان اور سب کا خیال رکھنے والے۔ رامین تو پھر ان کے سگے بھائی کی اولاد تھی۔

"نہیں تایا جان ابھی نہیں۔۔۔ میں ابھی نہیں جا سکتی۔ مجھے یہاں کچھ کام کرنے ہیں۔"

وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے۔

"تو ایسا کرتے ہیں' میں اور عافیہ کچھ دن کے لیے تمہارے پاس رہ جاتے ہیں۔ پھر جب سب کام ختم ہو جائے تو ہمارے ساتھ چلی چلنا۔"

لیکن جو کام وہ کرنا چاہتی تھی کسی اور کی موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اسے خود ہی انجام [illegible] تھے۔

"نہیں تایا جان! میں کر لوں گی۔ زیادہ بڑا کام [illegible] ہے۔ آپ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔ اگر دل گھبرا[یا تو] میں آجاؤں گی نا آپ کے پاس۔ ابھی پلیز کچھ دنوں [کے] لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔"

اس نے التجا کی۔ وہ بغور اس کی جانب دیکھنے لگے مگر وہ اپنی بات ختم کرتے کرتے نہ جانے کہاں کھو [گئی] تھی۔ کیسی خالی آنکھیں تھیں اس کی۔ خشک ویران صحرا کی مانند جن میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔

شفیق الرحمان کو بہت سے پچھتاوؤں نے گھیر لیا۔ وہ اس کے لیے بہت فکر مند ہوتے ہوئے بھی ا[تنے] عرصے اس سے لاتعلق رہے تھے بلکہ کر دیے گئے تھے۔

"میں بے بس تھا۔ یا شاید وہ میری بزدلی تھی۔ [بعض اوقات] ہم بزدل ہو جاتے ہیں۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر شرپسند اور فسادیوں سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ڈرتے ہیں جو کیچڑ ہماری ذات پر اچھالا جا رہا ہے کہیں ہمارے دامن کو داغ دار نہ کر دے۔ کہیں زبان کے خنجر ہمیں گھائل نہ کر دیں۔ ہم پیٹھ موڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ عبید کے جانے کے بعد ہم سب نے اپنی ذات کو لالچ اور طمع کے ہر الزام سے تو بری ثابت کر دیا لیکن ہم اسے کیوں بھول گئے؟ یہ تو ہمارا اپنا خون تھی جس کی زندگی ہم نے یونہی ضائع ہونے دی۔ ذرا سی ہمت کر لیتے' ڈٹ جاتے اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔ وقت پر اس کی شادی ہو جاتی۔ میری [بیٹی] سے دو برس بڑی ہے۔ آج اس کی طرح اپنے گھر بار میں مگن ہوتی۔ کیسی مرجھا گئی ہے۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔"

ان کی سوچوں کا لامتناہی سلسلہ ان گنت پچھتاوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ ان کا دل بھر آیا۔ سسکنے کی آواز پر رامین نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ شفیق الرحمان عینک اتار کر اپنی آنکھیں مل رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا۔

"تایا جان! آپ رو رہے ہیں؟"

وہ تڑپ کر اٹھی اور ان کے آنسو پونچھنے لگی۔ شفیق الرحمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم ہم سے ناراض ہو؟ اسی لیے ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتیں نا؟ ہمیں معاف کر دو بیٹا!"

"نہیں تایا جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ تو میرے بابا جیسے ہیں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔" وہ انہیں یقین دلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ "آپ میری فکر مت کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ دیکھیے گا میں اب ہمیشہ آپ کو ہنستی ہوئی ملوں گی۔ بس آپ مت روئیے۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ملائمت سے ان کے آنسو صاف کیے۔

"اس اکیلے گھر میں کیا کرو گی رامین؟ ہمارے ساتھ چلو۔" وہ ابھی تک اسے لے جانے پر بضد تھے۔

"مجھے یہاں ہونا چاہیے تایا جان! اگر ان کا فون آیا یا اگر وہ واپس آگئے تو؟ میں گھر اکیلا چھوڑ دوں گی تو ان کی واپسی کی ہر امید دم توڑ دے گی۔"

تایا جان کو علم تھا' رامین کس کی بات کر رہی ہے۔ وہ ان کی تسلی کی خاطر پھر کہنے لگی۔ "میں آجاؤں گی اگر دل گھبرایا تو میں فوراً آپ کے پاس آجاؤں گی۔ آپ مجھ سے دور تھوڑی ہیں بس کچھ دن اور۔۔۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔۔۔ میں آجاؤں گی۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اجازت طلب نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔ تایا جان نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ "ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔"

اس کے وعدے پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور کچھ ان کے دل پر بوجھ بھی تھا کہ جب وہ مشکل میں تھی اسے ساتھ لے جانے کوئی نہیں آیا تھا۔ اب اس پر زبردستی کیا کرتے۔ بس کچھ دن کہہ رہی ہے پھر ہم لے جائیں گے اسے۔۔۔ وہ دل ہی دل میں تہیہ کرنے لگے۔

"تم فکر نہ کرو عبید! میں اسے اب کبھی بے آسرا نہیں ہونے دوں گا۔" اپنے مرحوم بھائی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

تقسیم ہند سے قبل مطیع الرحمان اپنے بھرے پرے خاندان کے ساتھ آگرہ میں رہا کرتے تھے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ پورا خاندان مل جل کر رہتا تھا۔ مطیع الرحمان کی شادی صبیحہ بیگم سے ہوئی تھی اور ان کا ایک بیٹا بھی تھا شفیق الرحمان۔ پاکستان وجود میں آیا تو مطیع الرحمان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلے آئے۔ وطن کی محبت میں انہوں نے گھر والوں کو بھی ناراض کر دیا' جو ہندوستان چھوڑنے کے خلاف تھے۔ یہاں آکر انہوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ سستا زمانہ تھا اور ہم وطن ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک تھے۔ چند سالوں میں وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنے بیوی' بچوں کے لیے ایک مکان خرید لیا اور اطمینان سے رہنے لگے۔ اسی دوران آمنہ پیدا ہوئیں۔

حالت بہتر ہونے کے بعد مطیع الرحمان نے اپنے خاندان والوں سے رابطہ کیا۔ تھوڑی ناراضی دکھا کر وہ لوگ مان گئے۔ مطیع الرحمان اپنے بڑے بیٹے شفیق الرحمان کو لے کر آگرہ گئے۔ واپسی پر ان کے والدین ہمراہ تھے۔ مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن لاڈلی بیگم اپنے چچازاد سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ اپنے والدین کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ ان کی خدمت کریں' سو ہمیشہ کے لیے انہیں لاہور لے آئے۔

عبید الرحمان آمنہ سے چھ سال بعد دنیا میں آئے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی وہ شدید بیمار ہوئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ مستقل علاج اور دعاؤں سے وہ صحت یاب تو ہو گئے لیکن صبیحہ بیگم کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا۔ وہ عبید کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتیں۔ انہیں ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے دور نہ ہونے دیتی تھیں۔ اسی باعث ان کا اسکول بھی دیر سے شروع ہوا کہ صبیحہ بیگم میں انہیں خود سے جدا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

عبید الرحمان کے بعد قدسیہ کی پیدائش ہوئی لیکن اسے ماں کی وہ توجہ نہ مل سکی' جو دو بڑے بھائی' بہن کو مل چکی تھی اور عبید کو ابھی تک مل رہی تھی۔ اس کا

خیال رکھنا' دادی بیگم اور آمنہ کی ذمہ داری تھی اور انہوں نے اپنی یہ ذمہ داری خوب نبھائی تھی۔

مطیع الرحمان کے والد کا انتقال ہوا اور جائیداد بٹ گئی۔ ان کے چچا اور تایا نے ایمان داری سے ان کا حصہ انہیں پہنچادیا۔ اس رقم سے مطیع الرحمان نے کاروبار شروع کیا۔ جس میں اللہ نے خوب برکت دی اور رزق میں کشائش ہونے لگی۔ لاڈلی بیگم کبھی سال دو سال میں بھائی کے گھر چکر لگالیا کرتی تھیں۔

صبیحہ بیگم کی ایک ہی بہن تھیں جو آگرہ میں مقیم تھیں۔ ایک دن انہیں اطلاع ملی کہ بہنوئی حادثے میں مارے گئے ہیں۔ وہ فی الفور عبید الرحمان کے ساتھ آگرہ پہنچیں۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ سسرال والوں کا سلوک صالحہ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہے۔ صالحہ کے تین بچے تھے۔ گلناز تو عبید سے ڈھائی سال چھوٹی تھی لیکن اس کے دو جڑواں بچے فقط چھ ماہ کے تھے۔ ان دونوں بہنوں کا میکہ تو رہا نہ تھا۔ والدین انتقال کرچکے تھے۔ صالحہ کو تنہا مصیبت میں چھوڑنا صبیحہ بیگم نے گوارا نہ کیا۔ انہوں نے مطیع الرحمان سے فون پر رابطہ کیا اور ان کی اجازت سے اپنی بہن صالحہ اور اس کے تینوں بچوں کو لے کر واپس لاہور آگئیں۔

مطیع الرحمان سادگی پسند اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نہایت دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ صالحہ کو انہوں نے اپنی بہن سمجھ کر اپنے گھر میں رکھا اور اس کے بچوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے رہے۔ صبیحہ بیگم بھی ایک سگھڑ اور سمجھ دار عورت تھیں۔ انہیں فضول خرچی کی عادت نہیں تھی اور اپنے بچوں کی بھی انہوں نے اچھی تربیت کی تھی۔

دونوں بہنوں کی اولادیں آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ جس طرح انہوں نے اپنے بڑوں کا اتفاق سلوک دیکھا تھا۔ وہی اپنائیت ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھی۔

گریجویشن کے بعد شفیق الرحمان نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کردیا اور رزلٹ آتے ہی بینک میں نوکری کے لیے اپلائی کردیا۔ بینک میں نوکری لگ گئی لیکن اسکول والے ان جیسے قابل استاد کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ انہوں نے بصد اصرار انہیں راضی کرلیا کہ وہ دوپہر میں ایک گھنٹے کی کلاس لے لیا کریں۔ بینک میں نوکری مل جانے کے بعد والدین نے شادی کی بات طے کردی تھی۔ مطیع الرحمان نے اپنے دوست کی بیٹی عافیہ کو ان کے لیے پسند کیا تھا۔ صبیحہ بیگم کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی بینک والوں نے ان کا ٹرانسفر ابوظہبی کردیا۔ والدین کی اجازت سے شفیق الرحمان عافیہ کو لے کر ابوظہبی روانہ ہوگئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ ان ہی دنوں عبید میٹرک کے امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے۔ صالحہ بیگم کی بیٹی گلناز نویں جماعت میں اور قدسیہ ساتویں میں پڑھ رہی تھیں۔ گلناز کے جڑواں بھائیوں میں سے ایک کم عمری میں ہیضے کی وبا کا شکار ہوکر چل بسا تھا۔ دوسرا بھائی ٹیپو پہلی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ عبید الرحمان اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسے بھی ان کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

صبیحہ بیگم کے لاڈ پیار نے عبید کو تھوڑا ضدی بنادیا تھا اور وہ غصے کے بھی تھوڑے تیز تھے۔ کچھ باتوں پر انہیں بلا سوچے سمجھے غصہ آجاتا۔ تب چھوٹے بہن بھائی (ٹیپو اور قدسیہ) گھر کے کسی کونے میں جادبکتے۔ ایسے میں گلناز نہایت سمجھ داری سے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا کرتی۔ اس کی طبیعت میں صبر و تحمل تھا۔

بڑی بیٹی کی حیثیت سے آمنہ نے گھر کے نظم و نسق میں صبیحہ بیگم کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا تھا۔ تب ہی شفیق الرحمان کے توسط سے ابوظہبی میں مقیم خاندان سے ان کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا۔ وہ لڑکا بھی وہیں شفیق الرحمان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ لڑکے کے والدین سے ملتے ہی فوراً" رشتہ منظور کرلیا گیا اور گھر میں آمنہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

صالحہ نے شروع دنوں سے اپنی بیٹی گلناز کو گھر کے کاموں کا عادی بنایا تھا۔ مطیع الرحمان نے اپنے گھر کے بالائی حصے میں ان کے لیے ایک پورشن مختص کررکھا تھا۔ جہاں پر باورچی خانے کے علاوہ دو بیڈ روم اور ایک اسٹور روم بنوایا گیا تھا۔ وہ صالحہ کو الگ سے خرچا دیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی مرضی سے اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرسکیں۔ انہوں نے احسن طریقے سے مدد کرنے کے ساتھ انہیں خود مختار بھی کررکھا تھا۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو زیربار نہ محسوس کریں اور ان کے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

آمنہ کی شادی کی تیاریوں میں گلناز اور صالحہ نے صبیحہ کا بے حد ہاتھ بٹایا۔ صبیحہ' آمنہ اور صالحہ کو لے کر جہیز کی خریداری کے لیے بازار جاتیں تو گھر کو سنبھالنے کی پوری ذمہ داری گلناز کے کندھوں پر ہوتی تھی۔ کھانا پکانے اور قدسیہ کی پڑھائی میں مدد کے ساتھ وہ گھر کے تمام کام بھی اپنے ذمہ لے لیا کرتی۔ وہ بی اے فرسٹ ایر میں تھی۔ اپنی پڑھائی کے ساتھ وہ باقی کام بھی خوش اسلوبی سے کررہی تھی۔

آمنہ کی رخصتی ہوجانے کے بعد بھی اس نے صبیحہ بیگم کا ہر طرح سے خیال رکھا اور انہیں آمنہ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اپنے حسن سلوک کی بدولت وہ صبیحہ بیگم کے دل میں گھر کرگئی اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ گلناز کو اپنی بہو بنائیں گی۔ عبید الرحمان کے لیے گلناز سے بہتر کون لڑکی ہوسکتی تھی۔ وہ ان کی مزاج آشنا تھی۔ بھلے شکل و صورت کے لحاظ سے عبید کے سامنے دبتی تھی' پر اس چیز کی صبیحہ بیگم کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ خود بھی بس قبول صورت تھیں۔ لیکن اس کے مزاج کے سبب اسے بہت چاہنے لگی تھیں۔ کیسی ہی ان کی بہن اور اس کی بیٹی تھی۔ انہوں نے مطیع الرحمان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگے۔

"عبید کے لیے تو اماں بیگم' طوبیٰ کا کہہ رہی تھیں۔"

طوبیٰ مطیع الرحمان کی بہن لاڈلی بیگم کی چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ صبیحہ بیگم کو برا تو لگا کہ ان کی ساس نے اکیلے میں بیٹے کے سامنے نواسی کا نام لیا اور ان سے مشورہ لینا بھی ضروری نہ سمجھا' جبکہ وہ ہمیشہ دل و جان سے ان کی خدمت کرتی آئی تھیں لیکن اس وقت یہ جتانا مطیع الرحمان کی ناراضی کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ وہ حسب عادت اپنے دل کا حال پوشیدہ رکھتے ہوئے میٹھے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"یہ تو اماں بیگم کی محبت ہے کہ انہوں نے ہمارے عبید کے لیے سوچا۔ طوبیٰ بہت پیاری بچی ہے' لیکن اگر بہو کی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔" وہ سنبھل سنبھل کر گفتگو کرنے کے ساتھ مطیع الرحمان کے چہرے کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ ابھی تک تو ان کے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے صبیحہ بیگم نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"ہمارے گھرانوں میں شکل و صورت سے زیادہ لڑکی کا سگھڑاپا دیکھا جاتا ہے۔ اس کی نرم مزاجی' گفتگو کا سلیقہ' بڑوں کا ادب' چھوٹوں کا لحاظ ہوتا' یہ سب اہمیت رکھتا ہے۔ اب آپ ہماری ہی مثال لیجیے' بھلا آپ جیسے خوبرو اور وجیہہ شخص کے سامنے ہم جیسی معمولی شکل و صورت اور پستہ قامت لڑکی کی اوقات ہی کیا تھی؟ پر اماں بیگم نے آپ کی چچازاد حسن آرا کو چھوڑ کر ہمیں پسند کیا حالانکہ ہم غیر بھی تھے۔"

مطیع الرحمان انہیں ٹوکے بغیر نہ رہ سکے۔ "ایسا مت کہیے۔ آپ ہماری نظر میں دنیا کی حسین ترین خاتون سے کم نہیں۔"

صبیحہ بیگم تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر مسکرائیں۔

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر ذرا سوچیے اگر میں نے آپ کے گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش میں کوتاہی برتی ہوتی تو گزارا کیسا ہوتا؟ فقط حسن و جمال کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ لڑکیوں میں گھر بنانے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے۔ طوبیٰ کی پرورش لاڈلی بیگم نے ذرا زیادہ ہی لاڈ پیار سے کی ہے۔ تھوڑی منہ زور ہے اور گھرداری سے حد درجہ بے زار بھی۔ ہاتھ میں کوئی ہنر بھی نہیں ہے۔ میں نے لاڈلی بیگم کو ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے۔ میرے لیے گلناز اور طوبیٰ ایک

جیسی ہیں۔ باقی رہا عبید کی شادی کا فیصلہ۔ تو آپ کا اور اماں بیگم کا عبید پر زیادہ حق ہے۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا۔"
صبیحہ بیگم شوہر کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کرنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئیں۔ انہوں معلوم تھا مطیع الرحمان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

☼ ☼ ☼
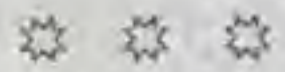
اگلی صبح وہی ہوا' جو صبیحہ بیگم چاہتی تھیں۔ مطیع الرحمان نے اماں بیگم کو طوبیٰ کے لیے انکار کردیا اور کچھ دنوں بعد لاڈلی بیگم سے فون پر یہ کہا کہ "طوبیٰ کے لیے جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ آئے بات طے کردینا۔" یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ہمارے بھروسے بچی کو بٹھائے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔
لاڈلی بیگم جانتی تھیں کہ ان کی والدہ نے طوبیٰ اور عبید کے رشتے کی خواہش کی تھی۔ اپنے بھائی کی بات سن کر انہیں بہت مایوسی ہوئی تھی' پر انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ مطیع الرحمان نے اس بات کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے صبیحہ بیگم کو تاکید کی تھی۔
"فی الحال اپنے اس ارادے کا کسی سے ذکر مت کیجئے گا کہ ہم گلناز کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے بھی اماں بیگم سے کچھ نہیں کہا ہے۔ ورنہ انہیں افسوس ہوتا کہ ہم نے سگی بہن کی اولاد پر صالحہ کی بیٹی کو ترجیح دی ہے۔"
صبیحہ بیگم نے تابعداری سے سر ہلادیا۔ ان کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ شوہر کے سامنے انہوں نے طوبیٰ کی ہنسنے بولنے والی طبیعت کو کھلنڈرا پن اور غیر ذمہ داری ظاہر کیا تھا۔ طوبیٰ کے مقابلے میں گلناز انہیں زیادہ پیاری تھی۔
عبیدالرحمان نے تعلیم مکمل کرتے ہی عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔ ان کا رجحان نوکری سے زیادہ کاروبار کی طرف تھا۔ ان کے ایک دوست کے والد کی فیصل آباد میں سوتی کپڑے کی فیکٹری تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر مال ایکسپورٹ کیا کرتے تھے۔ عبید اپنے دوست کے ذریعے ان سے ملے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے تیار کردہ کپڑے کے ملبوسات بنا کر فروخت کریں۔ اس کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی اور ایک ایسے شخص کی بھی جو لاہور میں ان کی برانڈ کو پہچان دلا سکے۔
عبید نے اپنے والد اور بھائی شفیق الرحمان کی مدد سے پیسوں کا انتظام کیا اور اپنے دوست کے ساتھ پارٹنر شپ کرلی۔ چند ایک سال کاروبار کو جمانے میں عبید نے دن رات محنت کی۔ جس کا پھل یہ ملا کہ کاروباری حلقوں میں ان کی ساکھ بہتر سے بہتر ہوتی رہی اور منافع میں اضافہ بھی ہونے لگا۔
اب صبیحہ بیگم سنجیدگی سے عبید کی شادی کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ مناسب وقت تھا کہ عبید اور گلناز کی شادی کردی جائے۔
گلناز ان ہی کے گھر میں پلی بڑھی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی ماں اور خالہ کی وہ گفتگو اتفاقاً "سن لی' جس میں صبیحہ بیگم صالحہ کو اس کے لیے آئے رشتے سے انکار کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اسی دم صبیحہ بیگم نے اسے اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار بھی کردیا تھا۔ معصوم لڑکی اس دن سے عبید کو اپنے شوہر کے روپ میں دیکھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼
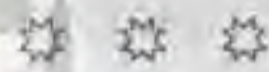
صبیحہ بیگم کی ایک جاننے والی اپنی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ لائیں۔ وہ پہلے صبیحہ بیگم کے گھر کے ساتھ والے مکان میں رہا کرتی تھیں۔ دو سال پہلے ہی انہوں نے گھر بدلا اور گلشن اقبال شفٹ ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود پرانے محلے داروں سے میل جول برقرار تھا۔ وہ اپنی بیٹی آسیہ کی شادی کا کارڈ لے کے آئیں اور پورے خاندان کو شرکت کی دعوت دے کر چلی گئیں۔ ان ہی دنوں آگرہ سے لاڈلی بیگم بھی اپنے بچوں کے ساتھ ایک مہینے کے لیے لاہور آئی ہوئی تھیں۔ تمام رشتہ دار اور جان پہچان کے لوگ ان سے ملنے آرہے تھے یا اپنے گھر دعوت پر بلا رہے تھے۔

مہندی والے روز مطیع الرحمان نے اماں بیگم کی مہندی پر جانے سے معذرت کرلی تھی۔ اماں بیگم اپنی ضعیفی کے باعث کم ہی کہیں آیا جایا کرتی تھیں۔ قدسیہ اور طوبیٰ بخوشی ان کے ساتھ چلنے پر راضی تھیں۔ عبیدالرحمان بادل نخواستہ راضی ہوئے تھے کہ گاڑی انہیں ہی چلانی تھی۔ یہ جمعہ کی رات تھی اور ایک نئی فلم "ولاجٹ" سینما کی زینت بننے جارہی تھی۔
عبید کے لڑکپن کا یہ واحد شوق ہنوز برقرار تھا۔ سینما میں پہلی فلم "ارمان" دیکھی تھی انہوں نے بارہ سال کی عمر میں۔ جس کے گیتوں کی کتاب خرید کر انہوں نے اس کی شاعری کو حفظ بھی کیا۔ "طلسم کدے" میں رکھنے والا یہ پہلا قدم ہرگز آخری ثابت نہیں ہوا تھا۔ گھر والوں سے چھپ کر یہ مشغلہ دوستوں کی مہربانی سے جاری وساری رہا۔ بورڈ کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد تو وہ دوستوں کے ہمراہ ہر جمعہ اور اتوار کا لیٹ نائٹ شو دیکھ کر ہی گھر واپس آتے تھے۔ مطیع الرحمان نے کئی بار سرزنش کی' حتیٰ کہ مرغا بنا کر پٹائی بھی کرڈالی مگر بے سود۔ نہ وہ عبیدالرحمان کی دوستیاں چھڑوا سکے اور نہ ہی فلمی شوق۔ اس کی بڑی وجہ صبیحہ بیگم بھی تھیں' جو اپنے لاڈلے کی اس دلیل کے ساتھ پشت پناہی کرتی تھیں کہ "ذرا سی تفریح ہر انسان کا حق ہے اور عبید نے کبھی اس شوق کی آڑ میں اپنی کسی بھی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑا تھا' نہ ہی ان کی پڑھائی متاثر ہوئی تھی' ان کی بیوی والدین کی طرف سے بے جا اس بے ضرر شوق پر قدغن لگائی جائے تو یہ درست نہ ہوگا۔"
مطیع الرحمان کو غصہ ان کی تفریح پر نہیں ان کی ہٹ دھرمی پر آیا کرتا تھا۔ لیکن صبیحہ بیگم کی وجہ سے وہ خاموش ہوگئے۔ عبید نے جب کام شروع کیا تو دل لگا کر کیا اور کاروبار جم جانے کے بعد یہ تفریح دوبارہ شروع کی تھی۔ ان کے والد مطیع الرحمان کو سوائے اس ایک مشغلے کے ان سے اور کوئی شکایت نہ تھی۔
اب آسیہ کی مہندی پر لے جانے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ یوں پہلا شو چھوٹ جانے کا انہیں بے حد قلق تھا کہ جب تک مہندی کی تقریب اختتام پذیر نہ ہوجاتی۔ ان کا واپس آنا ناممکن تھا۔
لیکن۔۔۔ وہاں قسمت نے کچھ ایسی مہربانی کی کہ جس قدر بھناتے ہوئے گئے تھے' اسی قدر خوشی سے گنگناتے ہوئے واپس لوٹے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صباحت یاسمین

موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں معمول سے کچھ زیادہ کھلیں اور پتلیاں ساکت ہوگئیں۔ میں نے اس سے نظریں ہٹا کر پھرتی سے اپنا کام کیا۔ نماز کے بعد میں اکثر ہی لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتا اور وہ پاس ہی ہوتی۔ ابھی بھی وہ پاس تھی۔ مگر کام کچھ ایسا تھا کہ میں اس کی غیر موجودگی چاہتا تھا۔ جب ہی میں نے اسے اپنا موبائل چارجنگ پہ لگانے اور سیب کاٹ کر لانے کو کہا۔

محض یہ دیکھنے کے لیے وہ موبائل چارجنگ پہ لگا کر کسی کام سے بیڈ کی طرف واپس تو نہیں آئے گی۔ میں نے اس پہ نظر رکھی اور موبائل کو اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچتے دیکھا۔

میرا کام ہوچکا تو میں نے مطمئن ہو کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک ساکت پتلیاں لیے چارجر سوئچ بورڈ کے پاس لیے جامد کھڑی تھی۔ یقیناً "فیس بک" پہ کوئی حیران کن ویڈیو کلک کردی ہوگی۔

کافی دیر بعد اس نے ذرا سی حرکت کی، میں نے اس کی انگلیاں موبائل کی ٹچ اسکرین پہ حرکت کرتی دیکھیں اور آخر کار بہت دیر بعد وہ چارجر لگا کر سیب لانے کے لیے کمرے سے نکلی۔ میں پھر لیپ ٹاپ میں مگن ہوگیا۔ ابھی وہ واپس نہ آئی تھی کہ فون بجنا شروع ہوا۔ تین، چار بیپ ہونے تک میں نے انتظار کیا کہ وہ آئے اور مجھے فون تھما جائے، مگر وہ نہ آئی تو مجھے خود ہی اٹھنا پڑا۔

جب تک میں دیوار کے ساتھ والے صوفے پہ رکھے موبائل تک پہنچا، کال کٹ گئی تھی۔ نمبر دیکھنے کے لیے میں نے موبائل اٹھایا۔ جم والے دوست کی کال تھی۔ کال سے نیو مس کال کا سائن ہٹا تو اسکرین وہ منظر دکھانے لگی جو اس کال سے پہلے کا تھا۔

"او مائی گاڈ!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

مجھے خود پہ بے طرح غصہ آیا۔ اسی طرح کی ایک چیز لیپ ٹاپ پہ چھپاتے چھپاتے میں انجانے میں اسے موبائل پہ وہی کچھ دکھا گیا۔ موبائل پاور آف کر کے میں بیڈ پہ جا ٹکا۔ چند ثانیے بعد وہ آئی۔ میری حسب پسند سیب کی آدھی قاشیں بنا چھلکے کے تھیں اور آدھی چھلکے کے ساتھ، ٹرے میں ساتھ ہی کالی مرچ اور پانی کا ادھر بھرا گلاس بھی۔

"تھینک یو!" میں نے دھیمے سے کہہ کر ٹرے تھامی۔

"شلوار قمیص پہنیں گے یا جینز شرٹ؟"

وہ پوچھتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہی نارمل پہلے سا انداز لیے، مجھے — ڈھارس ہوئی۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ اس نے بھیجی گئی اور ریسیو کی گئی تصویریں دیکھ لی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"ثانی!" اسپورٹس میگزین کی ورق گردانی کرتے میں نے اسے مخاطب کیا۔

"جی۔۔۔" وہ مڑے بنا بولی۔ اس کے ہاتھ میں میرے کئی استری شدہ ہینگ ہوئے سوٹ تھے۔ جنہیں وہ ترتیب سے الماری میں لگا رہی تھی۔

"تم خوش نہیں ہو مجھ سے؟" ذرا سا جھجکتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"ہاہاہا۔۔۔" اس نے قہقہہ لگایا اور میرے پاس آ بیٹھی۔

"ایسا کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"تم باتیں دل میں رکھ لیتی ہو۔"

"کیا بات رکھی میں نے دل میں؟" اس کا معصوم بھولا چہرہ یہ پوچھتے ہوئے مکمل انجان دکھا۔

"وہی۔۔۔ جو اس روز صبح۔۔۔ تم نے تصویریں دیکھیں۔"

جانے کیا بات تھی کہ میں اٹکا اور میگزین کے صفحے سے نظریں باوجود کوشش کے اٹھا نہ سکا۔

"ہاہاہا" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ "میں ناراض ہوئی ہوں کیا آپ سے؟"

"نہیں بظاہر نہیں، مگر تمہارے دل میں بات ہے۔"

"آپ کا کوئی کام نہیں کیا جو آپ کو یہ لگا؟ یا میں نے کچھ جتایا؟"

"نہیں، ایسا بھی کچھ نہیں ہے، مگر مجھے پتا ہے، تم

دل میں رکھ لیتی ہو۔"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ کہتے ہی اٹھی۔
"ثانی۔۔۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر روکا۔
"فرمائیے!" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ میں جو ذرا سا اس کی طرف دیکھنے کی ہمت کر بیٹھا تھا بری طرح ڈگمگایا۔
"ہم۔۔۔ میں گک۔۔۔ کیسے مان۔۔۔ لوں کہ۔۔۔ تمہارے۔۔۔ دل میں یہ بات نہیں؟" جانے کیوں میں پھر ہکلایا۔
"اس لیے کہ میرا دل چوزہ سا ہے اور یہ بات تھوڑی زیادہ ہی بڑی ہے' یہ میرے دل میں آ ہی نہیں سکی۔"
متانت سے کہہ کر اس نے ذرا سا جھٹکا دے کر اپنی کلائی چھڑائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا سر جھک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کمبل اٹھائے کمرے میں آ گئی۔ وہی پہلے والا نارمل سا انداز' میں نے خود کو ذرا ذرا ریلیکس ہوتے پایا۔

☼ ☼ ☼
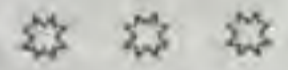
وہ نک سک سے تیار ہو کر میرے برابر آ کر بیٹھی۔ برانڈڈ سوٹ' جوتا' ہلکی سی لپ اسٹک' بھینی خوشبو والا باڈی اسپرے' میچنگ بیگ' بریسلٹ' گولڈ کی چین' ٹاپس' وہ شاپنگ کے لیے جی لگا کر تیار ہوئی تھی۔
"علی نے جس باڈی اسپرے کا کہا ہے اس کی تصویر لے لیتی تھی۔ جانے اس نام سے کتنے ہی ہوں۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اچانک ہی کہا۔
"آپ کے موبائل میں ہے نہیں تصویر اس کی؟" اسے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس کام کے لیے واپس جانا واضح برا لگا۔
"ہاں لیکن اس کی بیٹری ابھی گئی کہ ابھی گئی' تم جاؤ لیپ ٹاپ سے اپنے موبائل میں لے آؤ۔"
وہ منہ بسورتی اندر چلی گئی۔
"میرے ایف بی اکاؤنٹ پہ علی نے چیٹ میں پک بھیجی ہوئی ہے۔" میں نے پیچھے سے آواز لگائی اور میوزک سسٹم پہ اپنی پسند کا گانا لگا کر سیٹ سے سر ٹکایا۔ چند منٹوں بعد مردہ ہوتے' میرے موبائل کی بپ بجی۔ میں نے اپنے موبائل پر بھی فیس بک لے رکھا تھا اور اس کے نوٹیفکیشنز مجھے موبائل پر مل جاتے تھے۔
"شٹ۔۔۔!" فیس بک کے متعلق تازہ ترین اپ ڈیٹ سامنے تھی جسے دیکھتے ہی میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور بجلی کی سی تیزی سے گاڑی سے نکل کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف گیا۔
وہ لاؤنج کے مرکزی صوفے کے سامنے والے ٹیبل پہ لیپ ٹاپ رکھے دو زانو بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اپنی جگہ پہ جم گیا۔ علی کے علاوہ کسی اور کانٹیکٹ سے ابھی ابھی چیٹ میں بھیجی گئی تصویر کھلی ہوئی تھی اور مجھے اتنے فاصلے سے بھی واضح نظر آ رہی تھی۔
ثانی ٹوہ میں نہیں رہتی تھی۔ عام سی بات ہے کہ آپ کسی فرینڈ سے چیٹ کر رہے ہیں یا اس کی چیٹ پڑھ رہے ہوں اور کسی دوسرے کانٹیکٹ سے کوئی نیا میسج آ جائے تو آپ فوراً" ہی اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ادھر کھڑا رہوں' آگے بڑھوں یا واپس گاڑی کے پاس چلا جاؤں۔
میرا دل اور ضمیر اس تصویر کے ساتھ موجود پیغام سے نظریں چرا رہا تھا۔
"تھینکس فار لولی اینڈ رومانٹک ڈرائیو پلس ڈنر۔"
میں رات لیٹ آیا تھا۔ کیونکہ دوست کے گھر پارٹی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے میری شرٹ کے بٹن روزانہ بند کرنے والی ثانی کو یہ تو یقیناً" یاد ہو گا کہ جو شرٹ میں نے کل رات ہی اتاری تھی اس سے ملتا جلتا رنگ میری یہ پرانی شناسا اس تصویر میں پہنے ہوئے میرا بازو جکڑے کھڑی ہے۔ کچھ دیر بے حس و حرکت رہنے کے بعد ثانی نے اپنے سر پہ ہولے سے چپت لگائی اور لیپ ٹاپ بند کرنے لگی۔

زمین سے اٹھتے ہوئے جانے کیوں اس نے بوڑھوں کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھا تھا اور جب وہ میری طرف مڑی تو کمرے کے ہزارویں حصے کے لیے مجھے لگا' اس کا چہرہ تاریک سا ہے اور وہ جو تھوڑی دیر پہلے اتنی نکھری ہوئی لگ رہی تھی' اب نہیں لگ رہی ہے۔ اتنی تیاری کے باوجود مگر یہ شاید میرا وہم تھا۔
"لے لی علی کی بھیجی تصویر۔" وہی نارمل پہلے سا انداز۔۔۔ میری اٹکی ہوئی سانس رواں ہوئی' مگر پھر یہ رستہ بھر بار بار اٹکتی رہی' جانے کیوں؟ وہ تو بالکل پہلے سی تھی' میری پسند کی چیزیں چھوڑ کر اس نے اپنی تجویز کردہ اشیا میرے لیے زبردستی خریدیں۔ اپنے لیے بھی حسب عادت کافی کچھ لیا۔ جس میں سے کچھ کچھ فضول بھی تھا۔ پزا کھا کر نکلتے ہی اسے گول گپوں کی ریڑھی نظر آئی تو اس نے کسی بھی عام دن کی طرح آج بھی گول گپے کھانے کی پہلے فرمائش اور بعد میں ضد کی۔ ففٹی پرسنٹ اور تھرٹی فائیو پرسنٹ آف والے ٹیگز اسے جہاں بھی دکھے' وہ بری طرح مچلی اور مجھے چار و ناچار اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا۔ میں دن بھر سوچتا رہا کہ وہ ناراض ہے کیا؟
مگر نہیں' ناراضی تو اس کے کسی انداز میں نہ دکھ رہی تھی۔
تو کیا وہ سمجھ دار ہو چکی ہے' جو ایسی "چھوٹی سی بات" کو نظر انداز کر دیا۔
نہیں شاید نہیں' سمجھ دار ہوئی ہوتی تو اتنی آرام دہ تھوڑی نظر آ رہی ہوتی۔ ہر دوسرے شاپنگ مال میں گھنٹہ گھنٹہ بھر سکون سے ٹہلتی تو نہ رہتی۔
"آئی تھنک وہ اس بات پہ سمجھوتے کے لیے رضامند ہے کہ ایسے اتفاقات کبھی کبھار ہو ہی جاتے ہیں۔"
یہی آخری بات قدرے دل کو لگتی تھی۔ باقی میرے خیالات تو مجھے خود بھی فضول لگے۔
اگر یہ اتنی کوآپریٹو ہے اور اعتماد بھی کر رہی ہے تو تمہارا یہ سلسلہ آج ہی بند کرتا ہوں۔"
بلاشبہ یہ ارادہ میں اس مہینے میں تیسری بار کر رہا تھا' لیکن اب کی بار مجھے یہ یقین تھا کہ میں اپنے ارادے پہ ڈٹا رہوں گا۔ ضمیر میرے اس فیصلے سے خوب خوش ہوا۔ میں خود کو ملامت کرتا رہا کہ جو سلسلہ نسبت طے ہونے کے بعد رک گیا تھا وہ شادی کے کچھ عرصہ بعد پھر چلا ہی کیوں؟ مس کال' میسج' کال' پیکج ٹائم کال' ایم ایم ایس' میلز' فیس بک اور اب نئے سرے سے شروع ہونے والی ملاقاتیں۔
مرحلہ در مرحلہ میں اس بھنور میں پھنسا اور انجوائے کرنے لگا۔
"تف ہے مجھ پہ" بس نہیں چل رہا تھا کہ خود کو ایک تھپڑ ہی دے ماروں۔ مصروف سا دن گزار کر ہم گھر واپس آئے تو وہ کام کاج میں لگ گئی' میں نے نیند کا ٹائم ہونے تک اپنا وقت نیوز اور ٹاک شوز میں کھپایا۔ لیپ ٹاپ لاؤنج کے ٹیبل پر ہی دھرا رہا۔ بند موبائل بنا آن کیے چارج پہ لگا دیا تھا۔ ہم سونے کے لیے لیٹنے لگے تو دل یکبارگی دھڑکا۔
"شاید اب یہ کچھ پوچھ لے۔ میں کیا جواب دوں گا؟"

"نئی سینڈل میرے پاؤں پہ کتنی جچ رہی تھی نا؟"

وہ لیٹتے ہی حسب سابق اپنی شاپنگ کے متعلق باتیں کرنا شروع ہو گئی۔ میں تمام چیزوں پہ ایسے تبصرے کرتا رہا کہ اسے پسند آئیں اور وہ خوش ہوتی رہے۔

"ارے یاد آیا۔" اچانک وہ اٹھ بیٹھی۔

"کیا؟" میں بے طرح گھبرایا۔

"دودھ ٹھنڈا ہو چکا تھا' پھر بھی فریج میں نہیں رکھا۔ بھلکڑ ہوں میں بھی۔"

آخری جملہ اس نے خود کو ڈپٹنے والے انداز میں بولا اور اپنے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔

ایک دم مجھے کسی بات کا ادراک ہوا تھا۔

"نہیں۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

وہ بلی کی طرح چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتر کر کچن میں جا چکی تھی۔

وہ بھلکڑ تھی اور ایسی ملامتی چپت خود کو تب لگاتی' جب اسے احساس ہوتا کہ اس نے ایک بار پھر کچھ بھول جانے کی عادت دہرائی ہے۔ حماقت دکھائی ہے۔

وہ چٹوری تھی۔ پیٹ بھرا ہونے کے بعد بھی من پسند شے ملتی تو ٹھونستی جاتی۔ حتیٰ کہ اوور ایٹنگ کر جاتی اور جب اسے محسوس ہوتا کہ اس نے ایک بار پھر ضرورت سے زیادہ کھانے کی حماقت کی ہے۔ تب بھی وہ خود کو ایسی ملامتی چپت لگاتی۔

یعنی وہ... یعنی میری ثانی... اس بات کی عادی ہو چکی ہے کہ میں... اس کا مہذب شوہر اسے ایسا ہی ملوں گا۔

وہ جو اپنے حصے کی توجہ مجھے میری ماں' بہنوں کو بھی نہ دینے دیتی تھی' اسے میں نے توجہ شراکت کے کرب سے گزارا' اتنی بار اور اس تسلسل کے ساتھ کہ وہ اس کی عادی ہو گئی۔

اور اب اگر وہ میری کوئی چوری پکڑ لیتی ہے۔ تو واویلا نہیں کرتی۔ پہلے کی طرح پوچھ تاچھ نہیں کرتی۔ وعدے نہیں لیتی' بلکہ کسی روبوٹ کی طرح جذبات سے عاری ہو جاتی ہے اور بس اتنا سوچتی ہے کہ اس نے ایک بار پھر جان لینے کی حماقت دکھائی ہے۔

میں نے اسے عادی بنا دیا۔

"او میرے خدا یہ میں نے کیا کیا؟"

میں بال نوچنے ہی لگا تھا کہ وہ واپس آ گئی۔ کچھ دیر آج کی شاپنگ کی باتیں اور کچھ دیر آئندہ کی شاپنگ کی پلاننگ کر کے وہ سو گئی۔

"میں معافی مانگ لوں گا۔ صبح ہوتے ہی میں معافی مانگ لوں گا۔"

شور مچاتے ضمیر کو میں نے اطلاع دی۔ ہر بار میں اس سے معافی مانگتا تھا' ہر بار وہ پر یقین ہوتی تھی کہ میں اس کا مجرم ہوں' لیکن اس بار وہ مزید جان گئی تھی' پہلے اسے صرف اتنا پتا ہوتا تھا کہ میں مجرم ہوں اب وہ یہ بھی تسلیم کر چکی ہے کہ میں عادی مجرم ہوں۔

اور پھر صبح ہوتے ہی میں نے اس سے معافی مانگ لی اور پکا ترین وعدہ کیا۔ حالانکہ اب کی بار اس نے جھوٹے منہ بھی مجھ سے کوئی وعدہ نہ مانگا تھا۔

مزید یہ ہوا کہ ایسی صبحیں زندگی میں بار بار آتی رہیں کہ میں معافی مانگتا اور وہ معاف کرتی رہی۔

میں اس بری عادت کا اور پھر معافی مانگنے کا عادی ہو چکا ہوں اور وہ اپنے خوب صورت ہاتھ میرے معافی کے لیے بندھے ہاتھوں پہ رکھ کہ معاف کر دینے کی عادی ہو چکی ہے۔

سب کچھ ٹھیک ہے چند دن خراب بھی ہو تو پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔

مگر میں اس بات کا عادی آج تک نہیں ہو سکا کہ وہ بلند و بانگ' کھوکھلے بے جان قہقہوں کی عادی ہو چکی ہے۔

فقط اک بات میرے لیے آج بھی نئی ہے۔ جس کا میں بالکل عادی نہیں کہ وہ مسکرانا بھول چکی ہے۔

عظمیٰ افتخار

محبت ازل سے ایسا

"تم خود ہی بتاؤ رومیو کیا میں آرگنائزڈ نہیں ہوں؟ اور تم نے میرا کمرا تو دیکھا ہے نا جولیٹ! کتنا صاف ستھرا ہوتا ہے اور میری الماری۔ اس میں ہر سوٹ استری شدہ ہوتا ہے۔ میری ڈریسنگ ٹیبل پر ساری چیزیں ترتیب سے رکھی ہوتی ہیں۔ پرفیومز، کریمیں، کاسمیٹکس۔ گرد کا ایک بھی ذرہ نہیں ہوتا۔ اور شو

رنگ۔ وہ بھی کتنا اچھا سیٹ کیا ہے میں نے۔ سلیپرز، ہائی ہیل شوز، سب کی الگ الگ ترتیب ہے۔ مگر پھر بھی ماما کو یہی لگتا ہے کہ میں ہر وقت فارغ رہتی ہوں اور وہ کوئی نہ کوئی ایسا کام ضرور ہی نکال لیتی ہیں۔ جس میں میرے ہاتھ اور پیر دونوں مصروف رہیں۔"

مژگان کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی چل رہی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ اپنے ٹیرس پر کاک ٹیل برڈز کی جوڑی کا پنجرہ صاف کرنا میں مصروف تھی اور ہمیشہ کی طرح اپنے عزیز از جان پرندوں "رومیو اور جولیٹ" سے دل کی باتیں بھی کیے جا رہی تھی، جو پنجرے کے اندر مٹی کے مٹکے پر یوں جمے بیٹھے تھے جیسے واقعی مژگان کی بات سمجھ رہے ہوں۔

اس نے مٹی کی کٹوریوں میں پانی اور باجرہ ڈال کر اور پنجرے میں رکھا اور پھر دروازے پر چھوٹا سا تالا لگا دیا۔ جھاڑو سے ماربل کے فرش پر بکھرا کچرا اسمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالا اور پھر وہیں پنجرے کے پاس آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی اور گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا، جہاں سے اس نے دو منٹ پہلے توڑا تھا۔

"اور میری آفس ٹیبل۔ وہ کتنی صاف ہوتی ہے، ہر کام وقت پر ختم کرتی ہوں۔ کبھی کوئی آفس اسائنمنٹ پینڈنگ میں نہیں رکھا۔" گال کے نیچے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ٹکائے اس نے دونوں کو دیکھا۔

"مگر تم دونوں کو کیا پتا۔ تم دونوں نے مجھے آفس میں کام کرتے ہوئے کب دیکھا ہے۔ لیکن خیر۔ میں تو بتا رہی ہوں نا۔ اپنی مژگان پر تم دونوں کو اتنا بھروسا تو ہے نا کہ جو بھی کہے گی سچ ہی کہے گی۔"

مژگان نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

رومیو، جولیٹ پلکیں جھپکانے میں ہی مصروف تھے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ تمہیں میری بات کا یقین آگیا ہے۔ آخر خاموشی کا مطلب نیم رضامندی ہی ہوتا ہے نا مگر ماما۔ انہیں کون سمجھائے، ہر وقت انہیں مجھ میں کیڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ایکسرے کرتی نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہیں۔ پرفیکٹ بنانے پر تلی رہتی ہیں۔ آفس کی تھکا دینے والی جاب کیا کم تھی۔ جو زبردستی جم بھی جوائن کروا دیا۔" مژگان نے برا سا منہ بنایا۔

"اب رومیو! تم ہی بتاؤ، کبھی کوئی ہنڈریڈ پرسنٹ پرفیکٹ بھی ہوا ہے؟ اگر انسان میں کمی یا خامی نہ ہو تو ہمیں اللہ کیسے یاد آئے۔ مگر ماما کو یہ بات کون

ناولٹ

سمجھائے۔ میں اگر اتنی کلو کی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور۔ اللہ میاں نے میری ہڈی چوڑی بنائی تھی سونا دی رہی سہی کسر اس پر گوشت بھی زیادہ دے دیا۔"

"مژگان۔۔۔ مژگان۔۔۔"

"اوف۔۔۔ دیکھا آ گئی نا ماما کی آواز۔۔۔ اب میں جاتی ہوں۔ تم دونوں کھیلو کودو ناچو گاؤ۔" کپڑے جھاڑتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی پھر ذرا سا جھک کر دونوں سے رازداری سے کہا۔ "اور ہاں میری ان ساری باتوں کا کسی سے تذکرہ مت کرنا۔"

رومیو جولیٹ نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مژگان کو جیسے یقین دہانی کرائی کہ اس کی بات کو راز میں رکھیں گے۔ مژگان دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

"جی ماما۔" وہ دو منٹ میں ہی ان کے سامنے تھی۔

"چھٹی کا دن ہو اور تمہیں اپنے رومیو جولیٹ سے فرصت مل جائے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" ماما کی مژگان کی جانب پشت تھی مگر لہجے کی ناراضی بتا رہی تھی کہ انہیں اس پر غصہ ہے۔ وہ ڈش میں کچھ نکال رہی تھیں۔ مژگان دیکھ نہ سکی۔ اس کا دل تو ابھی تک اپنے رومیو جولیٹ میں ہی اٹکا تھا۔

"ہائے مژی! السلام علیکم آنٹی!" فرخندہ جہاں جیسے ہی باغ و بہار زردہ ڈش میں لیے پلٹیں۔ عین اسی وقت لاؤنج کے مرکزی دروازے سے حور عین داخل ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح نک سک سے تیار' اسٹیپ میں کٹے ہوئے لہراتے بال اور اسٹائلش سا سوٹ۔۔۔ فرخندہ نے حور عین کے سلام کا جواب دیا اور پھر ناراضی سے مژگان کی طرف دیکھا۔ جس کا حلیہ ہمیشہ ہی انہیں دوسروں کے سامنے شرمندہ کر دیتا تھا۔ حور عین کے سامنے وہ اس وقت بالکل ہی ماسی لگ رہی تھی۔

شب خوابی کے لباس کے طور پر بھورے رنگ کی جھولا سی قمیص پہنے' کھلے پائنچوں کے ٹراؤزر اور نماز کی چادر کو سر سے نیچے تک لپیٹے نظر کے چشمے کو ناک پر درست کرتے ہوئے وہ حور عین سے باتوں میں مصروف ہو چکی تھی۔ اس کے انداز میں لاپروائی کا عنصر تھا اور فرخندہ کو بیٹی کی یہی لاپروائی بری لگتی تھی۔ آج اتوار تھا۔ اس لیے یہ حال تھا۔ مگر وہ تو روز صبح اٹھ کر جانے تک اسی حلیے میں گھومتی تھی۔ فجر کی نماز کے لیے جو چادر سر پر لپیٹتی تو اسے سر سے اتارنا ہی بھول جاتی۔ ایک تو موٹاپا اور اس پر یہ انداز۔ وہ انہیں اپنی عمر سے کئی گنا بڑی نظر آتی تھی۔

"مژگان۔۔۔" فرخندہ کے لہجے میں خود بخود سختی اتر آئی تھی۔

"جی۔۔۔ جی ماما۔" مژگان ایک دم چونکی۔ حور عین کی بھی چلتی زبان کو بریک لگ گیا تھا۔

"یہ سویٹ ڈش فہمیدہ کے گھر دے آؤ۔ اس نے اپنی لین کا آخری گھر لے لیا ہے۔"

"فہمیدہ آنٹی۔" مژگان نے ذہن پر زور ڈالا۔ "اچھا۔۔۔ آپ کی بچپن کی سہیلی جن کی آپ بہت باتیں کرتی ہیں اور جن کے پرانے خطوط آپ نے اب تک سنبھال کر رکھے ہیں؟" مژگان نے مزے سے کہا تو فرخندہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ہاں وہ ہی۔۔۔ کافی دنوں سے کوئی مناسب گھر تلاش کر رہی تھی۔ اتفاق سے محمود صاحب نے جس ڈیلر کو گھر بیچنے کی ذمہ داری سونپی تھی اس نے فہمیدہ کو یہ گھر دکھا دیا اور یوں بات بن گئی۔ اب جاؤ جلدی سے دے آؤ۔"

"لائیں۔" مژگان نے فوراً ہی آگے بڑھ کر پیالہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اس حلیے میں جاؤ گی؟" "تم! فرخندہ آنٹی کی بیٹی کم اور ماسی زیادہ لگ رہی ہو۔" حور عین نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا اور فرخندہ جو کچھ لمحوں پہلے فہمیدہ کے ذکر پر مژگان کا حلیہ بھول چکی تھیں۔ انہیں سب کچھ یاد آ گیا تھا اور ساتھ ہی وہ غصہ بھی جو وقتی لمحات میں دب گیا تھا عود کر آ گیا۔

"حور عین! تم تو بہت اچھی دوست ہو مژگان کی کچھ تم ہی سکھا دو۔ کیسے تیار ہونا ہے' کیسے اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میں تو سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہوں۔ انسان بھلے خوب صورت نہ ہو۔ خوب صورت نظر تو آ سکتا ہے۔" وہ حور عین سے کہتی مژگان کو کڑی نظروں سے گھورتی زردے کا پیالہ سلیب پر رکھ کر جا چکی تھیں۔ مژگان نے ماں کو ناراض ہو کر جاتے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر ٹکاتے ہوئے حور عین کو گھورا۔

"تم دو منٹ بعد نہیں آ سکتی تھیں۔ اب سارا دن ماما کا لیکچر چلتا رہے گا۔" وہ حور عین کو سنا کر کپڑے لے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حور عین کچھ لمحوں کے لیے وہیں کھڑی رہی اور پھر بالوں کو جھٹکتی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔

وہ مژگان کی دوست تھی۔ اچھی یا بری۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو جانچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو بلکہ کے گھر میں رہتی تھی اور حور عین آپ اپنی پسندیدہ تھی گھنٹوں بھی آئینے کے سامنے بیٹھ کر خود کو دیکھتی تو بور نہ ہوتی۔

مژگان اور اس کی ماما اس علاقے میں تین سال پہلے آئی تھیں اور تین سال سے ہی اس کی حور عین سے دوستی تھی۔ مژگان کے پہلے بھی دوست کم تھے مگر پچھلے تین سال میں اس نے خود کو گھر' ماما' حور عین' رومیو جولیٹ اور آفس تک ہی محدود کر لیا تھا اور ان سب کے بعد جو وقت بچتا' وہ اس کے پودوں اور کتابوں کے لیے وقف تھا۔ یونیورسٹی کے بعد جس آٹو موبائل کمپنی میں اس نے انٹرنی کی حیثیت سے جاب کی تھی۔ خوش قسمتی سے بعد میں اسے وہیں جاب مل گئی تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا موٹاپا بھی بڑھتا گیا۔ ایک ایک کر کے اس کی ساری یونیورسٹی فرینڈز کی شادی ہو چکی تھی مگر اس کی پریڈ اب تک جاری تھی۔ کچن سے ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم سے کچن تک کی مارچ پاسٹ' معصوم چہرے اور نرم طبیعت کی مالک مژگان جب لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتی' نظریں چہرے کا طواف کرتی' سراپے تک آتیں تو ستائش تاسف میں بدل جاتی۔ اور ایک بار آنے والا پھر کبھی نہ آتا۔ وہ دل برداشتہ نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب اسے ڈر لگنے لگا تھا کہ اس کی پریشانی ماں کو بیمار نہ کر دے اور وہ خود تھک کر اور چڑ کر کسی آسیب کا روپ نہ دھار لے۔

اس لیے ماں کے پُرزور اصرار اور ضد پر اس نے آفس کے بعد ایک جم جوائن کر لیا تھا۔ اس پر مستزاد' حور عین ہر روز اسے اپنے کسی نہ کسی آئے ہوئے پروپوزل کا قصہ سناتی۔ جن میں سے نوے فیصد اسے پہلی نظر میں پسند کر لیتے مگر حور عین کو پسند نہ آتے اور جن دس فیصد کو خود حور عین خاطر میں لاتی تھی۔ ان کی ڈیمانڈ اچھی شکل کے ساتھ کچھ مراعات کا بھی حصول تھا۔ یوں دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ مژگان اسے اپنی اچھی دوست کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"جی آپ کون؟" جبران شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا مرکزی دروازے تک پہنچ چکا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سوال اس کی طرف سے نہیں' دروازے کے باہر کھڑی مژگان کی طرف سے آیا تھا۔ اس لیے جبران کی حیرت بجا تھی۔

"ارے۔۔۔ یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے۔" وہ دونوں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ میں پھنسا کر کھڑا ہو گیا تھا اور مژگان کو گھور رہا تھا۔ جبکہ

حور عین اس کے پیچھے زردے کا پیالہ لیے کھڑی تھی۔
"کیوں؟" مژگان نے آنکھیں نکالی تھیں۔ ماما نے اسے بے وقت فہمیدہ آنٹی کے گھر بھیجا تھا۔ اس لیے اس بات کا غصہ اس نے کسی نہ کسی پر تو اتارنا ہی تھا۔
"آپ... آپ... یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھیں گے؟"
"محترمہ یہ میرا گھر ہے... تو ظاہر ہے یہ سوال پوچھنے کا حق بھی مجھے ہی ہے۔" جبران نے اوپر سے نیچے تک مژگان کو گھورا تھا۔ عجیب لڑکی تھی... بے تکے سوال کیے جا رہی تھی۔
"آپ کا گھر؟ یہ تو فہمیدہ آنٹی کا گھر ہے۔" مژگان کا چونکنا لازمی تھا۔ ماما نے ہمیشہ اپنی دوست فہمیدہ کا ذکر کیا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ کون کون رہتا تھا۔ نہ کبھی اس نے جانا تھا اور نہ ہی ماما نے بتایا تھا۔
"اوف..." جبران چڑ کر اندر جا چکا تھا۔ مژگان شانے اچکاتے ہوئے کھلے دروازے سے اندر آگئی تھی۔ حور عین اس کے پیچھے پیچھے تھی۔
"جائیں ماما۔ باہر کوئی الف نون کی جوڑی آئی ہے۔ بس الف کی لمبائی کچھ کم ہے اور نون کا پھیلاؤ زیادہ..." ہاتھ کے اشارے سے اس نے کم اور زیادہ کی تشریح کی تھی۔ "اور ہاں! ہاتھ میں ان کے پیالہ بھی ہے۔ یقیناً" کچھ مانگنے آئی ہیں۔ آپ کا پوچھ رہی ہیں۔ دھیان رکھیے گا۔ آج کل لوگوں نے واردات کا نیا طریقہ نکالا ہے۔" وہ اوپن کچن کے سلیب کے پاس کھڑا ڈرائنگ روم کی طرف دیکھتے ہوئے ماں سے قدرے اونچی آواز میں کہنے لگا۔
"کیا بکواس ہے جبران... جب دیکھو اوٹ پٹانگ بولتے رہتے ہو۔ ہٹو میں دیکھتی ہوں۔ فرخندہ کا فون آیا تھا۔ ضرور اس نے ہی اپنی بیٹی کو بھیجا ہو گا۔ تم نے اتنی اونچی آواز کہا ہے۔ بچی نے سن ہی نہ لیا ہو۔"
وہ اسے گھورتے ہوئے کہنے لگیں اور پھر اسے پرے ہٹاتی ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئیں۔ جبران سیٹی بجاتا' مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ الف نون کی جوڑی اگر اچھی سماعت رکھتی ہو گی تو یقیناً" ان القابات سے ضرور مستفید ہو گی۔ خاص طور پر محترمہ نون صاحبہ' کیونکہ اندر پہلے وہ ہی داخل ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم آنٹی!" فہمیدہ کو اندر آتے دیکھ کر دونوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔
"وعلیکم السلام۔" فہمیدہ نے محبت سے کہا اور دونوں کے قریب چلی آئیں۔ حور عین نے زردے کا پیالہ جھٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔
"ماشاء اللہ... تم تو بہت پیاری ہو گئی ہو۔" انہوں نے پیالہ ٹیبل پر رکھا اور حور عین کو بے ساختہ گلے لگایا۔ فہمیدہ نے خود سے ہی فرض کر لیا تھا کہ حور عین ہی مژگان تھی۔ لمحوں کی بات تھی مگر مژگان کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر دھندلا گیا تھا۔ پورے جسم کے اعضا میں شاید آنکھ سب سے حساس عضو ہے۔
ستائش ہمیشہ سے حور عین کا مقدر تھی اور خود کا نظر انداز کیا جانا۔ وہ اس بات کی بھی عادی تھی اور عادی ہوتے ہوئے بھی دل پر چوٹ لگنا کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔
"آنٹی... مژگان یہ ہے۔ حور عین نے ٹھہر ٹھہر کر جملہ ادا کیا تھا۔ میں تو حور عین ہوں مژگان کی فرینڈ۔" حور عین نے ہمیشہ کی طرح اس سارے منظر کا مزا لیا تھا۔ جب بھی وہ اور مژگان مقابل ہوتے اور سارا منظر حور عین کی گرفت میں ہوتا تو وہ یوں ہی انٹیلیکچوئل بن کر سہج سہج جواب دیتی۔
مژگان نے فہمیدہ آنٹی کے بغور دیکھنے پر جھجک کر پلکیں جھکالی تھیں۔ وہ جانتی تھی ان نگاہوں میں کیا ہو گا۔ اچنبھا' حیرانی' شاک... وہ اس کی ماما کی دوست تھیں اور اس نے ماما کی جوانی کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بالکل بھی ان جیسی نہ تھی۔ وہ تو اپنے بابا عثمان جعفری جیسے نین نقش کی حامل تھی۔ اس سے ملنے والے۔ پہلی بار تو ضرور ہی حیرت میں گرفتار ہوتے

کہ تم... فرخندہ کی بیٹی ہو؟ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ فہمیدہ آنٹی کی خجل آمیز آواز نے اسے سوچوں کے بھنور سے باہر نکالا۔ وہ شرمندہ لہجے میں اس سے معذرت کر رہی تھیں۔
"آئی ایم سوری مژگان بیٹا!" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے اسے بھی گلے سے لگایا۔ "فرخندہ کیسی ہے؟" فہمیدہ نے دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا کہتے ہوئے کہا۔ اب ان کا چہرہ مژگان کی طرف تھا۔
"جی... وہ ٹھیک ہیں۔" مژگان کے لہجے میں اب بھی جھجک تھی۔
"ان شاء اللہ میں جلد ہی چکر لگاؤں گی۔ تم دونوں بیٹھو' میں چائے لے کر آتی ہوں۔" وہ دونوں کو بٹھا کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں۔ حور عین دلچسپی سے اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ جبکہ مژگان نے آنکھوں کے کناروں پر ٹھہر جانے والی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے پیچھے دھکیلا تھا۔

☼ ☼ ☼
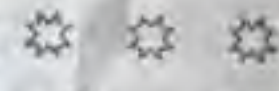
"اف... آج تو آٹھ ہی بج گئے۔" سلمنگ سینٹر اینڈ جم کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ کندھے پر بیگ لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں درزی سے لیے سلے ہوئے کپڑوں کا شاپر' جو وہ آفس سے واپسی پر لیتی ہوئی آئی تھی۔ اس لیے اسے جم میں آنے میں بھی دیر ہو گئی تھی اور اب گھر واپسی میں بھی تاخیر یقینی تھی۔
اس نے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے اور شولڈر بیگ اور کپڑوں کا شاپر سنبھالتے ہوئے فرخندہ کو ٹیکسٹ کرنے لگی۔ نظریں موبائل پر تھیں اور قدم سیڑھیوں پر۔ سیڑھیاں پرانے طرز کی اور تنگ سی تھیں۔
وہ اپنے برابر سے نیچے اترتے ہوئے شخص سے ٹکرائی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ جسے اسی شخص نے کمال مہارت سے کیچ کر لیا تھا۔ مگر کپڑوں کا شاپر پھر بھی نیچے گر چکا تھا۔
"تم..." اس نے ایک قدم نیچے کھڑے جبران کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کا غصہ عود کر آیا تھا۔
"دیکھ کر نہیں اتر سکتے تھے؟"
"تم نہیں مادام... آپ... ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔" اس کے اس جملے نے مژگان کی آنکھوں کو غصے میں اور پھیلا دیا تھا مگر جبران بول کر چپ نہ ہوا تھا۔ بلکہ مزید کہنے لگا۔
"بہت کوشش کی کہ کسی طرح آپ سے بچ کر نکل جاؤں۔ مگر ممکن نہ ہوا۔" اس نے جھک کر شاپر اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔
"حاضر ہوں جان و دل سے... کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا۔ اور آپ کے سامنے تو بالکل ہی ذرا سا۔" اس نے ہاتھ سے خود کو بونا ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"یہ آپ میری مدد کر رہے ہیں یا میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" اس نے جل کر شاپر اس کے ہاتھ سے چھینا۔
"لوگ میری سنجیدگی کا اکثر غلط ہی مطلب لیتے ہیں۔" وہ واقعی سنجیدہ تھا یا مذاق سنجیدگی سے کر رہا تھا۔ مژگان سمجھنے سے قاصر تھی۔
"بہتر ہو گا کہ آپ میرا راستہ چھوڑ دیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" مژگان نے درشتی سے کہا تھا۔
"حالانکہ میرا راستہ آپ کی وجہ سے رک گیا تھا۔ مگر خیر آئیں۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"
"جی نہیں... میں خود چلی جاؤں گی۔ اکیلی لڑکی دیکھ کر فری نہ ہوں۔" مژگان نے ایک قدم پیچھے رکھا۔
"محترمہ... باہر بارش ہو رہی ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو آفر کی ہے۔ ورنہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ اکیلی بھی سو پر بھاری ہیں۔" مژگان نے اسے گھور کر دیکھا اور کچھ کہنا چاہا کہ جبران نے اس کا جھٹکے سے ہاتھ پکڑ لیا۔
"بس اب کچھ نہ کہیے گا۔ میرے ساتھ چلیں۔ جو کہنا ہے گاڑی میں کہہ لیں۔ بارش تیز ہو رہی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے سن ہو گئی تھی۔ پہلی بار تھا کہ کسی اجنبی نے یوں اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ تب ہی اس کے ہاتھ میں دبا موبائل بجا۔ مژگان کے سن وجود میں حرکت

ہوئی۔ اس نے ذرا کی ذرا جبران کی طرف دیکھا اور پھر جبران کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کو۔ جبران نے اس کا ہاتھ فوراً"چھوڑ دیا۔

اس نے بنا کچھ کہے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ بارش واقعی بہت تیز تھی۔ تیزی سے گرتی بوندیں بھی ہاتھ پر ثبت جبران کے لمس کو دھو نہ پا رہی تھیں۔ پارکنگ کے شیڈ پر بوندیں زور و شور سے گر رہی تھیں مگر چند ساعتوں پہلے سنا استحقاق بھرا لہجہ سب پر حاوی تھا۔

☼ ☼ ☼

"میوزک کا شوق ہے آپ کو؟" وہ کار کے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ جب جبران کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"نہیں۔" اس نے یک لفظی جواب دیا۔

"آئی لو میوزک۔ مجھے تو ہر چیز میں ردھم نظر آتا ہے۔ بارش کا جلترنگ' ہواؤں کی سرسراہٹ' کوئل کی کوک' چڑیوں کی چہکار' بادلوں کی گرج اور جھرنے کی آواز' یہ سب کتنے خوب صورت ساز ہیں۔ کبھی غور کیا ہے آپ نے۔" جبران نے اسے دیکھتے ہوئے موڑ کاٹا۔

"نہیں۔" انداز اب بھی ہنوز تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ باہر کا منظر نہیں دیکھ رہی' بلکہ بس کار کے شیشے کو تکے جا رہی ہے۔

"اوں۔ تو آپ نے خود پر خشک مزاجی کا بھی وزن لاد رکھا ہے۔ جب ہی اتنی آدم بے زار نظر آتی ہیں۔" جبران نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

"آپ کو مجھ پر رائے زنی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"مگر ایک اچھے دوست کی خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے دوست کو اس کی خوبیاں اور خامیوں سے آگاہ کرے۔" بارش اور اندھیرے کی وجہ سے اسپیڈ بریکر نظر نہ آیا تھا۔ مژگان کے بت اور جبران کی گاڑی کو ایک ساتھ جھٹکا لگا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ گاڑی کو اسپیڈ بریکر سے جھٹکا لگا تھا اور مژگان کو جبران کے جملے سے۔

"ہم دوست نہیں ہیں۔" وہ پوری توجہ سے اس کی سمت گھوم گئی تھی۔ وہ مسکرایا۔ جیسے کسی بچے کی بات پر مسکراتے ہیں۔

"مگر بن تو سکتے ہیں۔ آئی ایم شیور میری خوش مزاجی آپ کی خشک مزاجی کو مائنس کر دے گی۔" کھلتے بند ہوتے ہونٹ' ان کے پیچھے چھب دکھلاتی مسکراہٹ اور موتی جیسے دانتوں کی قطار۔ کیا کسی مرد کی مسکراہٹ اتنی پرکشش بھی ہو سکتی ہے۔ وہ نظر پھیر چکی تھی مگر سوچ کا رخ نہ پھیر سکی تھی — وہ ڈیش بورڈ میں سے کچھ نکال رہا تھا۔

"تاؤ۔ فرینڈز۔" وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے منتظر تھا مگر ملانے کے لیے نہیں۔ اس کے ہاتھ میں وہ ہی پیکٹ تھا' جو اس نے ڈیش بورڈ میں سے نکالا تھا۔ مژگان نے اس کے ہاتھ کو دیکھا۔

"دیکھ کیا رہی ہیں' لے لیجیے' اس میں ببلز ہیں۔ یہ ببل بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ آپ کو یہ احساس بھی دلائے رکھتی ہے کہ آپ کا منہ بھرا ہوا ہے اور اپنی موجودگی میں یہ کچھ اور کھانے بھی نہیں دیتی۔ میں جو آپ کو اتنا سلم اور اسمارٹ نظر آ رہا ہوں تو یہ اسی کی مہربانی ہے۔ ورنہ کبھی میں بھی آپ کی طرح ہی ہوتا تھا۔"

اس نے قدرے جھکتے ہوئے مژگان سے کہا اور پھر سیدھا ہو کر گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

"تھینک یو۔" مژگان نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لے لیا۔ گھر آ چکا تھا۔ جبران نے گاڑی روک دی۔ بارش کی رفتار قدرے مدھم ہو چکی تھی۔ مژگان نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی ماما کو میسج کیا کہ وہ دروازہ کھول دیں تاکہ بیل بجانے کے دوران وہ بھیگ نہ جائے اور پھر اپنا بیگ اور کپڑوں کا شاپر اٹھا کر شکریہ کہتی گاڑی سے باہر نکل آئی اور تیزی سے گھر کا گیٹ پار کر گئی۔ جبران نے اسے اندر جاتے دیکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

☼ ☼ ☼

بند کھڑکی کے اس پار
آسمان کی ہتھیلی پر جگمگاتا چاند
اور جلتے بجھتے ٹمٹماتے ستارے
جیسے اس کے جلتے دیے
منتظر ہیں اس لمحے کے
جب یہ بند کھڑکی کھل جائے

وہ بہت تھک چکی تھی مگر نیند پھر بھی کوسوں دور تھی۔ اس نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ معمول سے دو گھنٹے اوپر ہو چکے تھے۔ جبران خاور' اس کا لمس' اس کا لہجہ اور دوست بن جانا' یہ سب کوئی انہونی بات نہ تھی۔ مگر مژگان جیسے لوگوں کے لیے تھی۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر رات آٹھ بجے کے بعد گزرا ایک ایک لمحہ اسے اپنی جزئیات سمیت یاد آ رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی جیسے کچھ یاد آیا ہو اور الماری کے دائیں طرف بنے ریک میں رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر لے آئی اور اندر کوئی چیز تلاشنے لگی۔ ہاتھ سے مطلوبہ چیز ٹکرائی اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر کوند گئی۔ اس نے اپنی بند مٹھی پرس میں سے نکالی۔ وہ ہی چیونگم کا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ ببل بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ آپ کو یہ احساس بھی دلائے رکھتی ہے کہ آپ کا منہ بھرا ہوا ہے اور اپنی موجودگی میں یہ کچھ اور کھانے بھی نہیں دیتی۔" جبران کی آواز جیسے اس کے آس پاس سرسرانے لگی۔ اس نے پیکٹ کا اوپر کا حصہ کھولا اور اندر ہاتھ ڈالا۔

"اس۔" وہ حیرانی سے پیکٹ کو بیڈ پر الٹا کر کے جھٹکنے لگی۔ پیکٹ چیونگم کے خالی ریپر اور چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ جبکہ اوپر سے اسے نہایت نفاست سے بند کیا ہوا تھا۔

"تو یہ سب مذاق تھا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ مژگان نے خالی پیکٹ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

"چھچھورا انسان۔" اسے بہت غصہ آ رہا تھا مگر غصے

سے بھی زیادہ اسے رونا آرہا تھا۔ وہ بنا آواز کے گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ رات آٹھ بجے کے بعد کے سارے لمحے ایک ایک کر کے بھک سے اڑ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

چائے دم ہو چکی تھی۔ مژگان نے کیتلی اور چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے۔ ساتھ ہی فرنچ فرائز کی پلیٹ کیچپ اور مایونیز بھی رکھا اور ٹرے اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف آگئی۔ پھر فریج میں سے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ ریڈ ویلوٹ کیک نکالا اور اسے بھی لا کر ٹیبل پر رکھا۔ کمرے سے بوکے اور شاپنگ بیگز لے کر ٹیبل کے پاس لے آئی۔ پھر کینڈل اسٹینڈ میں کینڈل سیٹ کرنے لگی۔

"پرفیکٹ۔" پوری ٹیبل سیٹ ہونے کے بعد اس نے ٹیبل پر توصیفی نظر ڈالی۔ ساری ارینج منٹ مکمل تھی۔ اب صرف ماما کو بلانا تھا۔ آج ماما کی برتھ ڈے تھی۔ ماما کا فیورٹ کیک وہ رات کو ہی بنا چکی تھی۔ آفس سے جم جانے کے بجائے وہ شاپنگ کرنے چلی گئی۔ موسم کے حساب سے ان کے لیے دو ریڈی میڈ سوٹ لیے اور پھولوں کی شاپ سے ٹیوب روز اور گلابوں کا اچھا سا بوکے بنوایا۔ اب بس کیک کٹنا باقی تھا اور اس کے لیے فرخندہ کا ٹیبل پر موجود ہونا ضروری تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ماما کو بلانے چل دی مگر اندر سے آتی آواز نے اسے دروازے کی چوکھٹ کے باہر ہی منجمد کر دیا۔

"بس کیا بتاؤں فہمیدہ! میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے اس نے اتنا وزن چڑھا لیا۔" اسپیکر آن تھا۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز بھی وہ سن سکتی تھی۔

"یقین جانو۔۔۔ میں تو اس کی فرینڈ کو ہی تمہاری بیٹی سمجھی تھی۔ تم بھی تو جوانی میں کتنی پیاری ہوا کرتی تھیں مگر بعد میں مجھے اپنی بے اختیاری پر افسوس ہی ہوتا رہا کہ مجھے یوں اس کی دوست کو لپٹانا نہیں چاہیے تھا۔" فہمیدہ کی آواز میں تمسخر نہیں، حیرت اور افسوس تھا۔

"ہاں۔۔۔ مگر اب تو بس مژگان کی فکر ہے کہ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔" فرخندہ کا انداز بوجھل تھا۔

"کیا مژگان زیادہ کھاتی پیتی ہے۔" اسپیکر سے فہمیدہ کی آواز ابھری۔

"ہاں۔۔۔ پہلے تو کھاتی تھی۔ جیسے اس عمر کی بچیوں کے شوق ہوتے ہیں۔ مگر بعد میں جس تیزی سے وزن بڑھنے لگا تو میں نے خود ہی ہر چیز کا حساب مقرر کر دیا اور اب تو جب سے جم جوائن کیا ہے' ڈائٹ چارٹ کے مطابق ہی کھاتی ہے۔"

"ہم۔۔۔ مم۔۔۔ مم۔۔۔" فہمیدہ نے ہنکارا بھرا۔ پھر سوچتے ہوئے کہنے لگیں۔ "ویسے ایک بہت اچھی ڈاکٹر اور ہربلسٹ کو جانتی ہوں میں۔ میری کزن اپنی بیٹی کی اسکن پرابلم کی وجہ سے اس کے پاس گئی تھی۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھی۔ میری مانو تو ایک بار تم بھی مژگان کو وہاں لے جاؤ' اللہ کرے گا تو یقیناً" افاقہ ہوگا۔"

وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔ مژگان میں اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ ساری برتھ ڈے ارینج منٹ نظر انداز کرتی ٹیرس پر چلی آئی۔ جلتی بجھتی شمعیں اب پس منظر میں چلی گئیں۔

"کیا دنیا صرف پرفیکٹ اور خوب صورت لوگوں کی ہے' رومیو! بیٹا مذاق اڑاتا ہے اور ماں مشورے دیتی ہے۔" وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

رومیو اسے دیکھتے ہی آواز نکالنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ پانی کی کٹوری میں پاس رکھے جگ سے پانی ڈالنے لگی۔ رومیو مٹی کی منگی سے اتر کر پانی کی کٹوری کے کنارے پر آکر بیٹھ گیا تھا اور پنجرے کی جالی پر ٹکی مژگان کی انگلی سے اپنی چونچ مس کرنے لگا۔ وہ رومیو کے محبت کے اس اظہار کو سمجھتی تھی۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔

جانور' انسانوں سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ان کے غصے اور محبت کے اظہار کو سمجھنے لگتے ہیں مگر انسان کبھی اپنے ہی جیسے انسان کے رویے سے مانوس نہیں ہوتا۔ وہ لاکھ کوشش کرتی کہ اپنے اوپر پرت در پرت خول چڑھا لے مگر ہر بار لوگوں کے رویے سے اسی طرح دل برداشتہ ہو جاتی اور پھر یوں ہی کوئی کونا تلاش کرنے لگتی تھی۔

کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اس کا ایم بی اے کرنا' کم عمری میں ایک اچھی پوسٹ پر ہونا' تخلیقی ذہن کی مالک ہونا۔۔۔ سب کچھ بس ایک ترحم بھری نگاہ کے بدلے تھا۔ جو اس پر ایک نگاہ ڈالتا۔ اس کی ذات پر چسپاں سارے لیبل اور ٹیگز ایک ایک کر کے غائب ہو جاتے اور ہر طرف سے جیسے "موٹی موٹی" کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔

☼ ☼ ☼
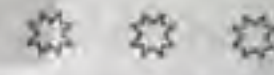
"آپ۔۔۔ تم۔۔۔ زہے نصیب۔" حور عین نے چوتھی دستک پر کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے مژگان کو کھڑا پایا۔

"تمہاری سب سے اچھی کوالٹی یہی ہے کہ جب بھی آتی ہو' کچھ لے کر ہی آتی ہو۔" حور عین نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور میکرونی کا پیالہ جھپٹ لیا۔

"اور تمہاری سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ میں جب بھی آتی ہوں تم اپنا کمرا بند کیے ہی ملتی ہو۔ چار بار میں نے گھنٹی بجائی ہے۔ تب کہیں جا کر صالحہ بھابھی آئیں۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ ان کا موڈ سخت آف ہے' شاید آٹا گوندھتے گوندھتے آئی تھیں۔" مژگان نے اندر آتے ہوئے کہا۔ نظریں حور عین سے ہوتی ہوئی کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔

ہمیشہ کی طرح کمپیوٹر آن تھا۔ میوزک بھی قدرے تیز آواز میں چل رہا تھا اور بیڈ پر دو سوٹ سلیقے سے استری کیے ہوئے رکھے تھے اور کمرے میں یہ واحد چیز تھی' جو سلیقے کا نمونہ تھی۔ ورنہ کشن' سی ڈیز' ہیڈ فون اور کیو ٹکس کی لمبی رینج۔۔۔ سب چیزیں غیر متوقع جگہ اور بے ترتیب تھیں۔

"اب پلیز ہر بار کی طرح شروع مت ہو جانا کہ بھابھی کا ہاتھ بٹایا کرو' ماسی کی نگرانی کیا کرو۔ صبح کے ناشتے کی ذمہ داری تو کم از کم تم لے لو اور کچھ نہیں تو ایک وقت کے برتن دھو لیا کرو۔"

"تو اس میں غلط کیا ہے؟" مژگان نے کشن جگہ پر رکھتے ہوئے حور عین کی طرف دیکھا۔

"شادی سے پہلے ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں اور بھابھی بھی کوئی غیروں میں سے نہیں آئیں۔ وہ بھی رشتہ داروں میں سے ہی آئی ہیں۔ کیا مجھے نہیں پتا کہ شادی سے پہلے وہ بھی دن چڑھے تک سوتی تھیں۔ جو دل میں آتا تھا وہ کرتی تھیں اور شاید ہی کسی کام کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ یہ تو جو کچھ بھی سیکھا ہے انہوں نے یہیں آکر سیکھا ہے۔"

مژگان اس کی باتیں سنتی بھی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ چیزیں بھی سمیٹتی جا رہی تھی۔

حور عین نے پیالہ کمپیوٹر ٹیبل پر رکھا اور کمپیوٹر آف کیا اور کرسی پر آف موڈ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے حور عین! تم کچھ بھی نہیں کرتیں۔ اس لیے صالحہ بھابھی کی ذمہ داریوں کو بانٹنے کے لیے آنٹی کو کام کرنا پڑتا ہے۔" مژگان نے اس کا ہیڈ فون کارپٹ سے اٹھا کر کمپیوٹر ٹیبل پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تو نہ کریں۔ میں نے امی کو نہیں کہا۔ ویسے بھی بھابھی کوئی اسپیشل کام سر انجام نہیں دیتیں۔ جھاڑو پونچھا اور صبح کا ناشتا اور برتن۔ یہ تینوں کام ماسی کر کے چلی جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا امی بناتی ہیں۔ بھابھی کو صرف رات کا کھانا پکانا ہوتا ہے یا پھر رات کے کھانے کے برتن دھونے ہوتے ہیں اور جس طرح کا کھانا وہ بناتی ہیں' یہ ہمارا ہی دل گردہ ہے کہ صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔" حور عین نے تڑخ کر کہا۔

"اتنی اچھی میکرونی لا کر اتنی باتیں سنا دیں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ نہ لاتیں۔" حور عین خفا ہو چکی تھی۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میرا مطلب کیا ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں میرا یہ سب کہنا برا لگا ہے تو آئی ایم سوری۔"

مژگان نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ حورعین نے جھٹ منہ پھیر لیا۔ گویا پکی پکی ناراضی کا اظہار تھا۔
"کھانا... آئی ایم سو سوری۔" مژگان سامنے آگئی اور جھٹ سے کان پکڑ کر دوبارہ سوری کہا اور حورعین نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھی۔ کیونکہ مژگان نے اپنے نہیں بلکہ سوری کرتے ہوئے حورعین کے کان پکڑ لیے تھے۔
"جاؤ... اب جلدی سے چمچہ لے کر آؤ۔ ورنہ میکرونی ٹھنڈی ہو جائے گی۔" مژگان کے کہنے پر وہ سر ہلاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ مژگان نے ایک گہری سانس لی اور حورعین کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر ٹیبل پر رکھے موبائل کے نیچے دبے کاغذ پر پڑی۔
"اسد... سفیان... عدنان... صبیح... شیراز..." اس کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ کاغذ پر لڑکوں کے نام کی لسٹ تھی۔ آگے ان کی عمر اور موبائل نمبر درج تھے۔
"یہ لو۔" حورعین نے اپنا چمچہ باؤل میں ڈالا اور مژگان کی طرف دوسرا چمچہ بڑھایا۔ مژگان نے کاغذ سے نظر ہٹا کر حورعین کو دیکھا۔ وہ حیرت کے سمندر میں اتنی غرق تھی کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر بھی متوجہ نہ ہو سکی۔
"یہ سب کیا ہے حورعین؟" چمچ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے وہ کاغذ حورعین کے سامنے کیا۔
"یہ..." حورعین نے یہ کو لمبا کھینچا اور میکرونی سے بھرا چمچہ منہ میں رکھ لیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایک کے بعد دوسرا، تیسرا، چوتھا حورعین جلدی جلدی کھانے لگی۔
"یہ فیوچر کے لیے ساتھی کی تلاش ہے۔" حورعین نے میکرونی کو حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "سوشل سائٹ پر جو دوست بنے ہیں۔ ان میں سے یہی کچھ ٹھیک لگے ہیں۔ سوچا ذرا چیک تو کروں۔ کیا ہوا؟ کھاؤ نا تم۔ ڈونٹ وری میں آنٹی کو نہیں بتاؤں گی کہ تم نے اپنے ڈائٹ پلان میں چیٹنگ کی ہے۔" وہ بولتے ہوئے پھر چمچہ بھرنے لگی۔ مژگان اسے بے فکری سے کھاتے دیکھتی رہی۔
"تمہیں چیز میکرونی پسند ہے۔ اس لیے میں صرف تمہارے لیے ہی بنا کر لائی تھی۔ میرا نہ تو کھانے کا کوئی ارادہ ہے اور نہ ہی میں اپنے ڈائٹ پلان میں کوئی چیٹنگ کرنے والی ہوں۔ ہاں... مگر تم اپنی زندگی کے ساتھ ضرور چیٹنگ کر رہی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے، اس طرح تم اپنے لیے کوئی موزوں جیون ساتھی تلاش کر لوگی۔ تم اپنا وقت ان فضول کاموں میں برباد کر رہی ہو حورعین!"
مژگان افسردہ تھی۔ اسے یہ سب سن کر بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔
"تو کیا کروں؟ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دوں؟ جو ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کر لوں؟" حورعین نے جھنجلا کر جواب دیا۔
"میں نے ایسا کب کہا ہے؟ مگر کمرا بند کر کے یہ سب کرنا، سارے گھر والوں سے کٹ کر رہنا، گھر کے کسی کام میں خود کو ذمہ دار نہ سمجھنا۔ یہ سب بھی تو مناسب نہیں۔" مژگان نے اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا۔ جو بھی تھا حورعین اس کی دوست تھی اور اسے حورعین سے محبت تھی۔
حورعین نے ایک نظر مژگان کو دیکھا۔ پیالہ گود میں سے اٹھا کر ٹیبل پر پٹخا۔ کرسی کی پشت سے کمر ہٹا کر آگے ہوتے ہوئے ٹیبل پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکائیں۔
"تم نے تو اپنی زندگی کو بہت اچھے طریقے سے ایمان داری کے ساتھ پلان کیا ہے نا۔ گھر کے کام، جاب، جم... مگر کیا اس سب سے تمہاری زندگی میں کوئی تبدیلی آئی؟"
حورعین کا لہجہ تلخ اور نگاہوں میں کڑا طنز تھا۔ میکرونی کا آدھا بھرا اور آدھا خالی پیالہ دونوں کے درمیان اب ٹیبل پر رکھا تھا۔ مژگان، حورعین کی نگاہوں سے چھلکتے طنز کو زیادہ دیر سہہ نہ پائی اور اس نے سامنے رکھے پیالے پر نگاہیں جما دیں۔ وہ بہت محبت سے حورعین کے لیے یہ بنا کر لائی تھی۔ کیونکہ حورعین کو چیز میکرونی پسند تھی۔ کاغذ پر لکھے ہوئے ناموں کو دیکھ کر جو کچھ مژگان نے کہا تھا۔ وہ رویہ ایک محبت کرنے والی دوست کا تھا۔ مگر جو کچھ اب حورعین کی نگاہوں اور زبان سے چھلک رہا تھا۔ وہ انداز سراسر اجنبیت لیے ہوئے تھا۔
"تمہاری امی، تمہیں میری مثالیں دیتی ہیں۔ مجھ سے کہتی ہیں کہ میں تمہیں اپنے جیسا بنا دوں۔" حورعین نے خود پر انگلی رکھتے ہوئے طنز سے کہا۔
"میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں مژگان کہ آفس کی فائلوں میں سر کھپاؤں۔ بسوں میں دھکے کھاؤں، دھوپ میں سڑکیں ناپوں، چولہے کے پاس کھڑی ہو کر اپنا رنگ و روپ جلاؤں اور ماسیوں والے کام کر کے خود کو ہلکان کرتی رہوں۔"
مژگان کی نگاہیں اب بھی میکرونی کے پیالے پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر اب اسے پیالہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں ٹھہر جانے والی نمی نے پیالے اور بینائی کے بیچ دیوار بنا دی تھی۔ کاش حورعین کی آواز اور اس کے کانوں کے بیچ بھی ایسی کوئی دیوار حائل ہو جاتی۔
"آج کے دور میں شرافت و سادگی کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ یہاں جو شخص اپنے آپ کو جتنی اچھی طرح سے پریزنٹ کرتا ہے، اتنا ہی کامیاب ہے۔ جانتی ہوں۔ میں بے حد حسین ہوں اور میں جس ٹھاٹ باٹ سے ابھی رہتی ہوں شادی کے بعد بھی اسی طرح رہنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے اگر یہ سب کرنا پڑا تو کر گزروں گی۔" سامنے رکھے کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حورعین نے تلخی سے کہا۔ اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔
اسی وقت دروازہ کھلا اور حورعین کی امی چائے کی ٹرے لے کر آئیں۔ حورعین نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ مژگان کے لیے یہی لمحہ غنیمت تھا۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو پیچھے دھکیلا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ارے یہ کیا بیٹا! کھڑی کیوں ہو گئیں۔ میں تمہارے لیے چائے لائی ہوں۔" رابعہ نے محبت سے مژگان کے پاس آتے ہوئے کہا۔
"نہیں... آنٹی! بس اب میں چلوں گی۔ ماما کا میسج آیا ہے۔ انہیں کہیں باہر جانا ہے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ حورعین نے مژگان کو دیکھا اور اس پورے عرصے میں اس لمحے حورعین کو احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔ جبکہ مژگان کی پوری توجہ رابعہ آنٹی کی طرف تھی، جو اس سے چائے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔
"میں ضرور چائے پیتی آنٹی! اگر روزہ نہ ہوتا۔ آئی ایم سوری، میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔"
"ارے نہیں بیٹا! دو کپ چائے میں کیا تکلیف۔ ماشاءاللہ تم تو بہت ہی پیاری بچی ہو۔" رابعہ نے محبت سے کہا۔
"اچھا آنٹی ان شاءاللہ پھر آؤں گی تو ضرور چائے پیوں گی۔" وہ الوداعی جملے کہتی تیزی سے باہر نکل آئی۔ رابعہ اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل گئیں۔ حورعین کو تھوڑی کی پشیمانی ہوئی۔ وہ روزہ رکھ کر حورعین کے لیے اس کی فیورٹ ڈش بنا کر لائی تھی۔
"کوئی بات نہیں۔ میں اس سے سوری کر لوں گی۔ ویسے بھی میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔" اگلے ہی لمحے حورعین کی ازلی لاپروائی واپس لوٹ آئی اور وہ ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر پھر سے کمپیوٹر آن کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

کتنے ہی لمحے گزر گئے تھے۔ بینچ سے نیچے پیر لٹکائے لٹکائے شل ہو گئے تھے مگر اس نے اپنی پوزیشن تبدیل نہ کی تھی۔
یہ ایک قریبی پارک تھا اور مرکزی دروازے سے اندر سیدھے ہاتھ کی طرف جانے والے رخ میں قطار در قطار لگی بینچوں میں سے وہ تیسری بینچ پر بیٹھی تھی۔ کل رات سے وہ سو نہ سکی تھی۔ لاکھ چاہنے کے باوجود صبح آفس نہ جا سکی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ رومیو جولیٹ کی میٹھی بولیاں بھی اس کا ملال کم نہ کر سکی

تھیں۔

وہ صبح آفس جانے کے لیے نکلی تھی مگر یہاں چلی آئی تھی۔ تب سے اب تک یہیں تھی اور اب بھی جم جانے کے بجائے وہ یہیں بیٹھی تھی۔ بس وہ منظر سے غائب ہو جانا چاہتی تھی تاکہ کوئی اپنا اسے دیکھ نہ سکے۔

کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ جاننا کہ آپ کے اپنے قریبی' عزیز از جان رشتے آپ کے لیے کیسا سوچتے اور سمجھتے ہیں۔

کل حور عین کے گھر سے واپسی پر اس کی حالت چھٹے ہوئے خول کی سی تھی۔ دوست دل دار ہوتے ہیں' غم گسار ہوتے ہیں۔ پیارے ہوتے ہیں مگر کیا دوست ہاتھ میں تو کیلا بھالا بھی لیے ہوتے ہیں؟ یہ اسے کل ہی پتا چلا تھا۔ رات سونے سے پہلے حور عین ایک لفظی "سوری" کا میسج اس کے موبائل پر بھیج کر سو بھی چکی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ساری تلخی اور معافی کے ایک میسج کے بیچ مژگان پر کیا گزری۔

جس چیختی ہوئی حالت میں وہ حور عین کے گھر سے واپس ہوئی تھی۔ اسی حالت میں وہ ماں کے سامنے چلی آئی تھی۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ ان کے سامنے اونچی آواز سے بولی تھی۔

"آخر آپ ہر آئے گئے کے سامنے' میری قسمت' میرے موٹاپے کا رونا کیوں روتی ہیں۔ کبھی حور عین' کبھی فہمیدہ آنٹی' کبھی کوئی میچ میکر۔ آخر کیوں ماما؟"

"نہ حور عین کوئی غیر ہے اور نہ فہمیدہ۔ انسان اپنوں سے ہی دکھ سکھ کہتا ہے۔ میرا میکہ' میرے بھائی سے تھا۔ جو عرصہ ہوا امریکہ سدھار گیا۔ انہوں نے بڑے بیٹے کی شادی وہیں کی ہے تو یقیناً" باقی بچوں کی بھی وہیں کریں گے۔ سال کے سال ایک یا دو فون' بس یہی تعلق رہ گیا ہے میرا ان سے۔ رہ گئیں تمہاری پھپھو' اور تمہارے تایا۔ انہیں تمہارے اندر کوئی جوہر نظر نہیں آتے۔ تمہارا بڑھتا وزن ہر چیز پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ اس وزن کو نظر انداز کر دیں۔ تب بھی ان دونوں کی اپنی ہی چار چار بیٹیاں شادی کے لیے بیٹھی ہیں۔ وہ پہلے ان کا سوچیں گے تب کہیں جا کر بیٹوں کا نمبر آئے گا۔ اور جہاں تک بات رشتے لانے والی کی ہے۔ تو وہ کوئی یونہی اچھے سے اچھا رشتہ نہیں لاتی۔ ہر بار منہ مانگے پیسے لیتی ہے۔

میں تمہاری ماں ہوں مژگان! کوئی دشمن نہیں ہوں۔ یہ جو میں ہر وقت تمہیں چھوٹے چھوٹے کاموں میں الجھائے رکھتی ہوں صرف اس لیے کہ تم مصروف رہو اور تمہارا مزید وزن نہ بڑھے۔ حور عین سے اس لیے تمہاری بات کرتی ہوں تاکہ تم اس کی طرح بننا سنورنا سیکھ لو۔ یہاں لوگ اداؤں سے گھائل ہوتے ہیں۔ وفاؤں سے نہیں۔" بولتے بولتے فرخندہ کے انداز میں تلخی سمٹ آگئی تھی۔

"راتوں کو نیند نہیں آتی یہی سب سوچتے ہوئے۔ ساری ساری رات اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ ایک ہی بیٹی ہے مگر اس کے بھی نصیب نہیں کھلتے۔" تلخی کی جگہ اب افسوس نے لے لی تھی۔

"فہمیدہ کو ہی دیکھ لو۔ اسے بھی پہلی نظر میں حور عین ہی اچھی لگی۔ مجھ سے ملنے آئی تو جتنی دیر بھی بیٹھی۔ مختلف ٹوٹکے تمہارے لیے بتاتی رہی۔ میری کتنی خواہش تھی کہ شاید اس کے بیٹے جبران سے ہی۔۔۔" افسوس اور ہمدردی سے کہتی وہ جملہ ہی ادھورا چھوڑ گئیں۔

یہ دوسرا شدید جھٹکا تھا جو آج اسے لگا تھا۔ یعنی اس کا شمار بھی ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جو ماؤں کی آنکھوں سے نیند چرا لیتی ہیں۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتی تھی کہ وہ ماما کی بہت فرماں بردار اور اچھی بیٹی ہے۔ اور باہر کے کاموں کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں میں بھی ماہر ہے۔

اس نے رابعہ آنٹی کو اکثر حور عین کے لیے پریشان دیکھا تھا۔ وہ اس کی غیر ذمہ داری' بد سلیقگی' لاپروائی اور بد تمیزی سے چڑتی تھیں کہ روپ کی روئے اور بھاگ کی کھائے جبکہ وہ خود نہ لاپروا تھی اور نہ بد سلیقہ۔ بلکہ وہ اپنی ماں کی بہت کم ہی کوئی بات ٹالتی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اگر خدانخواستہ اس کی کسی جگہ

شادی نہ ہو سکی تو وہ اور ماما ایک ساتھ بہت اچھی سہیلیاں بن کر رہیں گی۔ ابھی جو پیسے وہ جم کے اخراجات کی مد میں خرچ کر دیتی ہے۔ بعد میں ان ہی پیسوں سے وہ ماں کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کیا کرے گی۔ کپڑے، جوتے، بیگز، پرفیومز، جیولری وغیرہ وغیرہ۔ آفس سے آتے ہوئے وہ ان کے لیے گرم گرم سموسے اور کچوریاں لے کر آئے گی کبھی آئس کریم اور کبھی چاکلیٹ۔ چھٹی کا دن وہ ہمیشہ باہر گزارا کریں گے۔ کبھی کبھی سینما جا کر کوئی اچھی سی موی بھی دیکھا کریں گے۔

جب سردیاں آیا کریں گی تو سر شام ہی ایک ہی کمبل میں گھس کر ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے خوب ساری باتیں کریں گے۔ پر ابھی جاتے ہوئے ماما نے جبران کے نام پر جو جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔ وہ اسے ایک گہرے خلا میں اتار گیا تھا۔

وہ اپنی ماں کی آنکھ میں اپنے لیے ہر جذبہ دیکھ سکتی تھی۔ ڈانٹ پھٹکار، پیار، غصہ ماسوائے رحم اور ہمدردی کے۔

"ٹپ ٹپ۔" زیاں کا احساس اس کی آنکھوں سے گرنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کہاں بیٹھی ہے۔

"رونا اچھی بات ہے۔ اس سے غم کی دھند چھٹ جاتی ہے اور راستہ صاف اور روشن نظر آنے لگتا ہے۔ مگر لوگوں کے مجمع میں بیٹھ کر رونا انسان کی شکست کی دلیل ہے۔ یہ احساس کہ ہم ہار چکے ہیں۔ ہمیں امید کی روشنی سے دور کر دیتا ہے اور امید سے دوری اکثر خدا سے دوری کا سبب بن جاتی ہے۔"

بہت نزدیک سے ایک مردانہ آواز ابھری تھی۔ دوسراہٹ کا احساس اسے سر اٹھانے پر مجبور کر گیا تھا۔ جبران اسی بینچ پر مژگان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"تم۔" مژگان نے بے دردی سے اپنے آنسو ہتھیلی سے صاف کیے۔ "تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے برابر میں آ کر بیٹھنے کی اور مجھ سے بات کرنے کی۔ میں بھرے مجمع میں بیٹھ کر روؤں یا ہنسوں۔ تم ہوتے کون ہو؟" غم و غصے کی ایک تیز لہر نے اسے شدت سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"کیوں۔ ہم آپس میں دوست نہیں ہیں۔" وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بینچ کی پشت سے ٹیک لگائے اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے مژگان کے غصے کا اس پر رتی برابر بھی اثر نہ ہوا ہو۔

"نہیں۔ جو آپ کا مذاق اڑائے اور دوستی کے نام پر تذلیل کرے، وہ دوست نہیں ہوتا۔" وہ قطعیت سے کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی اور رخ دروازے کی جانب تھا۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو مس نون کہا تھا۔" جبران کے منہ سے ادا ہونے والے پہلے جملے پر اس کے قدموں کی حرکت دھیمی پڑ گئی تھی۔

"اینڈ اگین آئی ایم سوری۔ میں نے اس رات آپ کے ساتھ ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا۔" جبران کے دوسرے جملے پر وہ اپنی جگہ ٹھہر گئی تھی۔ "کبھی کبھار بن بتائے برس جانے والی بارش، میرے اندر کے شوخ بچے کو یونہی میری روح سے باہر لے آتی ہے۔ میں شرمندہ ہوں مژگان!"

دس قدم کی دوری وہ ایک ہی جست میں طے کر کے مژگان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں کانوں کی لوئیں پکڑ رکھی تھیں۔

"یہ۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔" وہ جھجکی تھی۔

"میں وہ ہی کر رہا ہوں۔ جو مجھے کرنا چاہیے۔ جب آپ یہاں بیٹھ کر رو سکتی ہیں تو کیا میں معذرت کرنے کے لیے کان نہیں پکڑ سکتا؟"

"اوکس اوکے۔" اس نے دو لفظوں میں بات ختم کر دی اور جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

"جب معاف کر چکی ہیں تو اس طرح روٹھ کر کیوں جا رہی ہیں۔" جبران اس کے ہم قدم ہوا۔

"روٹھ کر نہیں جا رہی۔ گھر جا رہی ہوں۔" جبران نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"ایک بات کہوں مژگان! یہ دنیا ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستی ہے۔ مگر رونے والوں کے اوپر ہنستی ہے۔ میں نے اس دنیا میں رہ کر یہی سیکھا ہے کہ لڑھکتا ہوا پتھر بے وزن ہوتا ہے۔ جسے جب کوئی چاہے ٹھوکر مار کر گزر جاتا ہے۔" مژگان نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے لہجے میں غیر معمولی پن تھا۔

"مجھ پر بھی یہ وقت آیا تھا مگر پھر میں نے وقت کے بہاؤ میں بہنا سیکھ لیا۔" جبران نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے چلنے لگا۔

"بچپن میں باپ سے محرومی، یتیمی کا سایہ۔ رشتہ داروں کا بدل جانا۔ ممانے دو دو شفٹوں میں اسکول میں پڑھایا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"جو اپنے گزرے وقت کو برا سمجھتے ہیں۔ ان کا اچھا وقت کبھی نہیں آتا۔ مگر میں نے اپنے برے وقت کو "لیٹ اٹ گو" کرنا سیکھا۔ آج میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر ہوں۔ سارے رشتہ دار پھر سے اچھے بن گئے ہیں۔ میری وجاہت، ایجوکیشن، اچھی پوسٹ، ہر چیز میں سب کے لیے کشش ہے۔ باطن میں بھلے سے کتنی ہی خاک اڑے مگر اب ظاہر میں سب اچھا ہے۔ اس لیے میرے مذاق پر مائنڈ نہ کیا کرو۔" کہتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"دوسروں کے مذاق اگر خود پر جھیلنے کی عادت پڑ جائے تو کڑے وقت میں ملنے والے طعنے زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح دل پر نہیں لگتے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور چلتے چلتے رک گیا۔ مژگان بھی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو اسماعیل میرٹھی کے دو شعر سناتا ہوں۔ بچپن میں کبھی پڑھے تھے مگر ایک سبق کی طرح آج تک یاد ہیں۔"

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل
تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
یہ مانا کہ مشکل بہت ہے سبق
برا ہے مگر اضطراب اور قلق

"اب میں چلتا ہوں۔ پھر ملیں گے۔" اس نے شعر سنا کر اجازت چاہی اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر سیٹی بجاتا ہوا پارک کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اسے خاموش کر گیا تھا۔ مگر خانہ دل میں کوئی ساز چھیڑ کر، بے خبر تھا مگر وہ سر دھن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کہاں تھیں تم مژگان؟" مژگان کے لیے دروازہ کھولتے ہی فرخندہ چیخ پڑی تھیں۔

"ماما! کیا ہوا آپ کو۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔ آپ رو رہی ہیں۔" مژگان ماں کا بے حال چہرہ اور دوپٹے سے بے نیاز وجود کو دیکھ کر اپنی کل رات کی ساری ناراضی بھول چکی تھی۔

"میں نے پوچھا کہاں تھیں تم؟" وہ پھر سے رونے لگی تھیں۔

"صبح بغیر ناشتے کے آفس چلی گئیں، آفس فون کیا تو پتا چلا، تم وہاں گئی ہی نہیں ہو۔ موبائل پر کال کر رہی ہوں تو موبائل بھی آف کیا ہوا ہے۔ کس طرح میں نے شام تک کا وقت کاٹا ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔ اور جب جم کے ٹائم میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم جم بھی نہیں گئیں۔" وہ زارو قطار رو رہی تھیں۔ مژگان بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔

"تمہارے سوا میرا ہے ہی کون۔ میری کل کی باتوں کی ایسی سزا دی کہ جان ہی نکال دی۔" فرخندہ نے مژگان کو خود میں بھینچ لیا۔

"میں پارک میں بیٹھی تھی صبح سے لے کر اب تک۔ میں آپ سے ناراض نہیں تھی۔ میں خود سے ناراض تھی۔ میں سمجھتی تھی پاپا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد میں ہی سب سے زیادہ آپ کے قریب ہوں مگر کل مجھے پتا چلا کہ میری ذات آپ کے لیے سکون کا نہیں، تکلیف کا باعث ہے۔ آپ میری وجہ سے راتوں کو سو نہیں پاتیں۔ لوگوں کی دس اولادیں ہوتی ہیں، جن کی فکریں انہیں ہلکان رکھتی

ہیں۔ مگر میں آپ کے لیے دس اولادوں پر بھاری ہوں۔ میرے نصیب کی سیاہی نے آپ کے دن کو بھی رات میں بدل دیا ہے۔ اور۔ اور۔" روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔
"بس چپ۔" فرخندہ نے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی۔ اب ایک لفظ مت کہنا۔ تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔ اگر ماں بیٹی کا سایہ ہوتی ہے تو بیٹی بھی تو ماں کی پرچھائیں ہوتی ہیں۔ کبھی سایہ بھی اپنے اصل سے جدا رہ پایا ہے پگلی!" وہ اس کے چہرے اور بالوں پر بے ساختہ پیار کرنے لگیں۔
"آئی ایم سوری ماما! میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔ آپ جس ڈاکٹر اور ہربلسٹ کے پاس لے جائیں گی۔ میں چلوں گی۔" وہ ماں کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ ایک دھوپ چھاؤں کا منظر تھا جو مژگان کے گھر کے صحن میں اترا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی شام۔ وہ پھر اسی پارک میں اسی مخصوص بینچ پر براجمان تھی۔ آفس کے بعد جم جانے کے بجائے وہ یہاں چلی آئی تھی پتا نہیں کیوں؟ پچھلی رات بہت پرسکون تھی۔ جبران کی خوبصورت باتوں نے اس کے دل سے حورعین اور ماما کی کہی ہر بات کے اثر کو جیسے زائل کر دیا تھا اور باقی کا ملال تب غائب ہو گیا تھا جب اس نے ماما کو اپنے لیے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ خالص ممتا کا روپ تھا۔ رات کتنی ہی دیر وہ تکیہ کو بازوؤں میں بھینچے جبران کے پڑھے ہوئے اشعار دہراتی رہی تھی۔"

یہ مانا کہ مشکل بہت ہے سبق
برا ہے مگر اضطراب اور قلق۔۔۔

"شاید مجھے نکال کے پچھتا رہی ہوں آپ۔۔۔ پارک میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں۔"
جبران پچھلی بار کی طرح اس بار بھی بے تکلفی سے اس کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ "تو آپ میری منتظر تھیں؟"
"جی نہیں۔ میں تو بس یونہی ہوا خوری کے لیے آئی تھی۔" وہ جھینپ سی گئی تھی۔
"ہوا خوری۔" جبران نے ذرا سا مژگان کی طرف جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"ویسے اگر ہوا خوری کا صحیح معنوں میں لطف اٹھانا چاہتی ہیں تو صبح کے وقت یہاں آئیے۔ آہا! کیا خوب منظر ہوتا ہے اور آپ بھی بالکل ہلکی پھلکی ہو جائیں گی۔" جبران نے اس کی سمت اشارہ کیا تھا۔
"میں اس کے لیے جم جاتی ہوں" وہ مختصر سا جواب دے کر سامنے دیکھنے لگی تھی۔
"جم۔۔۔ وہ آپ کے اوپر کوئی خاص اثر نہیں کر سکتا۔" اس نے نفی میں ہاتھ لہرایا۔
"کیا مطلب؟" اس نے ناسمجھی میں جبران کو دیکھا۔
"خود سوچیں۔ آفس کی تھکا دینے والی جاب کے بعد جم جانا۔ یعنی ایک مشینی زندگی سے نکل کر پھر مشینوں کی لمبی قطار میں داخل ہونا۔ سونے پر سہاگہ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک وزن دار خاتون۔ وہاں موجود ایسا ماحول' جہاں کوئی اسپارک ہی نہ ہو۔ وہاں کوئی شخص جانے کی اپنے اندر طلب کیونکر پیدا کر سکتا ہے؟"
جبران نے اتنے مزے سے کہا کہ مژگان کی ہنسی نکل گئی۔ اور وہ دیر تک ہنستی رہی۔ جبران بولنا بھول کر ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ ہنستے ہوئے مژگان کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگی تو وہ بھی چونک کر سیدھا ہو گیا مگر مژگان کے ہونٹوں پر ابھی بھی مسکراہٹ باقی تھی۔
"اب یہی دیکھ لیں کہ آپ آج بھی آفس کے بعد جم جانے کے بجائے یہاں موجود ہیں۔ اگر روز اسی طرح مجھ جیسے رول ماڈل کے ساتھ جاگنگ کریں گی اور ساتھ میں فطرت کے خوبصورت نظارے ہوں گے تو پھر دیکھیے گا دنوں میں آپ پر کرشماتی اثر ہو جائے گا۔ اور لوگ آپ سے "آپ کے جم کا ایڈریس پوچھیں گے۔"
"اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟" مژگان نے مسکراتے ہوئے جبران کو دیکھا۔
"گارنٹی کا انحصار مجھ پر نہیں صرف اور صرف آپ کی طلب پر ہے۔" وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور فولڈ کی ہوئی آستین سیدھی کرنے لگا۔
"کون ہو تم؟" مژگان نے حیرانی سے نظر اٹھا کر لمبے چوڑے جبران کو دیکھا۔ اس کی وجاہت واقعی قابل دید تھی۔ وہ ہمیشہ اسے تم تم کہہ کر مخاطب کر لیا کرتی تھی مگر جبران نے ہمیشہ اسے آپ کہہ کر ہی مخاطب کیا تھا۔
"اوف۔ اتنی ساری ملاقاتوں کے بعد آج آپ کو یہ اہم سوال پوچھنے کا خیال آیا۔" جینز کی جیبوں میں ہاتھ کے انگوٹھے پھنساتے ہوئے وہ اپنا ایک پیر بینچ کے کونے پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"میں۔ میں تو بس ایک عام سا انسان ہوں۔ امید بانٹتا ہوں' حوصلہ بڑھاتا ہوں اور دوست بناتا ہوں۔" کلائی پر بندھی اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔
"ایک ضروری کام سے جانا ہے پھر ملیں گے۔ اگر آپ چاہیں گی تو۔۔۔ میں یہاں روز جاگنگ کرنے آتا ہوں۔"
"او کے۔" مژگان نے سر ہلا دیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ پلٹ کر مژگان کو دیکھا۔
"آپ کی ہنسی بہت خوبصورت ہے اور شفاف بہت اچھا کرتی ہیں آپ جو اس کے استعمال میں کنجوسی سے کام لیتی ہیں۔ نایاب چیزوں کو کم کم استعمال کرنا چاہیے۔" جبران کی تعریف نے مژگان کو نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔
ایک نیا روزن مژگان کی زندگی میں کھل گیا تھا۔ ایک نئی روٹین۔ یہ نئی روٹین اسے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ الارم کی پہلی گھنٹی کے ساتھ ہی اٹھ جاتی۔ نماز اور قرآن کی تلاوت کے بعد جوں ہی سورج لوٹ سے نکلتا۔ وہ جاگرز کے تسمے باندھتی' چادر اپنے گرد لپیٹتی اور آہستہ قدموں سے پارک کی طرف چلی جاتی۔
"آپ روز دس منٹ لیٹ آتی ہیں۔" جاگنگ ٹریک پر دوڑتے ہوئے ٹریک سوٹ میں ملبوس جبران نے ساتھ دیتی مژگان سے کہا۔
"تم میرے منتظر رہتے ہو۔" مژگان نے پھولی سانسوں کے درمیان پوچھا۔ ابھی وہ اس روٹین کی عادی نہ تھی۔ اس لیے بھاگتے ہوئے سانس بھولنے لگتی تھی۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ جبران کا جواب کیا ہو گا۔
"نہیں۔" جبران کی طرف سے ایک لفظی جواب آیا۔ مژگان جہاں تھی وہیں رک گئی۔ جیسے چابی سے چلتی گڑیا کی چابی ختم ہو جانے پر رک جاتی ہے۔
"کیا ہوا۔ آپ رک کیوں گئیں۔" جبران بھی دوڑتے ہوئے رک گیا تھا۔ مگر رکنے کے باوجود اس کے پیر حرکت میں تھے۔
"جب منتظر نہیں رہتے تو یہ سوال کیوں؟" مژگان کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا۔
"ہم۔م۔م" جبران نے ہنکارا بھرا تھا۔ "دیکھو مژگان! بعض اوقات ہم خدا سے مکالمہ کرتے ہیں۔ سوال جواب' سوال جواب بظاہر ہم خدا کو مخاطب کرتے ہیں' شکوہ' شکایت' رونا دھونا سب کچھ۔ مگر حقیقت میں سوال بھی ہم ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ اور جواب بھی ہمارے اندر سے نکلتا ہے۔ اور یوں ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی جواب وہ نہیں ہوتا' جو ہم چاہتے ہیں۔ خلاف توقع رسپانس چاہے خدا کی طرف سے ہو یا لوگوں کی طرف سے۔ تب یوں حیران ہو کر رک نہیں جانا چاہیے۔ وارم اپ پوزیشن میں رہنا چاہیے۔ کم آن۔" جبران نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
"بھئی اس جاگنگ ٹریک پر میں آپ کا ٹیچر ہوں اور اسٹوڈنٹ کو ٹیچر سے کم از کم دس منٹ پہلے موجود ہونا چاہیے۔

اس نے مژگان کو کچھ جتایا نہیں تھا۔ مگر مژگان پھر پورا وقت جھینپی جھینپی رہی تھی کہ جبران اس کا ٹھٹک کر رکنا محسوس کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
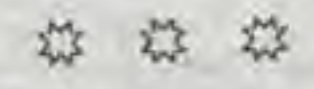
اور اگلے دن وہ دس منٹ پہلے پارک میں موجود تھی۔ کیونکہ وہ جبران جیسا پیارا دوست اور استاد کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"امی آج کل میرے پیچھے پڑی ہیں۔ چاہتی ہیں بس چھ مہینوں کے اندر اندر شادی کرلوں۔" پینتالیس منٹ کی رننگ کے بعد وہ دونوں اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھے تھے۔ اپنی واٹر بوتل سے پانی پیتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ کوئی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی۔ مگر پھر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔ زندگی میں ابھی بارہا ایسے مواقع آنے ہیں جب اسے بھاگتے ہوئے واپس وارم اپ پوزیشن میں آنا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ پھر یہ بتاؤ کب کر رہے ہو شادی۔" اس نے اپنا لہجہ ہشاش کرلیا تھا۔

"شادی کرنا اتنا آسان کہاں۔ اور وہ بھی مجھ جیسے ہینڈسم بندے کے لیے۔ ایٹ لیسٹ میرے لیے کوئی لڑکی میری ہی ٹکر کی ہونی چاہیے ناں۔" بولتے ہوئے جبران نے مژگان کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے لی اور منہ اونچا کر کے قدرے فاصلے سے پانی حلق میں انڈیلنے لگا۔ مژگان اسے دیکھے گئی۔ یہ بے نیاز مگر دل سے بے حد قریب شخص جانے کس خوش نصیب کا ساتھی ہوگا۔

"کہاں کھو گئیں؟" جبران نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ وہ چونک کر منظر میں واپس آئی تھی۔

"آپ دیکھیں ناں میرے لیے کوئی لڑکی۔ آخر آپ میری بہت اچھی دوست ہیں۔"

"میں۔" اس نے حیرانی سے خود پر انگلی رکھی تھی۔

"آف کورس آپ۔" جبران نے اطمینان سے کہا تھا۔

"میری ایک دوست ہے۔ بہت پیاری سی۔ آئی ایم شیور۔ تمہاری اور اس کی جوڑی بہت اچھی لگے گی۔"

"کون۔ وہ جو ایک بار آپ کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی؟"

"ہاں وہ ہی۔" مژگان کے لہجے میں افسردگی گھل گئی تھی۔ وہ منظر سے غائب ہو جائے تو شاید کبھی کسی کو اس کی کمی محسوس نہ ہو اور ایک حورعین تھی۔ جو اسے ایک بار دیکھ لیتا تھا۔ کبھی نہیں بھولتا تھا۔

"امیزنگ۔ آئی کانٹ بلیو اٹ۔ آپ پہلی لڑکی ہیں۔ جس نے اپنے بجائے اپنی فرینڈ کا نام لیا ہے۔ ورنہ میں آج تک جتنی بھی لڑکیوں سے ملا ہوں۔ وہ سب اس کوشش میں ہوتی تھیں کہ کسی طرح مجھے اپنی طرف مائل کرلیں۔ تم نے تو مجھے حیران کردیا۔" وہ حیرانی میں آپ جناب کا تکلف بھی بھول گیا تھا۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ نہ میں خوبصورت ہوں اور نہ ہی بہت خاص۔" وہ لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے سامنے لگے درخت کو دیکھنے لگی۔ "مگر حورعین بہت حسین ہے اور خاص بھی۔ ویسے بھی اس کی امی اس کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ بلکہ ایک دو بار باتوں باتوں میں وہ مجھ سے یہ بھی کہہ چکی ہیں کہ اگر کوئی اچھا رشتہ ہو تو میں انہیں بتاؤں۔" وہ یہ سب بولتے ہوئے ابھی بھی اسی درخت کو تکے جا رہی تھی۔

"اور تمہاری امی... کیا وہ تمہارے لیے پریشان نہیں ہوتیں۔ اور کیا تم اتنی بڑی ہو کہ لوگ تم سے اپنی بیٹیوں کے لیے رشتہ تلاشنے کا کہیں۔" جبران کی حیرانی ابھی بھی باقی تھی۔ اس نے مژگان کا چہرہ بغور دیکھا مگر مژگان اس کی سمت متوجہ نہیں تھی۔ اس کی نگاہوں کا محور وہ درخت ہی تھا۔

"عام سے لوگ ریجیکٹ ہو جائیں، اس میں کیا پریشانی ہے جبران!" مژگان نے درخت سے لحظہ بھر کے لیے نگاہ ہٹا کر جبران کی طرف دیکھا تھا اور پھر دوبارہ درخت پر مرکوز کردی تھی۔

"مگر حسین لوگ رد کیے جائیں تو یہ معمول سے ہٹ کر بھی ہے اور پریشان کن بھی۔" جبران کی سنگت میں وہ اب خود پر ضبط کرنا سیکھ گئی تھی۔ سارے آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے۔

"کیا حورعین بھی تمہارے لیے ایسا ہی سوچتی ہے۔" جبران کا لہجہ کھوجتا ہوا سا تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "میں نے کبھی اس سے اپنا آپ شیئر نہیں کیا۔ ہاں مگر وہ مجھے اکثر اپنے پروپوزلز کے بارے میں بتاتی ہے اور وہ کسی اجنبی پر اعتبار کرے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ تم پر اعتبار کرلے۔" مژگان کے دھیان میں حورعین کا رانگ نمبرز چیک کرنا اور سوشل سائٹس پر موجود لوگوں کو آزمانے جیسا بے وقوفانہ رویہ یاد آیا تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے جبران کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے میں چاہتی ہوں کہ میرے دو اچھے دوست ایک ہو جائیں۔" اسے خاموش دیکھ کر مژگان نے مزید کہا۔

"ہم۔ م۔ م۔ دیکھنے میں تو آپ کی دوست محترمہ کافی پراوڈ لگتی ہیں مگر خیر! خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔" جبران کی سنجیدگی اور حیرانی منٹوں کی تھی۔ وہ واپس تم سے آپ پر آچکا تھا۔

"او کے۔ اس سنڈے امی میری پروموشن کی وجہ سے گھر میں گیٹ ٹوگیدر رکھ رہی ہیں۔ آپ اور آنٹی تو آئیں گی ہی۔ اپنی دوست کو بھی لے آئیے گا۔" وہ جانے کے لیے جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مژگان نے بھی اپنی بوتل سنبھالی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"مگر اس سے پہلے۔ سٹرڈے والے دن ریڈی رہنا۔ میں آپ کو آفس سے پک کروں گا۔"

"مگر ہم نے جانا کہاں ہے؟" مژگان کو یہ سرپرائز سمجھ میں آیا۔

"یہ میں اسی دن بتاؤں گا۔ اب چلیں۔" اجازت طلب کرتے ہوئے جبران نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"جبران۔" مژگان نے اسے آواز دی۔

"ہوں۔" مختصر سا جواب آیا۔

"آج تم نے مجھے تم کہا۔ مجھے اچھا لگا۔ میں چاہتی ہوں تم مجھے ہمیشہ تم ہی کہہ کر پکارو۔ اس میں اپنائیت جھلکتی ہے۔" مژگان نے دھیرے سے کہا۔ جبران نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

"میں جانتا ہوں، تم کہنے میں اپنائیت ہے۔ مگر زندگی میں کچھ لوگ آپ کو ایسے ملتے ہیں جن سے آپ اپنائیت سے زیادہ عزت کا رشتہ نبھاتے ہیں۔ اس لیے انہیں آپ کہتے ہیں۔"

بعض جملے اتنے مکمل ہوتے ہیں کہ ان کے بعد ہر سوال کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ مژگان بھی چپ تھی اور چپ سے زیادہ حیران تھی۔ جبران کے لفظوں نے اسے لاجواب کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر خوب صورتی کے پیمانے پر اسے پرکھا جاتا تو وہ کسی پوزیشن پر نہ ہوتی۔ پیچھے بال کر کے پونی میں مقید کیے، آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور فربہ جسم اس حلیے کے ساتھ وہ نمایاں تو نظر آتی تھی۔ مگر مقابل کو اٹریکٹ (متاثر) نہ کرتی تھی۔

پہلی بار میری ملاقات، اس سے اپنے ہی گھر کے دروازے پر ہوئی تھی جب وہ چڑچڑے پن سے مجھ سے میرا ہی تعارف مانگ رہی تھی۔ اور میں نے اسے اور اس کے دوست کو الف نون کی جوڑی کہا تھا۔ دوسری بار وہ مجھے جم کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ٹکرائی تھی۔ اس دن بھی اس کے تیور جارحانہ تھے۔ اسے غصہ تھا کہ میں اس کے راستے میں آجاتا ہوں۔ اور مجھے چڑ ہو رہی تھی کہ اس کا جم کسی کا بھی راستہ روک سکتا ہے۔ عجیب لڑکی تھی۔ مگر میں اپنے چڑچڑے انداز کو ظاہر کرنے کے بجائے اس کے تیور سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اور پھر باہر برستی بارش نے گویا میرا مزاج بدل دیا اور میں اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا مذاق کر بیٹھا۔

مگر تیسری بار میں ٹھٹک گیا۔ معصوم سا چہرہ، شانوں پر بکھرے سلکی بال اور نظر کا چشمہ آنکھوں کے بجائے گود میں پڑا تھا۔ یہ ایک قریبی پارک تھا جہاں میں اکثر

صبح جاگنگ اور شام میں واک کے لیے جاتا تھا۔ اور اس شام وہ یعنی مژگان جعفری پارک کی بینچ پر بیٹھی رونے میں مصروف تھی۔ میرے پکارنے پر اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا تو کئی آنسو گال پر سے لڑھکتے ہوئے گود میں دھرے ہاتھوں میں جذب ہوگئے تھے۔

لوگ کہتے ہیں' نفرت کا جذبہ سب سے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو توڑ دیتا ہے۔ مگر میرے نزدیک' لاچاری' بے بسی اور دوسروں کی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم اور ہمدردی دیکھنا نفرت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ نفرت کے جذبے میں ہم کم از کم اپنے مقابل کو طاقت اور قابلیت میں اپنے برابر تو سمجھتے ہیں۔ مگر جذبہ ہمدردی کے وقت ہم سامنے والے کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں' اسے وہاں بیٹھ کر روتے ہوئے دیکھ کر مجھے اپنا گزرا وقت یاد آیا تھا۔ جب لوگوں کی چبھتی ہوئی ہمدردی سے یونہی بھاگ کر میں کوئی ایسا کونا تلاش کرتا تھا۔ جہاں کوئی میرا اپنا مجھے تلاش نہ کرے۔

بابا کے ایکسیڈنٹ کے بعد' چاچو نے گھر پر زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ تب امی مجھے لے کر ماموں کے گھر آگئی تھیں' امی کے لیے' بابا کے بعد اب سب سے اہم میں تھا۔

میں بہت خوش تھا کہ چاچو' چاچی اور ان کے بچوں کے برے رویے سے بچ کر میں یہاں آگیا تھا۔ ماموں کا گھر ہمیشہ سے میرا فیورٹ تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں آدھی چھٹیاں میں یہیں گزارتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں اس وقت کی تھیں جب تک سارا انتظام نانو کے ذمہ تھا۔ پھر نانو کی ضعیفی اور بیماری نے آہستہ آہستہ سب کا چہرہ عیاں کردیا۔ امی اسکول سے آکر نانو کی خدمت میں لگ جاتیں۔ اور گھر کے ان گنت کتنے ہی چھوٹے بڑے کام جو پہلے نانو خاموشی سے کرویا کرتی تھیں۔ اب امی کے ذمے آگئے تھے۔ مگر مامی پھر بھی ناراض ہی رہتیں۔

اسکول کی دو' دو شفٹوں میں پڑھانا' اور پھر گھر آکر نانو کی خدمت اور گھر کے کام۔ امی ان سب مصروفیات میں مجھ سے دور ہوتی چلی گئیں۔ اور میں اپنے کھلونوں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ مجھے اپنے کھلونے بے حد عزیز تھے۔ کیونکہ وہ سب میرے پیارے بابا نے دلائے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے پھر کوئی نیا کھلونا نہیں خریدا تھا۔ وہ دن' جب میری فیورٹ ٹوائے کار کو میری کزن زویا نے صوفے کے اوپر سے پھینک کر توڑ دیا تھا۔ اور مامی سے زویا کی شکایت کرنے پر الٹا مامی نے مجھے ہی ڈانٹا تھا۔ بھیک منگا' فقیر اور خیرات پر پلنے والا کہا تھا۔ تب مجھے مژگان کی طرح ایسا ہی ایک کونا درکار تھا۔ جہاں میں سب سے چھپ کر رو سکوں اور کوئی مجھ پر نہ ہنسے' خاص طور پر میرے کزنز' اسد' زویا اور مانی۔ میں ٹوٹی گاڑی کے ٹکڑے سمیٹ کر چھت پر چلا آیا تھا۔

میں جانتا تھا۔ امی ابھی اسکول سے آئی ہیں اور اب وہ دوپہر کے پڑے ہوئے برتن دھو رہی ہوں گی۔ انہیں یہ یاد ہی نہ ہوگا کہ میں کہاں ہوں۔ چھت پر آکر میں ٹنکی کے پیچھے جاکر بیٹھ گیا تھا۔ بھلے... وقت نے مجھے بہت سمجھ دار کردیا تھا مگر میں تھا تو بچہ۔ میں اپنی سسکیوں پر قابو نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جانے کتنے لمحے دبے پاؤں گزر گئے۔

"مجھے چیونٹی اچھی لگتی ہے۔" امی کی آواز نے مجھے چونک کر سر اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا۔ پھر بھی وہ مجھے تلاشتی چھت پر چلی آئی تھیں۔ میں نے ماں کا چہرہ دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح' جس طرح مژگان نے پارک میں سر اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا تھا۔

میری ماں بے خبر نہیں تھی۔ صرف مصروف تھی۔ وہ پنجوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں اور اپنے گیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے خشک کررہی تھیں۔ میرے متوجہ ہونے پر انہوں نے پھر سے اپنا جملہ دہرایا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں' مجھے چیونٹی واقعی بہت اچھی لگتی ہے۔ زمین پر چلنے والے کیڑوں میں سب سے چھوٹی' حقیر سی نظر آنے والی۔ مگر اس کے عزائم بے حد بلند ہوتے ہیں۔ اس کی راہ میں پہاڑ جیسی رکاوٹ بھی آجائے' تب بھی' وہ دو چیزیں نہیں بھولتی۔ اپنی بقا کی کوششیں اور دوسرے رزق کی تلاش۔ اور یہی سبق وہ ہمیشہ اپنے بچوں کو بھی دیتی ہے کیا تم چیونٹی سے بھی چھوٹے ہو؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

میرا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا تھا۔

"تو پھر آؤ' ہم کھانا کھاتے ہیں' پھر اس گاڑی کو جوڑیں گے۔"

انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے ٹوٹی ہوئی گاڑی کے ٹکڑے اٹھانے کو کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے چلی آئیں۔ اس دوران انہوں نے میرے آنسو پونچھے تھے' نہ زویا اور مامی پر لعن طعن کی تھی۔ نہ حالات کا رونا رویا تھا اور نہ ہی یہ دلاسا دیا تھا کہ وہ نئی گاڑی لادیں گی۔ پھر بھی نجانے کیوں میرا دل ٹھنڈک سے بھر گیا تھا۔ وہ دن' اور اس کے بعد آنے والے ہر دن میں' میں نے یہی جانا کہ ترحم اور ترس سے کہیں زیادہ طاقت ور ایک اور جذبہ ہوتا ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ اور محبت کسی کی بھی زندگی بدل سکتی ہے۔

میں اور مژگان' روز صبح جاگنگ کے لیے نکلتے۔ پینتالیس منٹ تک بھاگتے رہتے' شانہ بہ شانہ' ہم قدم۔

اس بھاگ دوڑ میں' میں ہر روز اس کے اندر محبت کے رنگ بھرتا جارہا تھا۔

زندگی سے محبت۔

اپنے آپ سے محبت۔

اور

جو میسر ہے' اس پر اللہ سے راضی رہنے کی محبت۔

اور ان تمام رنگوں کے بیچ' اس کی آنکھوں میں میری ذات کے لیے پسندیدگی اتر آئی تھی۔ وہ لاکھ چھپائے مگر مجھے یعنی جبران خاور کو وہ پسندیدگی نظر آتی تھی۔"

ڈائری لکھتے لکھتے جبران نے سر اٹھایا تھا۔ جانے کس احساس کے تحت وہ اتنے سارے صفحے لکھ گیا تھا۔ وہ خود اپنے آپ پر مسکرایا اور پھر سے لکھنے لگا۔

"میری ایک دوست ہے' بہت پیاری' آئی ایم شیور۔ تمہاری اور اس کی جوڑی بہت اچھی لگے گی۔"

میں نے حیرانی سے چونک کر اس کا معصوم چہرہ دیکھا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس لڑکی نے مجھے شدت سے حیران کردیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ وہ عام سی لڑکیوں کی طرح مذاق میں ہی سہی مگر اپنا نام لے گی۔ یا پھر کم از کم اس کی آنکھوں میں دکھ تو اتر آئے گا کہ جسے وہ پسند کرتی ہے۔ وہ کہیں اس سے دور نہ ہوجائے۔

مگر اس کا جواب وہ تھا۔ جو میں کبھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ آج کے زمانے میں اپنی ذات سے ہٹ کر کون سوچتا ہے؟

مگر وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ہی اندازہ لگایا تھا۔ اور پہلی بار ہی میرا اندازہ غلط ثابت ہوگیا تھا' وہ بہت مختلف لڑکی تھی۔ کونا تلاش کر کے رونے والی' ہمدردی سے گریزاں اور احساس دلائے بغیر دوستی نبھانے والی۔ یہ تھی اصل مژگان عثمان جعفری۔ جب میں پارک کی نشست سے اٹھا تو میں حورعین سے ملنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔"

☼ ☼ ☼

"Look at your self" (اپنے آپ کو دیکھیں) ہیئر اسٹائلسٹ کے کہنے پر اس نے سر اٹھا کر اپنا آپ دیکھا اور حیران رہ گئی۔ بالوں کے نئے کٹ نے اسے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا اور جب وہ اسی حیرانی کے ساتھ جبران کے سامنے آئی تو جبران کے چہرے پر ستائشی مسکراہٹ ابھری۔

"میں جانتا تھا۔ یہ کٹنگ آپ پر بہت اچھی لگے گی۔"

"ہم... م... م..." اس نے ہنکارا بھرا۔

"مگر ابھی بھی کچھ کمی ہے' کم آن۔" پے منٹ کر کے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا تھا۔

"اب کہاں جارہے ہیں؟" وہ اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

"آپٹکس پر۔" گاڑی تک آکر اس نے مژگان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پہلے مژگان کے لیے دروازہ کھولا پھر خود

دوسری جانب سے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
"مگر کیوں؟" وہ حیران تھی۔
"آج کوئی سوال نہیں۔ جسٹ فالو می۔" وہ اپنی بات کہہ کر گاڑی بڑھا چکا تھا۔ آج ویک اینڈ تھا۔ جبران نے اسے دو بجے آفس سے پک کیا تھا۔ پہلے وہ اسے بیوٹی سیلون لے کر گیا۔ خود ہی ہیئر اسٹائلسٹ سے بات کر کے ہیئر اسٹائل کیٹلاگ میں سے ایک کٹ سلیکٹ کیا اور اب وہ اسے آپٹکس پر لے جا رہا تھا۔
"ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ دس۔" سیلز مین نے دس فریم مژگان کو ٹرائی کروائے مگر جبران کو کوئی ایک بھی پسند نہ آیا تھا۔
"سر! آخر آپ کو کیسا فریم چاہیے؟" سیلز مین بھی شاید زچ ہو چکا تھا۔
"ایسا فریم جو ان کے چہرے پر بالکل پرفیکٹ لگے۔" جبران نے مسکرا کر پہلے مژگان کا چہرہ دیکھا اور پھر سیلز مین سے کہا۔ سیلز مین بھی مسکرا دیا۔
"اوکے میں آپ کو فریم کی نئی رینج دکھاتا ہوں۔ یہ گول اور چھوٹے چہروں کے لیے آج کل بہت اِن ہیں۔" وہ کہتا ہوا گلاس کپ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔
"اب دیکھو خود کو۔ لگ رہی ہو نا۔ مژگان سے مژی۔ ویلس ویری گڈ۔" نئے ہیئر اسٹائل کے ساتھ چھوٹا سا میرون رنگ کا آئی فریم مژگان کی معصومیت اور دلکشی کو کئی گنا بڑھا گیا۔
"بس یہی فائنل ہے۔ آپ اس میں یہ لینس گلاس فٹ کر دیں۔" جبران نے مژگان کے ہاتھ سے پرانا چشمہ اور نیا فریم دونوں لے کر سیلز مین کو دے دیے۔
"آپ کو کبھی کسی نے بتایا نہیں کہ اپنے بڑے سے بلیک فریم کے ساتھ آپ بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔" جبران نے جھک کر مژگان سے پوچھا۔ سیلز مین اپنے کام میں مصروف تھا۔
"نہیں۔" وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی تھی اور جواب میں جبران صرف ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ وہ سیلز مین کو پے منٹ کرنے لگا۔ وہ اسے دیکھے گئی۔ وہ جبران کو کیا بتاتی کہ کبھی کسی نے اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہ تھا۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ موٹے لوگوں کو کچھ اچھا نہیں لگتا اور لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی اپنے لیے ایسی ہی رائے رکھنے لگی تھی۔
"آئیں۔" وہ اسے آپٹکس سے باہر لے آیا تھا۔ اس بار مژگان نے کوئی سوال نہیں کیا تھا بس خاموشی سے جبران کے کہنے پر عمل کرتی رہی تھی۔ ان کی اگلی منزل بوتیک تھی۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ بوتیک کا گلاس ڈور کھول کر اسے ساتھ لیے اندر داخل ہوا تھا۔
وہ ڈریس پر ڈریس نکال کر دیکھتا جا رہا تھا اور جو سائز اور اسٹائل مژگان کے لیے مناسب لگتا وہ اسے تھماتا جا رہا تھا۔
"کیا اپنی ساری سیلری مجھ پر ہی لگا دو گے؟" مژگان نے اپنے ہاتھ میں پکڑے چھ اسٹائلش سوٹوں کو دیکھا تھا۔
"نہیں۔ اونلی زیرو پوائنٹ زیرو تھری (0.03) ہی خرچ ہوں گے۔" جبران نے مسکرا کر کہا۔ "اب ان چھ سوٹوں میں سے جو دو سوٹ آپ کو اچھے لگ رہے ہیں انہیں ٹرائل روم میں جا کر چیک کر آئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب کل میری اسٹوڈنٹ میری پروموشن پارٹی میں آئے تو کسی سے کم نہ لگے بلکہ لوگ اس کے جم کا ایڈریس اس سے پوچھیں۔" جبران نے کہا۔ وہ ایک بار پھر اسے لاجواب کر چکا تھا۔ مژگان کو لگا کہ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے ہیں۔ وہ بنا کچھ کہے اپنے حساب سے اچھے لگنے والے دو سوٹ لیے ٹرائل روم کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہماری وش ہی ہماری ول ہوتی ہے اور ہم اپنے مقصد میں کتنے کامیاب ہیں' اس بات کا انحصار ہماری طلب پر ہوتا ہے۔"
کتنا سچ کہا تھا جبران نے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے عکس کو دیکھے جا رہی تھی۔ جبران کے دلائے گئے پرپل کلر کے ریڈی میڈ سوٹ، نئے ہیئر کٹ اور گلاسز

کے ساتھ وہ ایک بالکل بدلی ہوئی مژگان لگ رہی تھی۔ صرف دو مہینوں کی جاگنگ نے اس کا وزن کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ بیڈ کے نیچے رکھی ویٹ مشین نکال کر کھڑی ہو گئی اور خوشی کے مارے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ اپنا آٹھ کلو وزن کم کر چکی تھی۔
"جبران خاور۔ یو آر گریٹ۔" اس نے ایک زور دار نعرہ لگایا تھا اور جب وہ فرخندہ جہاں اور حورعین کے سامنے آئی تو دونوں کی حیرت قابل دید تھی۔

☼ ☼ ☼

جبران کی پروموشن پارٹی تھی مگر وہ کہیں سے بھی راجہ اندر نہ لگ رہا تھا بلکہ کچن میں مژگان کے ساتھ سلاد کی کٹنگ میں مصروف تھا۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ زبان بھی چل رہی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں کئی بار مژگان کی برملا تعریف کر چکا تھا یہ اور بات ہے کہ ہر بار مژگان کے اس خوب صورت لک کا کریڈٹ اس نے خود کو ہی دیا تھا۔ اس وقت تک جبران کے رشتہ دار نہیں آئے تھے۔ صرف وہ، فرخندہ جہاں اور حورعین ہی موجود تھے۔
"میرا خیال ہے اب رائتہ اور سلاد کی ڈریسنگ آپ کر لیجئے گا۔ میں جا کر ذرا آپ کی دوست کا حال احوال پوچھ لوں۔ آخر کو وہ میری وجہ سے ہی تو آئی ہیں۔" جبران نے کٹنگ بورڈ سائیڈ پر رکھتے ہوئے ترچھی نظروں سے مژگان کو دیکھا تھا۔
"اوکے۔ میں کر لوں گی۔" دہی پھینٹتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک لمحہ کے لیے رکا تھا۔ مگر وہ پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھی۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یوں جبران کا اس کے پاس کھڑا ہونا اور اس کا ہاتھ بٹانا۔ مگر وہ اسے روک بھی تو نہیں سکتی تھی آخر جبران سے حورعین کی بات خود اس نے ہی تو کی تھی۔
"اگر آپ نہیں چاہتیں تو میں یہیں رہتا ہوں۔ آپ کے پاس۔" جبران ابھی بھی اسے دیکھ رہا تھا۔
"ایسا میں نے کب کہا؟" وہ گڑبڑا گئی تھی۔ یہ شخص ہر بار جانے نہیں کیوں اس کا چہرہ پڑھ لیتا تھا۔
مژگان نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔ جبران مسکراتا ہوا پاس سے گزر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ جیسے ہینڈسم بندے کی مژگان سے دوستی کیسے ہو گئی؟" حورعین نے اپنے چمک دار بالوں کو جھٹکتے ہوئے ادا سے جبران سے پوچھا تھا۔
"اچھا تو کیا ہینڈسم بندے ان سے دوستی نہیں کرتے۔" جبران نے مصنوعی حیرانی سے اپنی آنکھیں پھیلائی تھیں۔
"دوستی تو بہت دور کی بات ہے تو کوئی ہینڈسم شخص گھاس بھی نہیں ڈالتا۔" حورعین نے نخوت سے کہا تھا۔
"کیا وہ گھاس کھاتی ہیں۔ اوہ مجھے تو یہ بات پتا ہی نہیں ہے۔ امی نے تو باربی کیو کا انتظام کیا ہے آج۔" جبران کا مسخرہ پن عروج پر تھا پر لہجے میں ہلکا سا افسوس بھی تھا۔
"ویسے کسی ہینڈسم شخص نے آپ کو گھاس ڈالی۔ مائنڈ نہ کیجیے گا۔ یونہی پوچھ رہا ہوں۔" جبران نے کسی رازدار سہیلی کی طرح ٹوہ لی۔
"ارے لوگ تو میرے پیچھے پاگل ہیں۔" حورعین نے فخریہ کہا۔
"اوہ۔ پھر تو لوگوں کی مائیں آپ کو پتھر مارتی ہوں گی۔ جانے کتنے لڑکوں کو آپ نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔" جبران کے پاس ہر بات کے آگے ایک الٹا جواب تھا۔
"آپ کیا ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں؟" حورعین کسی قدر چڑ گئی تھی۔ وہ اس انداز کی عادی نہ تھی۔ آج تک اسے لڑکوں کی طرف سے پروٹوکول پلیٹ میں رکھ کر ملا تھا۔
"ارے جناب۔ ہم باتوں کا ہی تو کھاتے ہیں۔ آخر ایڈورٹائزنگ کے بندے ہیں۔" جبران نے تفاخر سے کہا تھا۔ "چلیں چھوڑیں یہ سوال جواب۔ میں آپ کو گٹار پر اپنی فیورٹ دھن سناتا ہوں۔"

جبران اسے ساتھ لیے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر سلاد کی ٹرے اور رائتے کے پیالے رکھتے ہوئے مژگان نے کن انکھیوں سے دونوں کو جاتے دیکھا۔ حورعین کا تفاخر واپس لوٹ آیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں جبران خاور اسے اپنے بیڈ روم میں لے گیا تھا۔ یہ اعزاز تو اب تک مژگان کے حصے میں بھی نہ آیا تھا۔ مژگان کا دل افسردگی سے بھر گیا۔ جبران کے گھر آنے کا سارا جوش و خروش جیسے ماند پڑ گیا تھا۔ مگر یہ تو ہونا ہی تھا۔ جبران کی زندگی میں کوئی بھی لڑکی آتی۔ مژگان کی گنجائش تو تب بھی نہ نکلتی پھر اگر اس کی اپنی ہی دوست ہو تو کیا مضائقہ تھا' وہ دل کو سمجھاتی فہمیدہ آنٹی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سوری۔ آج میں پھر آدھا گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔" پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جبران اس کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔ لگتا تھا' دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ گھر سے پارک تک بھی دوڑتا ہوا آیا تھا۔

"یار! کیا کروں۔ رات کافی دیر تک حورعین سے نیٹ چیٹنگ ہوتی رہی۔ پھر آفس کا بھی کچھ کام کرنا تھا۔ سوتے سوتے تین بج گئے۔ بہت مشکل سے آدھا گھنٹہ پہلے آنکھ کھلی۔"

"اوکے۔" مژگان نے مختصراً" کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

کتنا مشکل تھا جبران کے منہ سے حورعین کا ذکر سننا۔ وہ خود اپنے احساسات سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تمہیں حورعین اچھی لگی؟" کوئی بات تو کرنی ہی تھی۔

"ہاں اچھی ہے۔ مگر کچھ براوڈ ہے۔ وہ تو پہلی ہی ملاقات میں کافی فرینک ہو گئی تھی۔ پروموشن پارٹی میں ہی اس نے مجھے اپنا سیل نمبر دے دیا تھا۔ نو ڈاؤٹ شی از ویری بیوٹی فل۔ اور باتیں کرنا بھی خوب جانتی ہے۔"

وہ کہتے ہوئے اپنی رفتار پکڑ چکا تھا۔ مژگان کا پہلی بار دل چاہا کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ مگر اسے جبران کا ساتھ دینا ہی تھا کہ زندگی میں کچھ لوگ واقعی ایسے ہوتے ہیں جن سے ہم اپنائیت سے زیادہ عزت کا رشتہ نبھاتے ہیں اور جبران سے اس کا ایسا ہی رشتہ تھا۔ روشنی میں ساتھ دینے والے اکثر ہماری یادداشت سے محو ہو جاتے ہیں۔ مگر اندھیرے میں راستہ دکھلانے والا زندگی بھر کے لیے ہمارا محسن بن جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"دس قطرے صبح۔ دس قطرے شام۔
ایک پھکی دو نہار منہ' ایک پھکی رات کے کھانے کے بعد۔
ابلا ہوا کھانا اور گرم پانی۔ تم خود ہی بتاؤ رومیو! یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ میری عمر کی لڑکیاں تو پزا' آؤٹ لیٹ' آئس کریم پارلر اور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ انجوائے کرتی ہیں۔ نت نئے ڈیزائنر لباس خریدتی ہیں۔ وہ ہر روز نئے انداز سے آئینے کے سامنے آتی ہیں اور آئینہ ہر روز انہیں سراہتا ہے۔"

مژگان کے سامنے تین' چار چھوٹی شیشے کی بوتلوں اور پڑیوں کا ڈھیر تھا۔ وہ ایک چوتھائی پانی لیے ایک چھوٹی بوتل سے دس قطرے گن کر پانی میں ڈراپر ٹپکاتے ہوئے رومیو کے سامنے بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ وہ آج پھر قنوطیت کا شکار تھی۔ جبران دو دن سے صبح جاگنگ کے لیے پارک میں نہ آیا تھا اور اب بھی اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔

"اف تم یہاں ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں تلاش کر آئی۔" حورعین ہانپتی کانپتی دو بڑے شاپرز سنبھالتی ہوئی ٹیرس پر چلی آئی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی مژگان نے اپنی ساری دوائیں بڑے سے گملے کے پیچھے چھپا دیں۔

"اوہ۔۔۔" بہت تھک گئی۔ مگر بہت مزا آیا۔ شاپنگ' آؤٹنگ اور پھر واپسی میں آئس کریم پارلر۔ جبران از سو انرجیٹک' واپسی میں بھی اتنا ہی تازہ دم تھا جتنا کہ میرے ساتھ شاپنگ پر جاتے وقت تھا اور اس کی چوائس بہت زبردست۔ دیکھو' میں نے کیا کچھ لیا ہے۔" حورعین بولتے ہوئے شاپرز کو کھولنے لگی اور منٹوں میں مژگان کے سامنے اپنی شاپنگ کا ڈھیر لگا دیا۔

ایمبرائیڈڈ پلازو' ڈینم' ریڈی میڈ کرتیاں' میچنگ جیولری اور برانڈڈ پرفیوم' مژگان کی آنکھوں میں یہ سب دیکھ کر بے چینی سی اتر آئی تھی۔ وہ جبران کو یاد کر رہی تھی اور جبران' حورعین کے ساتھ اپنی شام انجوائے کر رہا تھا۔ اس کی نظریں ایک ایک چیز پر سے ہوتی ہوئی حورعین پر ٹھہر گئی تھیں۔ خوب صورتی ہر جگہ بازی لے جاتی ہے۔ شاید قسمت پر بھی۔

"ہیلو۔ کہاں گم ہو۔ دیکھو نا یہ سب۔" حورعین نے اسے آواز دی تو وہ چونک سی گئی۔ "ہے نا جبران کی چوائس زبردست۔ مگر ہے بڑا کنجوس۔۔۔ ہر چیز پر انگلی رکھ کر ہٹ گیا۔ دلایا کچھ نہیں۔ بہت مشکل سے پزا اور آئس کریم کے پیسے نکلوائے اس سے۔" حورعین نے ناک چڑھائی۔

"مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تمہارے لیے بھی کچھ لے لوں۔ اب میں بھلا تمہارے لیے کیا لیتی۔" "نہ تو تمہیں ان سب چیزوں کا کوئی سینس ہے اور تمہارا تو سائز بھی مشکل سے۔۔۔ ہی ملتا ہے۔"

"تم تو کچھ بول ہی نہیں رہیں۔ لگتا ہے مسمرائز ہو گئی ہو یہ سب دیکھ کر' اچھا میں جا رہی ہوں۔ جبران کی گاڑی سے اتر کر سیدھی یہیں چلی آئی تھی۔"

حورعین اپنی چیزیں سمیٹ کر جیسے آندھی طوفان کی طرح آئی تھی۔ ویسے ہی واپس چلی گئی۔ مژگان نے اسے نیچے جاتے دیکھا۔ پھر نہ جانے اس کے جی کو کیا ہوا۔ اس نے دواؤں کا شاپر اٹھایا اور پنجرے کے پاس رکھے ڈسٹ بن میں پھینک کر وہیں' گھٹنوں میں گھیرے رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

جس خلوص سے مژگان نے حورعین کا نام جبران کے سامنے لیا تھا۔ وہ خلوص اور نیک نیتی آج بھی برقرار تھی۔ مگر جبران کے لیے اس کی لگن ہر روز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

وہ روز صبح اٹھتی' جاگرز کے تسمے باندھتی' شال اوڑھتی اور پارک کے راستے کی طرف چل پڑتی۔ کبھی جبران دس منٹ لیٹ آتا' کبھی آدھا گھنٹہ اور کبھی آتا ہی نہ۔ بس اس کا معذرت کا مسیج آ جاتا۔

مژگان نے بھی پھر آہستہ آہستہ پارک جانا کم کر دیا اور اگر کسی دن چلی ہی جاتی تو اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ ابھی جبران کسی درخت کے پیچھے سے نمودار ہو گا اور اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر منہ سے لگا لے گا۔ پھر جینز کی جیبوں میں انگوٹھے پھنسا کر اپنے مخصوص انداز میں سنجیدہ سی شکل بنا کر اس سے مذاق کرے گا اور پھر اس کا ہاتھ کھینچ کر جاگنگ ٹریک پر لے آئے گا کہ "چلو بھاگو جب تک کہ تھک نہ جاؤ۔" اور جب وہ کسی بات پر منہ بسورے گی تو ہلکے سے اس کی ناک دبا کر کوئی شوخ سا جملہ کہہ دے گا اور پھر دیر تلک ہنستا رہے گا۔ جبران کا الوژن' مژگان کے آس پاس چکرانے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

دو مہینے کی رفاقت کو ایک ہفتے میں بھلا دینا۔ مژگان کے لیے آسان نہ تھا۔ پھر یوں اپنا رد کیا جانا بھی اسے اچھا نہ لگ رہا تھا۔

"شاید میں نے جبران کو حورعین سے ملا کر اچھا نہیں کیا۔ حورعین سے دوستی نبھاتے نبھاتے میں نے جبران جیسا دوست بھی کھو دیا۔" وہ یاسیت سے سوچتی۔

"مگر کیا دوستی کی بھی کوئی میعاد ہوتی ہے؟ یا پھر انسان ایک شخص سے رشتے نبھاتے ہوئے باقی رشتے بھول جاتا ہے؟" آئینے میں اپنا آپ دیکھتے ہوئے وہ عجیب سی سوچوں کا شکار تھی۔ جبران اسے اگنور کر رہا تھا۔ وہ کتنے ہی مسیج کرتی' جبران اسے جواب نہ دیتا۔ کال ملاتی تو دوسری جانب سے کال کٹ

جاتی یا بزی جارہا ہوتا اور کچھ دیر بعد جبران کا میسج آجاتا۔ "آئی ایم بزی" اور جب وہ حورعین سے بات کرتی تو حورعین "جبران نامہ" شروع کردیتی۔ جبران نے یہ کہا۔ جبران نے وہ کہا۔ جبران نے میری تعریف کی، وغیرہ وغیرہ۔

مژگان کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر غلط کیا ہو رہا ہے۔ حورعین کا ہر بار یہ جتانا کہ جبران، مژگان کو نہیں، حورعین کو اہمیت دیتا ہے یا جبران کا یہ ظاہر کرنا کہ دوستی کی بھی کوئی مدت ہوتی ہے اور اب وقت پورا ہوچکا۔

آج آخری بار جبران سے بات کروں گی، پھر نہیں۔

وہ دوپٹا سلیقے سے شانوں پر پھیلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ فرخندہ جہاں، فہمیدہ کے گھر جارہی تھیں اور مژگان ان کے ساتھ جارہی تھی۔ جبران نے اس کو زندگی سے محبت کرنا سکھائی تھی۔ اس کی سوچ بدلی تھی۔ اس کے ظاہر میں تبدیلی کی تھی۔ وہ خود کو مژگان کا استاد اور دوست کہتا تھا۔ اب ایک جھٹکے میں وہ یہ دونوں رشتے کیسے توڑ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼
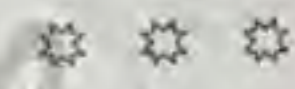
"جبران کے جانے سے میں تو بولائی بولائی پھر رہی ہوں۔ پروموشن کیا ہوئی اس کی۔ لگتا ہے ساری ذمہ داریاں اس پر ہی آگئیں۔ ایک ہفتے سے کراچی سے باہر گیا ہوا ہے۔ دو دن اسلام آباد میں کام تھا۔ اب چار دن سے لاہور میں ہے۔

میں نے تو چڑ کر کہا، بیٹا وہاں جاکر تو تم مجھے بھول ہی گئے ہو۔ ڈھنگ سے ایک گھنٹہ بھی بات نہیں ہوتی تو کہنے لگا، امی۔ یہاں اتنا کام ہے۔ کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ اور ایڈ کمپین کا کام اتنا ہے کہ کسی سے بات کرنا تو دور کی بات کھانا بھی وقت پر کھالوں تو بہت ہے۔"

فہمیدہ، فرخندہ جہاں اور مژگان سے اپنے دل کا حال کہہ رہی تھیں۔ وہ جبران کی کمی کو بہت محسوس کررہی تھیں اور مژگان خود پر حیران تھی کہ وہ اتنی بے خبر تھی کہ اسے جبران کے کراچی میں ناموجود ہونے کی خبر تک نہ ہوسکی۔ اور اگر جبران کے پاس، آنٹی سے بھی بات کرنے کا وقت نہیں۔ تو پھر حورعین جو کچھ کہ رہی ہے۔ وہ کیا ہے؟ فہمیدہ آنٹی آگے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ مگر مژگان کی دلچسپی اب وہاں بیٹھنے میں ختم ہوچکی تھی۔

"بہت برے ہو تم۔ انسان میں اتنی اخلاقیات تو ہونی چاہیے کہ وہ جانے سے پہلے ایک بار انفارم تو کردے۔ میں نے بھی آج سوچ لیا تھا کہ ہر حال میں تم سے بات کروں گی۔"

جبران کے فون ریسیو کرتے ہی مژگان اس پر الٹ پڑی تھی۔ اس نے کوئی آٹھ بار کال ملائی تھی اور پانچ بار کال ریسیو نہ ہوئی تھی۔ چھٹی بار جبران نے لائن منقطع کردی تھی۔ ساتویں بار کال بزی جارہی تھی۔ آخر آٹھویں بار جبران نے پک کرہی لی تھی اور مژگان کے غصے کے جواب میں اب وہ صرف ہنسے جارہا تھا۔

"ایک ہفتے میں ہی آپ میری ساری باتیں بھول گئیں؟"

"میں نے آپ سے کہا تھا ناکہ ہر بار جواب وہ نہیں ہوتا، جو ہم چاہتے ہیں، تب ہمیں حیرت سے زندگی کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ وارم اپ پوزیشن میں رہنا چاہیے۔ اور ویسے بھی میں کسی کا اداس چہرہ نہیں دیکھ سکتا اور مجھے پتا تھا کہ جب آپ مجھے ایئرپورٹ پر سی آف کرنے آئیں گی تو لازمی آپ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ہوں گے۔"

"جی نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" مژگان چڑ گئی تھی۔

"ایسا ہی ہوتا، کیونکہ یہ ناراضی اور غصہ بتارہا ہے، مژگان عثمان جعفری نے مجھے کتنا مس کیا ہے۔" وہ اتنی دور بیٹھ کر بھی اس کے اندر جھانک رہا تھا۔ مژگان نے کچھ نہ کہا۔ چپ ہی رہی۔

"ہنسنے میں تو آپ کنجوسی کرتی ہی ہیں۔ اظہار میں بھی کافی کنجوس ہیں۔" اس کے چپ رہنے پر جبران نے مزید کہا تھا۔

"انی وے۔ جسٹ ٹو ویک پھر جبران خاور پھر سے آپ کے ساتھ جاگنگ ٹریک پر ہوگا۔ مگر میری غیر موجودگی میں بھی آپ کو حرکت میں رہنا ہوگا، کوئی ساتھ ہو یا نہ ہو، چلتے رہنا ہی زندگی ہے۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر اتنے ہی لاہور میں بزی ہو تو حورعین سے بات کرنے کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہو۔ مگر وہ یہ بات پوچھ کر خود کو ہلکا نہیں کرنا چاہتی تھی کہ حورعین اور جبران کے تعلق سے اسے جلن ہو رہی ہے۔ سو خاموشی سے فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

"اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تمہیں ابھی فون ہی کرنے والی تھی۔" حورعین نے اسے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً ہی کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ ابھی شاپنگ پر چلنا ہے۔" حورعین نے مژگان کے ہاتھ سے ڈی وی ڈی لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی۔ ابھی میں کیسے جاسکتی ہوں۔ ابھی تو میں جم جانے کے لیے نکلی تھی۔ یہ تمہاری ڈی وی ڈی دینے آئی تھی۔ جو تم نے منگوائی تھیں۔" مژگان نے جانے سے انکار کرنا چاہا۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ جبران نے آج اسے پارک بلایا ہے۔ کل ہی وہ لاہور سے واپس آیا تھا۔ وہ مژگان سے کوئی بات کہنا چاہتا تھا۔ حورعین کے ساتھ شاپنگ پر جاکر وہ ان خوب صورت لمحوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ایک دن جم نہیں جاؤ گی تو کچھ ہو نہیں جائے گا، میرا شاپنگ پر جانا زیادہ ضروری ہے، آخر میری منگنی ہے اس اتوار کو۔" حورعین کے اس جملے نے مژگان کو حیران کردیا تھا۔ لفظ منگنی کے ذکر پر اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ کیا یہی وہ بات تھی، جو جبران خاور اس سے کرنا چاہتا تھا۔

"تمہاری منگنی۔ اتنی اچانک۔ مگر جبران تو آج کل لاہور سے آیا ہے۔" مژگان کی کچھ سمجھ نہ آرہا تھا۔ تین دن پہلے ہی اس کی حورعین سے بات ہوئی تھی۔ تب تو اس نے ایسا کچھ بھی نہ بتایا تھا اور اب آج اچانک وہ اس سے یہ کہہ رہی تھی کہ دو دن بعد اس کی منگنی ہے۔

"ہاں۔ میں اسے بھی انوائیٹ کرلوں گی۔ مگر فی الحال تم تو چلو، پھر آٹھ بجے فیصل کا فون آجائے گا۔ اچانک تو واقعی یہ سب کچھ ہوا ہے۔ مگر خیر آئی ایم سو ہیپی۔" حورعین بہت خوش تھی۔

"فیصل۔ کون۔ فیصل؟" آج شاید مژگان کے لیے حیرت کا دن تھا۔

"ارے بھئی فیصل۔ جس سے میری منگنی ہو رہی ہے۔" حورعین نے اب کی بار ذرا سا جھنجلا کر کہا تھا۔

"تم ایسا کیسے کرسکتی ہو حورعین! تم تو جبران سے۔" افسوس کے مارے وہ جملہ ادھورا چھوڑ گئی تھی۔

"سو واٹ؟ تمہیں کیا لگا۔ میں جبران سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میں اتنی احمق نہیں ہوں۔" حورعین نے مضحکہ خیز انداز میں اس کی بات اڑائی تھی۔

"مگر جبران۔ وہ تو تم سے محبت کرتا ہے نا۔" مژگان ابھی بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

"جبران جیسے کتنی لڑکے میرے منتظر ہیں، تو کیا میں سب سے شادی کرلوں؟ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور میرے لیے فیصل ہی بہتر ہے۔" مژگان اپنی جگہ ششدر تھی اور حورعین کہتی جارہی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے، وہ بہت ہینڈسم اور اسمارٹ ہے۔ اس کی جاب بھی کافی اچھی ہے۔ مگر اس سب کے باوجود وہ ابھی بھی اسٹرگلنگ پیریڈ میں ہے۔ وہ تو شاپنگ پر جانے سے پہلے بھی اپنی جیب دیکھتا ہے۔" حورعین کی بات پر مژگان کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ جب جبران اسے بیوٹی سیلون سے آہٹکس اور پھر بوتیک لے کر گیا تھا۔

"مجھے اس سے کبھی بھی محبت نہیں ہوئی۔ میں نے تو اتنی دیر صرف اس لیے لگائی کیونکہ میں یہ فیصلہ کرنے میں ہچکچا رہی تھی کہ میرے لیے کون بہتر ہے۔

جبران یا پھر فیصل۔۔۔ جس طرح کی شاہانہ زندگی میں چاہتی ہوں نا مژگان! وہ صرف مجھے فیصل ہی دے سکتا ہے۔ جبران نہیں۔"

حورعین، مژگان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ کہتی جارہی تھی۔

"جبران اپنی امی کا بہت فرماں بردار ہے۔ وہ اپنی ماں سے کبھی آگے نہیں نکل سکتا اور مجھے ایسا شوہر نہیں چاہیے۔ فیصل کا انتخاب میں نے اسی لیے کیا ہے۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ان کے گھر میں کسی عورت کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس کی زندگی اور اس کے گھر میں صرف میرا راج ہوگا اور یہی میں چاہتی ہوں۔" مژگان نے آخری جملے کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا۔ مگر مژگان کی سماعت اب جواب دے چکی تھی۔ وہ زور سے چیخ پڑی تھی۔

"چپ کر جاؤ حورعین! خدا کے لیے بس کر جاؤ اور کتنا گروگی؟"

"تم جبران کے ساتھ ہر جگہ گھومتی رہیں۔ اس کے ساتھ وقت گزارتی رہیں۔ جبران ایسا ہے۔ جبران ویسا ہے۔ تعریفیں کرکے میرا دماغ کھا گئیں اور جب وہ صرف دو ہفتوں کے لیے لاہور گیا تو تم نے کسی اور کو منتخب کرلیا۔ شرم آتی ہے مجھے کہ تم میری دوست ہو۔" بولتے ہوئے مژگان کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا اور اس کی آواز بھرا گئی۔

"یو اسٹاپ مژگان! تمہیں اتنا ایموشنل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں مجھے اپنا دوست سمجھتے ہوئے شرم آتی ہے تو تم یہاں سے جاسکتی ہو۔ یہ میری زندگی ہے اور میں اپنے فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہوں۔

ویسے بھی تمہاری ساری جیلسی اس لیے ہے کہ جبران ہو یا فیصل۔ ہر شخص مجھ پر مرتا ہے۔ تمہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے۔" حورعین کی زبان زہر اگلتی جارہی تھی۔

مژگان کے آنسو گالوں پر بہتے جارہے تھے اور مزید سننے کی سکت نہ تھی۔ وہ تیزی سے حورعین کے گھر سے نکل آئی۔ مگر حورعین کے الفاظ گویا اس سے چپٹ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼
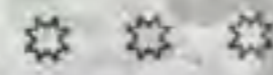
"میں تو سمجھا تھا آپ میری سنگت میں برے وقت کو لیٹ اِٹ گو کرنا سیکھ گئی ہوں گی۔ مگر آپ کا یہاں چپ چاپ آکر بیٹھ جانا اور رونا یہ بتا رہا ہے کہ آپ نے کچھ بھی نہیں سیکھا۔"

پارک میں اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھی روتی ہوئی مژگان نے سر اٹھا کر اپنے برابر میں بیٹھے جبران کو دیکھا تھا۔ چار مہینے پہلے بھی کچھ ایسا ہی منظر تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں اس کے سامنے جوڑے روئے جارہی تھی۔

"مجھے معاف کردو جبران! پلیز مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"ارے۔۔۔ یہ کیا کررہی ہیں آپ۔" جبران نے بے ساختہ اس کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے ہی تم سے کہا تھا کہ حورعین سے شادی کرلو۔ وہ تمہارے لیے اچھی لڑکی ہے۔ میں غلط تھی۔ میں نے ہی تمہارے سامنے حورعین کا نام لے کر اسے ہمیشہ اچھا ثابت کیا۔ جبکہ میں اس کے مزاج کے سارے موسموں سے واقف تھی۔ پھر بھی۔۔۔"

"دوست وہی جو وقت پر کام آئے۔ آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔" جبران ابھی بھی اس کے ہاتھوں کو تھامے تسلی دے رہا تھا۔

"مگر تمہارا دل تو ٹوٹ گیا نا۔ حورعین کو تم سے اچھا کوئی شخص مل گیا تو اس نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی۔" وہ ابھی بھی سسکیاں لے رہی تھی۔

"کس نے کہا کہ میرا دل ٹوٹا۔ میرا دل تو میرے پاس

ی ہے۔" وہ ہلکے سے ہنس پڑا۔

"مجھے پتا ہے۔ تم مذاق میں میری ہر بات اڑا رہے ہو۔ مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ حورعین کی اس حرکت نے تمہیں بہت ڈس ہارٹ کیا ہے اور یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میری بات سنیں مژگان! میں واقعی ڈس ہارٹ نہیں ہوں۔ کیونکہ میں حورعین سے نہ تو پہلے محبت کرتا تھا اور نہ ہی اب کرتا ہوں۔"

"خوب صورت نظر آنا اہم نہیں ہوتا۔ خوب صورت ہونا اہم ہوتا ہے۔ حورعین بے شک خوب صورت نظر آتی تھی۔ مگر اس کا دل آپ کی طرح بے ریا اور شفاف نہیں تھا۔ وہ صرف آپ کی ایک نادان دوست تھی۔" وہ دھیرے دھیرے اپنے مخصوص انداز میں کہتا جارہا تھا۔ مژگان رونا بھول کر جبران کو دیکھے گئی۔

"میری اور اس کی ملاقاتوں کو دو مہینے ہوئے ہیں اور وہ دو مہینوں میں مجھے صرف جج کرتی رہی ہے اور جو لوگ آپ کو جج کرتے ہیں۔ وہ آپ کو اچھے تو بے شک لگ سکتے ہیں۔ مگر آپ ان سے محبت نہیں کرسکتے۔"

"اس کے پاس چوائسز تھیں۔ میں یا فیصل۔ کون اسے زندگی کی زیادہ مراعات دے سکتا ہے۔ وہ دو مہینوں تک اسی حساب کتاب میں مصروف رہی تھی۔"

"جب تم شروع دن سے ہی یہ سب جان گئے تھے اس کی طرف بڑھے کیوں۔ تمہارا مجھے اور آنٹی کو اگنور کرنا۔۔۔ اور ہر وقت حورعین سے رابطے میں رہنا۔۔۔ وہ سب کیا تھا؟" مژگان حیران تھی۔

"صرف آپ پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا اور حورعین آپ کی دوست نہیں۔ وہ آپ کو خود سے کمتر ثابت کرکے ہمیشہ خوش ہوتی تھی۔"

"اگر تم۔۔۔ حورعین سے محبت نہیں کرتے۔۔۔ تو پھر

کس سے کرتے ہو؟" مژگان نے رک رک کر یہ بات کہی۔

"اگر آپ نے کبھی میری آنکھیں غور سے دیکھی ہوتیں تو آپ کو اپنے اس سوال کا جواب، بہت پہلے مل جاتا۔" جبران نے اپنی آنکھیں مژگان کے چہرے پر جما دیں۔

"میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ جسے میں ہمیشہ عزت سے آپ کہہ کر بلاتا ہوں۔"

"جبران۔۔۔" مژگان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ گڑبڑا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"جبران کے بچے۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے ایسا مذاق بالکل پسند نہیں۔" مژگان نے جھینپتے ہوئے ڈپٹنے کے انداز میں کہا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں نم ہو رہی تھیں اور وہ اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھائے ہوئے تھی۔ اس کی زندگی میں بھی کبھی ایسا وقت آسکتا ہے، یہ ناممکن تھا۔

"جبران کے بچے بھی آجائیں گے۔ پہلے مس مژگان جعفری تو ہامی بھریں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"ویسے مجھے آپ کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ آپ کی بے ریا آنکھیں سب کہہ جاتی ہیں۔ پھر بھی پوچھ ہی لیتا ہوں۔ ول یو میری می (مجھ سے شادی کریں گی)۔" وہ اس کے کان کے قریب آکر رازداری سے پوچھنے لگا۔

"مجھے نہیں پتا، پیچھے ہٹو۔" وہ اسے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ پسلیاں توڑ کر ابھی باہر آجائے گا اور بھنگڑا ڈالنا شروع کردے گا۔

"اچھا چلو۔ یہ تو بتاؤ کہ جبران کے بچوں کا نام تو Rhyming ہی ہوگا نا۔" جبران نے پیچھے سے شرارت سے آواز لگائی۔

"حمدان، فیضان۔۔۔ ارمغان، رمضان۔" وہ نام لے جارہا تھا۔

"کیا مطلب کیا سارے لڑکے ہی ہوں گے؟ مجھے تو لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔" وہ روانی میں کہتی خود کو آشکار کرگئی تھی۔ جواب میں جبران نے زوردار قہقہہ لگایا تھا اور مژگان نے جھینپ کر ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔

"مجھے بھی لڑکیاں ہی پسند ہیں۔ بالکل تمہارے جیسی۔" جبران آپس کا فاصلہ مٹا کر پھر سے قریب آگیا تھا۔ مژگان نے نم آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ جبران کے خوب صورت چہرے کو دیکھا۔

"تھینک یو جبران۔۔۔ اگر تم مجھے نہ ملتے تو میں کبھی یہ بات نہ جان پاتی کہ خوب صورت زندگی کا راز صرف محبت ہے۔"

"اونہوں۔۔۔ اب اور نہیں رونا۔" جبران نے اس کے گال پر ڈھلک آنے والے آنسو کو سمیٹا اور محبت سے اس کی ناک دبائی۔

"تھینکس مجھے نہیں، اللہ میاں کو کہیں۔ جس نے پہلے آپ کو موٹا کیا۔ پھر یہ خوب صورت پارک تخلیق کیا اور پھر مجھے آپ سے ملایا۔"

اس کے ساتھ چلتے ہوئے جبران نے مژگان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ جبران کا انداز شگفتگی لیے ہوئے تھا۔ مژگان کی بے ریا شفاف ہنسی چاروں طرف پھیلتی جارہی تھی۔ آج وہ اپنے اندر کے احساس کمتری سے مکمل طور پر آزاد ہوگئی تھی۔

☆

عارفہ ربابہ

زندگی کے نرالے کھیل

"امی! آپ آغا جی کو بتا دیجیے گا، مجھے ان کا فیصلہ منظور نہیں۔ میں کسی بھی قیمت پر ثمن سے منگنی نہیں کروں گا۔ پتا نہیں کیوں وہ ہم پہ اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتے ہیں۔"

ابرار یہ خبر سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور دو ٹوک انداز میں انکار کر دیا۔

"یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو ابرار! تم جانتے تو ہو آغا جی کے فیصلے۔" صالحہ بیگم ایک دم پریشان ہو کر بولنے لگی تھیں کہ اس نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ہاں میں جانتا ہوں، آغا جی کے فیصلے پتھر پہ لکیر ہوتے ہیں۔ ایک انچ نہیں ہل سکتے۔ ان کے غلط فیصلوں کی وجہ سے ہی کئی لوگ برباد ہو گئے۔ زیب بھائی ابھی تک کنوارے بیٹھے ہیں۔ شہلا آپی سمجھوتے کی زندگی گزار رہی ہیں۔ حماد برطانیہ میں رہائش رکھنے پر مجبور ہوا۔ علی حاشر گھر چھوڑ کر چلا گیا اور اب میں اور ثمن، اُف امی! اس پہ انہیں خوش فہمی ہے کہ ان کے فیصلے بہترین اور سب کے بھلے کے لیے ہوتے ہیں مگر میں بھی ان ہی کا پوتا ہوں۔ مجھے ان کا یہ فیصلہ ہرگز منظور نہیں۔"

وہ یک دم غصے میں جو منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔

مکمل ناول

"ابرار! تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا اول فول بک رہے ہو اور خدانخواستہ آغا جی کے فیصلے کیوں غلط ہونے لگے۔ یہ تمہارے دماغ کا خناس ہیں، ورنہ سب اپنی اپنی جگہ ایک بہترین زندگی گزار رہے ہیں۔ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ کسی بڑے کے بارے میں اس طرح بات کرتے ہیں؟ کوئی سنے تو کیا سوچے گا تمہارے بارے میں۔" وہ اس کی الٹی سیدھی باتیں سن کر برہم ہو گئیں۔

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے کہ سب خوش ہیں۔ سب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خلا موجود ہے۔ بہر حال ابھی اس بحث کو چھوڑ دیں۔ بس اتنا سن لیں کہ مجھے ثمن سے منگنی نہیں کرنی۔" وہ اٹل انداز میں بولا۔

"بیٹا! اگر تم یہ آغا جی کی ضد کی وجہ سے کہہ رہے ہو تو غلط کر رہے ہو۔ ثمن واقعی بہت اچھی، سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ مجھے بھی وہ بہت پسند ہے۔ تم غور تو کرو۔" وہ اسے قائل کرنے والے انداز میں بولیں۔

"میں جانتا ہوں اور مانتا بھی ہوں۔ بلاشبہ ثمن بہت اچھی لڑکی ہے مگر۔۔۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔" وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

"آغا جی نے ہمیں بہت زیادہ مجبور نہیں کیا، بس ایک رائے لی ہے۔ ثمن کے دو رشتے آئے ہوئے ہیں۔ ایک انجینئر اور دوسرا کالج میں پڑھاتا ہے۔ انجینئر کا رشتہ تو آغا جی کو بہت پسند آیا ہے۔ انہوں نے کہا اگر ہم ثمن کے لیے سوال نہیں کریں گے تو وہ انجینئر کو ہاں کہہ دیں گے، اس لیے میں تم سے۔۔۔" انہوں نے تفصیل بتا کر بہت آس سے اسے دیکھا مگر وہ ثمن کے رشتے کا سن کر چونک گیا تھا۔

"ثمن کے دو پروپوزل آئے ہوئے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں۔۔۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں، تمہاری فضول ضد کی وجہ سے اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔" انہوں نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی اور اسے اکسایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"پھر کیا فیصلہ ہے تمہارا۔" انہوں نے اسے سوچتا دیکھ کر پھر پوچھا۔

"فی الحال تو آپ مجھے سوچنے کا وقت دیں۔ میں کل تک بتا دوں گا۔" اس نے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر انہیں تو ٹالا۔

"آج کل کے لڑکوں کی تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ اس کے ٹال مٹول کرنے پہ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔

———— کچھ دیر تک تو وہ کمرے میں ٹہلتا رہا، پھر کچھ سوچ کر علی حاشر کا نمبر ملانے لگا۔

"ہاں بھئی، کہاں غائب ہو۔" سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔

"یہیں ہوں کینیڈا میں اور۔۔۔ مجھے کہاں جانا ہے۔" علی حاشر کی خوش گوار سی آواز آئی۔

"ہاں، تمہیں توفیق نہیں ہوتی فون کر کے خیریت پوچھ لو، یہاں ہم زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔" ابرار نے شکوہ کیا۔

"ارے نہیں یار! بس یہاں کچھ ٹف روٹین شروع ہو گئی ہے تو بس۔۔۔ خیر۔۔۔ تم سناؤ، سب خیریت تو ہے نا وہاں۔" وہ شرمندہ ہو کر وضاحت کرنے لگا۔

"سب خیریت ہی ہے، بس ایک خبر سنانی تھی تمہیں۔" ابرار نے تجسس پھیلایا۔

"کیسی خبر؟" وہ چونکا۔

"ثمن کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔" ابرار نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ دوسری طرف ایک لمحہ کو خاموشی چھا گئی۔

"پھر۔۔۔؟ اس خبر سے میرا کیا تعلق؟" حاشر کچھ سنبھل کر بولا۔

"او اچھا۔۔۔ یعنی میں نے فضول ہی کال ضائع کی۔" اس کے انداز میں تاسف گھر آیا۔ "چلو خیر، تمہاری خیریت تو مل گئی۔ اب میں فون بند کرتا ہوں۔"

"ایک منٹ ابرار۔۔۔!" وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"کیا ہوا؟" وہ انجان بن کر بولا مگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

"کیا واقعی ثمن کا رشتہ طے ہو رہا ہے؟" وہ کچھ جھجک کر بولا۔

"نہیں تو تمہارا خیال ہے اتنی دور سے میں نے مذاق کرنے کے لیے تمہیں فون کیا ہے۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"میرا مطلب ہے، تمہیں کیسے پتا کہ میں۔۔۔ آئی مین۔۔۔"

"کہ تم ثمن میں انوالو ہو۔" ابرار نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

"تو محترم! میں دو عدد آنکھوں کے ساتھ ایک عدد دماغ بھی رکھتا ہوں اور تمہاری طرح غدار بھی نہیں کہ دوستوں سے دل کی بات چھپاؤں۔ دیکھ لو! تمہیں بروقت اطلاع کر دی، ورنہ بیٹھے رہتے لکیر پیٹتے۔" اس نے چڑ کر کہا۔ اسے زیب بھائی یاد آ گئے تھے، وہ بھی یوں دل کی بات دل میں رکھنے کے چکر میں مارے گئے تھے۔

"سوری یار! ابھی تو میں خود اس حقیقت سے نظریں چرا رہا تھا۔ تمہیں کیا بتاتا۔ خیر اب اس سب کو چھوڑو، یہ بتاؤ میں کیا کروں؟ میں اتنی دور بیٹھا ہوا ہوں؟ میں فوری طور پر کیا کر سکتا ہوں۔ جبکہ تم کہہ رہے ہو، آغا جی ثمن کا رشتہ طے کر رہے ہیں۔" وہ یک دم ہی پریشان ہو گیا۔

"کرنا کیا ہے؟ بس فوراً گھر آ جاؤ۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے مجھے دیکھتے ہی آغا جی نے گلے لگا لینا ہے۔ جانتے بھی ہو میں ان سے کتنا لڑ جھگڑ کر اور بدتمیزی کر کے دوبارہ نہ لوٹنے کے ارادے سے گھر سے نکلا ہوں۔ اب وہ مجھے گھر میں ہی آنے دیں، بڑی بات ہے کجا ثمن کا رشتہ۔۔۔" وہ چڑ گیا تھا۔

"تو بیٹا! بیٹھے بٹھائے تو لڑکی نہیں ملنے والی۔ کچھ تو جتن کرنے پڑیں گے۔" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"پلیز ابرار! بی سیریس۔" اس کا صبر رخصت ہونے لگا۔

"تو یار! تمہیں اتنی اکڑ دکھا کر جانے کی ضرورت کیا تھی۔ وہ بھی اس صورت میں، جب اپنی سب سے قیمتی متاع یہیں چھوڑے جا رہے تھے۔" ابرار کو بھی غصہ آ گیا۔

"بس یار! اس وقت غصہ آ گیا، تو کچھ سوچا ہی نہیں۔" وہ پشیمان ہوا۔

"ویسے ثمن کی منگنی ہو کس سے رہی ہے۔" اسے ایک دم خیال آیا۔

"اس کے جواب میں، میں تم کو ایک مصرعہ سناتا ہوں۔"

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف۔

ابرار نے شوخی سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ابے گھامڑ! مجھ سے۔۔۔"

ابرار کے جواب نے اسے ایک دم خاموش کرا دیا۔

"ایک منٹ زیادہ جذباتی مت ہونا۔ یہ آغا جی، بابا

اور امی کا فیصلہ ہے۔ اس میں میرا انٹرسٹ ایک فیصد بھی نہیں ورنہ میں تمہیں انفارم نہ کرتا۔"

ابرار اس کے جذباتی پن سے آگاہ تھا۔ سو فوراً" وضاحت کی۔ ادھر علی حاشر ایک دم متاسف ہوا کہ اس نے کیوں اعتراف کرلیا۔ اب اگر اس کی شادی ثمن سے نہ بھی ہوئی تو یہ بات ابرار کبھی دل سے نہیں نکال سکے گا۔

"امی نے بتایا کہ آغا جی اور پاپا کے ساتھ ان کی بھی خواہش ہے کہ ثمن اور میری منگنی ہوجائے' مگر ظاہر سی بات ہے کہ ثمن کی میری انوالمنٹ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ سو میں نے دوٹوک انکار کردیا' مگر امی نے کہا کہ ثمن کے دو پروپوزل آئے ہوئے ہیں اور انجینئر کے پروپوزل پہ آغا جی دل و جان سے راضی ہیں اور اگر ہم نے ثمن کے لیے پروپوزل نہیں دیا تو وہ انجینئر سے ثمن کا رشتہ کریں گے۔ اور ثمن جیسی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب تم بتاؤ کیا کہتے ہو؟" ابرار نے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کردی۔

"یہ تو وہی بات ہوگئی۔ "آگے کنواں پیچھے کھائی اب تم کرو یا انجینئر" ایک ہی بات ہے' میں کیا کہوں۔" اس نے گہری سانس لی۔

"اف! اب اتنی بھی آہیں مت بھرو۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے کہ میں ثمن سے منگنی کرلیتا ہوں۔ تمہارے آنے تک یہ منگنی قائم رہے گی۔ جب تم اپنی راہ ہموار کرکے پہنچو گے تو تمہارے آنے پر یہ منگنی توڑ دوں گا اور ہمارے خاندان میں تو منگنی ٹوٹنا کوئی اچھی بات نہیں۔ سو تم فوراً" اپنی خدمات پیش کرنا اور آغا جی کو ظاہر ہے متبادل کے طور پر تم سے اچھا شخص نہیں ملے گا۔ وہ تمہاری فرماں برداری پہ خوش بھی ہوجائیں گے اور تمہیں تمہارا گوہر مقصود بھی مل جائے گا۔ کیوں' کیا خیال ہے؟"

ابرار نے پوری پلاننگ اس کے سامنے رکھی۔

"مگر میرا مطلب میں..." علی حاشر کا ذہن الجھ گیا۔

"بے فکر رہو' مکروں گا نہیں۔ اپنے کہے پہ قائم رہوں گا۔" ابرار نے اسے چھیڑا۔

"نہیں' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "میرا مطلب ہے' آغا جی بعد میں تمہیں منگنی توڑنے دیں گے؟ اور بعد میں سب نے تمہیں مجبور کیا تو؟" اس نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

"اس کی تم فکر مت کرو' یہ میرا مسئلہ ہے۔" اس نے اسے اطمینان دلایا۔

"اگر آغا جی نے تمہیں دربدر کردیا' جیسے مجھے کیا تھا' تو پھر..." علی حاشر کو ایک اور خدشہ لاحق ہوا۔

"پہلی بات' آغا جی نے تمہیں نہیں نکالا' تم خود جوش میں گئے تھے۔ دوسری بات میں تمہاری طرح بے وقوف اور جذباتی نہیں' انڈر اسٹینڈ!" وہ چڑ کر بولا۔

"دیکھ لو... میں کیا کہوں۔" حاشر یوں ہی الجھا الجھا سا بولا۔

"تم بولو' میں تو تمہاری وجہ سے بول رہا ہوں۔ ایک لڑکی ریزرو ہوجائے گی تو اس کے آئے دن کے پروپوزل سے جان چھوٹ جائے گی۔ جب تک تم بھی آنے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ ایسا نہ ہو بعد میں تم راستہ بدل لو' تو میں تو پھنس جاؤں گا نا' کیونکہ مجھے ثمن سے منگنی نہیں کرنی۔ اگر تمہارا انٹرسٹ نہیں تو' پھر آغا جی اس کی کسی انجینئر سے منگنی کریں یا ایکس' وائی' زیڈ سے۔ آئی ڈونٹ کیئر اوکے۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"اچھا سنو تو... تم ناراض کیوں ہورہے ہو' مجھے عجیب سا فیل ہورہا تھا۔ لیکن اس حالت میں اس سے اچھا اور کوئی آئیڈیا ہو بھی نہیں سکتا۔" وہ جلدی سے بولا اسے بھی یہ بات اپنے حق میں نظر آئی تھی۔

"ٹھیک ہے' پھر ڈن ہوگئی یہ بات' تم جلد از جلد آنے کی کوشش کرو۔" ابرار نے گفتگو سمیٹی۔

"اف اسٹوپڈ! تم نے میرا بیلنس زیرو کردیا۔" اچانک ابرار کو خیال آیا کہ کال اس نے کی تھی تو وہ چیخا۔

"دوستی میں کبھی کبھی ایسا چلتا ہے۔" علی حاشر مطمئن ہوکر بولا۔

"چلو ٹھیک ہے' پھر خدا حافظ۔" وہ مسکرا کر فون بند کرکے آسمان کی وسعتوں کو دیکھنے لگا۔ بات کرتے کرتے وہ ٹیرس پہ آگیا تھا۔

"یعنی کہ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔" وہ بڑبڑایا۔ "چلو دیکھتے ہیں کیا کرسکتے ہیں' ہم تمہارے لیے۔" وہ گہری سانس لے کر پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

آغا جی کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سب سے بڑے بیٹے واجد کے تین بیٹے' زیب بھائی' سہیل بھائی اور جمال تھے۔ دوسرے بیٹے عابد کی تین بیٹیاں' شہلا آپی' زرین آپی' ثمن اور ایک بیٹا حماد تھا۔ جبکہ تیسرے نمبر پر زاہد کے دو بچے ابرار اور رانی تھے اور چھوٹے بیٹے راشد کے بھی دو بچے تھے۔ علی حاشر اور زوبیہ جبکہ بیٹی برطانیہ میں مقیم تھی اور ان کی ایک ہی اکلوتی صاحبزادی شبنم تھی۔

سب سے بڑے سنجیدہ اور بردبار سے زیب بھائی اپنی خوبیوں کی وجہ سے آغا کی پسندیدہ اور دست راست تھے اور ابھی کچھ عرصے پہلے ہی ابرار پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ زیب بھائی چالیس سال کے ہونے کے باوجود تنہا ہیں تو اس کی وجہ شہلا آپی تھیں۔ وہ یقیناً" شہلا آپی میں دلچسپی رکھتے تھے مگر چونکہ شہلا آپی بھی گھر کی بڑی بیٹی تھیں اور آگے بھی لڑکیوں کی لائن تھی' لہٰذا جو پہلا پروپوزل آیا چھوٹے تایا تائی نے زیادہ غور و خوض کیے بغیر رشتہ طے کردیا۔ ویسے بھی وہ لوگ آغا جی کے جاننے والے تھے' اور یوں زیب بھائی دل کی بات دل میں ہی رکھ کے رہ گئے۔ شہلا آپی نے بھی خاموشی سے والدین کی رضامندی پر سر جھکا دیا۔

حماد اور شبنم کا بھی یہی قصہ تھا۔ حماد چھوٹے چچا کی زوبیہ کو پسند کرتا تھا زوبیہ معصوم اور کچھ بے وقوف سی تھی' وہ حماد کی نظروں کا مفہوم سمجھ ہی نہیں پائی۔ ادھر برسوں سے برطانیہ میں مقیم زیب پھوپھو کو اچانک ہی اپنے وطن اور اپنے لوگوں کی یاد ـــ آئی اور وہ پاکستان چلی آئیں۔ پاکستان آکر ان کو حماد صاحب اتنے بھائے کہ وہ اپنی اکلوتی صاحبزادی شبنم کے لیے اپنے منہ سے ان کا رشتہ مانگ بیٹھیں۔

حماد تو سن کر ہی بوکھلا گیا۔ اس نے ببانگ دہل اعلان کردیا کہ وہ زوبیہ سے شادی کرے گا' مگر آغا جی کو اپنی اکلوتی بیٹی کو مایوس لوٹانا اچھا نہیں لگا اور انہوں نے چھوٹے تایا' تائی کو مجبور کرکے حماد کی شادی شبنم سے کرادی۔ حماد اتنا بددل ہوا کہ وہ پھوپھو کے ساتھ برطانیہ ہی چلا گیا۔

علی حاشر سال بھر پہلے ہی گھر چھوڑ گیا تھا۔ وہ شروع سے ہی جذباتی تھا مگر آغا جی کا فرماں بردار تھا۔ انہوں نے بچپن سے اسے جو کہا' اس نے کیا۔ حتیٰ کہ آغا جی کے کہنے پہ تایا کی کمپنی جوائن کرلی۔ اب یہ آغا جی کا خوف تھا یا محبت کہ ان کی ہر بات پر بنا چوں چراں عمل کرنے والا ساری محبت' سارا خوف بھول گیا۔ جب آغا جی نے اپنے دوست کی پوتی سے اس کی نسبت ٹھہرانی چاہی اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ سب نے سمجھانے کی کوشش کی پیار سے غصے سے' مگر وہ کسی کی بات سننے کو راضی ہی نہیں تھا۔ چچا چچی آغا جی کے سامنے شرمسار تھے۔ وہ کسی کی کیا سنتا' الٹا دھمکی دے دی کہ "اگر میرے ساتھ زیادہ ضد کی تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ اور چچا تو یہ دھمکی سن کر ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

"ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ آج تک ہم اپنے باپ کے سامنے تن کر کھڑے نہیں ہوئے اور یہ بدتمیزی کرتا ہے۔ نہیں ہے مجھے ضرورت ایسے ناخلف بیٹے کی نکل جاؤ! ابھی اور اسی وقت ہمارے گھر سے۔" اور وہ جذباتی تو تھا' فوراً" ہی سب چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا۔ ابرار ان دنوں شہر سے باہر تھا' جب گھر آیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا اور اپنا سر پیٹ لیا۔

ایک واحد ابرار ہی اس کے اتنے پرزور انکار کی وجہ جانتا تھا۔ اس نے کئی بار ثمن کے نام سے اس کی آنکھوں میں روشنیاں اترتے دیکھی تھیں۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو یقیناً" اس کا دفاع ضرور کرتا' بلکہ اگر علی حاشر بھی آغا جی کے سامنے ثمن کا نام لے لیتا تو وہ

خاندان کی لڑکی کا سن کر نرم پڑ جاتے، مگر وہ گھامڑ۔۔۔ ادھر آغاجی کے دوست کی پوتی کے لیے قرعہ فال سہیل بھائی کے نام نکلا اور انہیں قربانی کا بکرا بنایا گیا، مگر وہ چونکہ کسی میں انوالو نہیں تھے۔ سو راضی ہوگئے اور حنا دلہن کے روپ میں ان کے گھر آگئی۔

علی حاشر کے جانے پر چچی اور زوبیہ کی حالت غیر تھی، وہ سب سے اپنے آنسو چھپاتی رہتی تھیں۔

ابرار کو ان کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا۔ باقی سب کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا۔ غصے میں گیا ہے، کچھ دنوں میں لوٹ آئے گا۔ مگر جب کافی دن گزر گئے اور اس کی خیر خبر نہ ملی تو ابرار کے کافی تگ و دو کے بعد اس کے دوستوں سے پتا چلا کہ وہ کینیڈا جاچکا ہے۔ اسے شاک لگا، یہ تو اسے معلوم تھا کہ گھر سے جانے سے پہلے ہی اس نے کینیڈا کی ایک کمپنی کے لیے اپلائی کیا تھا، مگر اس کی قسمت کہ گھر سے جاتے ہی اسے آفر آگئی اور وہ یوں سب سے ملے بغیر ہی دیار غیر چلا گیا۔

ابرار نے اس کے دوست سے اس کا نمبر لے کر اس سے رابطہ کیا۔ پہلے تو وہ بات کرنے سے ہی انکاری تھا، مگر ابرار کی یقین دہانی پہ کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا، تب وہ رابطے میں رہنے پہ راضی ہوا۔ اب ابرار وقتاً" وقتاً" اسے فون کرکے اسے سمجھاتا رہتا کہ وہ جلد لوٹ آئے، چچی، چچا، زوبیہ بہت ڈسٹرب رہتے ہیں۔ اس نے زبردستی کرکے چچی اور زوبیہ سے اس کی بات بھی کروادی تھی۔ وہ چچی سے ناراض تھا کہ امی نے اس کی حمایت نہیں لی۔ اب تو اسے سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا۔ اس نے گھر میں سب کو اتنا بتادیا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہے۔ اس لیے اکثریت مطمئن ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

سب معمول پہ آگیا تھا کہ اچانک ثمن سے منگنی کا شوشا چھوٹ گیا۔ اس نے سوچا علی حاشر کو بلانے کا اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ سو اس نے اپنے ترتیب دیے گئے منصوبے کے مطابق ثمن سے منگنی پر ہاں کہہ دی۔

☆ ☆ ☆

اس کی ہاں سنتے ہی سارے خاندان میں گویا بھونچال آگیا تھا۔ آغاجی اور بابا اس کے ضدی انداز اور اپنی من مانی کرنے والی عادت سے واقف تھے، سو اس کے ساتھ کبھی زبردستی نہیں کرسکے۔ پورے خاندان میں وہ واحد تھا، جو ان سے دوبدو سوال جواب کرلیتا تھا۔ سو اب اس کے اقرار پہ ان کی حیرت لازمی تھی۔ امی بھی خوشی سے اس کی بلائیں لینے لگیں۔ پورا خاندان ہی خوش تھا اور وہ ان کی خوشی پہ حیران۔۔۔

ایسا کیا انوکھا ہوا تھا، اسے ہنسی آئی اور جب وہ منگنی توڑے گا، تو سب افسردہ ہوجائیں مگر جب علی حاشر منگنی کرے گا تو یہ لوگ پھر خوش ہوجائیں گے۔ ان لوگوں کو تو خوشی کا بہانہ چاہیے۔" ابرار نے سر جھٹکا۔

☆ ☆ ☆

وہ آفس سے لوٹا تو کافی تھکا ہوا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کوئی نظر آئے تو اس سے چائے کا کہہ دے۔ مگر کوئی نہ تھا۔ ناچار وہ خود ہی کچن میں چلا آیا، دیکھا ثمن اپنے لیے چائے بنارہی تھی۔

"ہائے۔۔۔" اس نے اسے مخاطب کرنے کے لیے ہلکے سے کہا۔ وہ جو گلاس رکھنے پلٹ رہی تھی، ایک دم ہی ڈر کر گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ابرار نے تیزی سے جھک کر پکڑلیا، ورنہ اس کی شہادت لازمی تھی۔

"ارے! اب میں اتنا بھی خوفناک نہیں کہ تم مجھے دیکھ کر یوں ڈر جاؤ۔" وہ مسکرایا، ثمن خاموش ہی رہی۔

"اگر ایک کپ مجھے بھی مل جائے تو۔" اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ثمن نے کچھ کہے بغیر چائے میں اضافہ کردیا۔ وہ بھی ایک سرسری نظر ڈال کر پلٹ گیا۔

☆ ☆ ☆
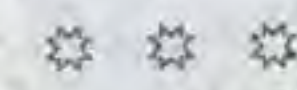
جب سے یہ منگنی کا ذکر چلا تھا۔ علی حاشر اکثر ہی اسے فون کرنے لگا تھا۔ ورنہ تو ابرار ہی رابطہ کرے تو کرے، مگر اب شاید وہ تمام حالات اپنی نظر میں رکھنا

چاہتا تھا۔ کئی بار ابرار کا دل چاہا اسے چھیڑے، مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ مبادا وہ فون کرنا ہی چھوڑ دے۔

ابھی بھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ بڑے خوشگوار انداز میں اس سے بات کررہا تھا کہ رانی دروازہ کھٹکھٹا کر چلی آئی۔

"بھائی! آپ کو امی اور تائی امی بلا رہی ہیں، ارجنٹ۔"

"ہوا کیا ہے؟" اس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں، بہت ضروری کام ہے۔" اس کے انداز میں شرارت تھی۔

"اچھا آرہا ہوں۔" اس نے ٹالا، رانی سر ہلا کر چلی گئی۔

"کیا ہوا، کہاں جارہے ہو کوئی مسئلہ ہے؟" حاشر کو تشویش ہوئی۔

"یار! کوئی مسئلہ ہوا تو حل کرنے سے پہلے تمہیں انفارم کروں گا۔" وہ چڑ کر بولا۔

"سوری۔۔۔ تم شاید بیزار ہوگئے۔" حاشر شرمندہ ہوا۔ ابرار سنبھل گیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ دوسری طرف نازک مزاج سے حاشر صاحب تھے۔

"نہیں یار! بیزار تو نہیں، بس امی اور تائی امی بلا رہی ہیں پتا نہیں کیا کام ہے۔"

"ہاں تو جاؤ، پہلے ان کی بات سن لو، پتا نہیں کوئی خاص کام نہ ہو۔ میں پھر فون کرلوں گا۔" اس کے انداز میں مزید بے چینی آگئی تھی۔ ابرار کو ہنسی تو بہت آئی، مگر اس نے جرح کیے بغیر فون بند کردیا۔ وہ لاؤنج میں آیا تو گھر کی آدھی سے زیادہ مخلوق لاؤنج میں موجود تھی۔ وہ آکر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"یہ دیکھو! ہم تمہاری دلہن کے لیے کپڑے لائے ہیں۔" انہوں نے گلابی اور فیروزی رنگ کا خوب صورت کام والا دوپٹہ اس کے سامنے پھیلایا۔ ابرار نے بے ساختہ ان سے تھوڑے فاصلے پہ بیٹھی ثمن کو دیکھا، وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ غالباً" اس کو بھی زبردستی بلایا گیا تھا۔

"اف امی! آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ اتنا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ ادھر ادھر بکھری ڈھیروں شاپنگ دیکھ کر جھنجلا گیا۔

"کیوں ضرورت نہیں۔ اتنے عرصے بعد تو یہ موقع آیا ہے، ورنہ سہیل بھائی کی شادی بھی آغاجی اور حاشر کی وجہ سے بدمزگی سے ہوئی تھی اور حماد کی شادی میں بھی پھوپھو کو برطانیہ جانے کی جلدی تھی، اب تو ہمیں سکون اور خوشی سے یہ وقت انجوائے کرنے دو۔"

زرین آپی نے تقریر جھاڑ دی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا، میرا مطلب تھا سادگی سے۔۔۔"

"کیوں بھئی، ہماری لاڈلی، چہیتی بہن ہے۔ ہم تو بہت دھوم دھام سے کریں گے۔" انہوں نے بہت لاڈ سے ثمن کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ دیکھیں بھائی! ثمن بھابھی پر یہ کلر کتنا سوٹ کررہا ہے۔" رانی نے اٹھ کر وہ جگمگاتا دوپٹہ ثمن کے سر پر پھیلادیا اور واقعی اس کا صبیح سرخ و سفید چہرہ تمتما اٹھا۔ ثمن نے تیزی سے دوپٹہ ہٹایا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ ابرار نے بغور اس کا انداز ملاحظہ کیا تھا۔

"ہوں، اس کا مطلب ہے۔۔۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔" اس نے دل میں سوچا۔

"ناراض کردیا ناں تم نے میری بہن کو۔" زرین آپی کی بات سن کر وہ حیران رہ گیا۔

"میں نے۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"سادگی سے منگنی کا جو کہا ہے۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"زرین! فضول مت ہانکو، وہ شرم سے اٹھ کر گئی ہے۔" تائی امی نے ان کو گھرکا۔

اب پتا نہیں وہ ناراضی سے گئی تھی یا شرم سے۔ اسے تو بیزاری اور گریز محسوس ہوا تھا۔

"اچھا لو یہ دیکھو۔" امی دوسرا ڈبہ کھول ہی رہی تھیں کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے جو آپ لوگوں کو کرنا ہے کرلیں۔" کہتا باہر نکل گیا۔

"ہونہہ۔۔۔ ہمارے گھر کے لڑکے ہیں ہی بدذوق۔"

رانی کی بڑبڑاہٹ اس نے باہر نکلتے ہوئے سنی اور ان سنی کر گیا۔
کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ موبائل بجنے لگا اور حاشر کا نمبر دیکھ کر اسے غصہ آگیا۔ "ان موصوف کو بھی سکون نہیں۔" اس نے بجتا موبائل مسہری پہ اچھالا اور کمرے سے باہر آگیا۔ پتا نہیں کیوں یہ سب دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو رہا تھا۔ زبانی کلامی بات ہو جاتی بس۔۔۔ آگے بڑھا تو زیب بھائی ٹکرا گئے۔ ان سے باتوں میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ یوں گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا' اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔ کمرے میں واپس آیا تو موبائل پھر بج رہا تھا۔

"او گاڈ! یہ لگا ہوا ہے ابھی تک۔" اس کے اٹھانے سے پہلے ہی موبائل آف ہو چکا تھا۔ وہ حاشر کو کال بیک کرنے لگا مگر پھر آف کر کے لیٹ گیا۔

"تیرا کام ہے بیٹا' تو ہی کریڈٹ ضائع کر۔" وہ بڑبڑایا۔ اسی وقت دوبارہ بیل بجی۔ حاشر کا نمبر تھا' اس کو ہنسی آگئی۔

"تمہیں سکون نہیں ہے؟" اس نے ریسیو کرتے ہی کہا۔

"کہاں مر گئے تھے' میں ہلکان ہو گیا فون کرتے کرتے۔" حاشر کی سلگتی ہوئی آواز آئی۔

"آئی نو۔۔۔ آئی نو' میرے موبائل میں مسڈ کالز کا آپشن بھی ہے۔" وہ شریر انداز میں بولا۔

"بکو مت' بی سیریس ابرار! میری جان پر بنی تھی۔ طرح طرح کے وہم ستا رہے تھے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے تھے؟" وہ چڑ کر بولا۔

"کم آن حاشر! کمال کرتے ہو' موبائل کمرے میں تھا اور میں کمرے سے باہر۔۔۔ بس اس لیے پتا نہیں چل سکا' اور تم۔۔۔ اسٹوپڈ۔" اس نے بھی چڑ کر کہا۔

"ہاں تو موبائل چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت' ساتھ رکھا کرو نا۔" وہ بھنایا۔

"ایکسکیوز می مسٹر! یہ موبائل ہے' میری بیگم نہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا اور اتنے خراب موڈ میں بھی حاشر کو ہنسی آگئی۔

"خیر۔۔۔ آپ فرمائیں گے آپ کیوں اتنے ہلکان ہو رہے تھے مجھ سے بات کرنے کے لیے؟"

"کچھ خاص نہیں' بس یہی معلوم کرنا تھا' میری دونوں تائیاں تمہیں کیا کہہ رہی تھیں؟" حاشر نے سرسری انداز میں کہا۔

"اف۔۔۔!" وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "کہو تو ایک ایک پل کی ویڈیو بنا کر تمہیں کوریئر کر دوں یا چاہو تو سیٹلائٹ کے ذریعے براہ راست دکھانے کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔" ابرار نے ٹھنڈا میٹھا طنز کیا۔

"تم شاید برا مان گئے۔" حاشر کو احساس ہوا۔

"میری ایک بات سنو! میرے جانو! میرے چندا! ثمن ہر حال میں تمہاری ہے' چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ آغا جی کا کہا پتھر پہ بنی لکیر نہیں ہے' یہ ابرار کا دعوا ہے لہٰذا یہ نہیں بدل سکتا' جب تک ابرار خود نہ چاہے' انڈر اسٹینڈ! اب بالکل ریلیکس ہو جاؤ۔" ابرار نے اپنے اسٹائل میں اسے تسلی دی۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔" وہ کچھ خائف سا ہو گیا۔ "اچھا' خیر پھر بات ہو گی۔" حاشر نے مطمئن ہو کر اجازت چاہی۔

ارے۔۔۔ ارے سن تو لو تمہاری تائیوں نے مجھے کیوں بلایا تھا' ایسا نہ ہو تمہیں رات بھر نیند نہ آئے اور تمہارے کوسنوں سے میں وقت سے پہلے ہی سفر آخرت کے لیے کوچ کر جاؤں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تم۔۔۔ تم جو گالیاں مجھے نہیں آتیں' وہ بھی میرے منہ سے نکلوانے کی کوشش کرتے ہو' ذلیل انسان!" حاشر دانت پیس کر بولا۔ اس کے صبر کا پیمانہ شاید آخری حد پہ تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔ آپ کا حسن ظن ہے' ورنہ من آنم کہ من دانم۔" ابرار نے بھی گویا اسے زچ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ "ویسے انہوں نے مجھے اپنی شاپنگ دکھانے بلایا تھا۔ اللہ حافظ۔۔۔" اس نے کہتے ہی فون بند کر دیا' اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب اچھا خاصا تپ

چکا ہے۔

☆ ☆ ☆
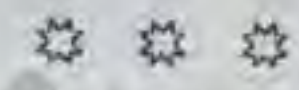
دوسرے دن ویک اینڈ تھا۔ ناشتے کے بعد سے ہی رانی اس کے سر پہ سوار ہو گئی تھی "بھائی شاپنگ پہ چلیں۔" اس کے ساتھ زوبیہ بھی تھیں۔

"ارے یار! کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو' کل ہی تو اتنی ڈھیروں شاپنگ کی ہے۔" وہ حیران ہوا۔

"ہاں تو وہ ہماری تھوڑی تھی' ثمن آپی کی تھی۔ اب ہم اپنے لیے کریں گے۔" زوبیہ تنک کر بولی۔

"توبہ توبہ۔۔۔ تم لڑکیوں کی شاپنگ۔۔۔ میرا دماغ خراب ہے جو تمہارے ساتھ جاؤں گا۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"کچھ بھی کہو' آج تو تمہیں شاپنگ پہ جانا پڑے گا۔" زریں نے دھونس سے کہا۔

"ایک شرط پہ۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر اطمینان بولا۔

"ثمن کو بھی لے چلو۔"

"کیا۔۔۔؟ وہ تو ہرگز نہیں مانیں گی۔" رانی اور زوبیہ پہ اوس پڑ گئی۔

"وہ تو اپنی شاپنگ کرنے نہیں گئیں' اب کیا جائیں گی۔" زوبیہ نے منہ بنایا۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے' میرا نہیں' مجھے لے جانا ہے تو میری یہ شرط ہے' ورنہ اپنا راستہ ناپو۔"

اسے پتا تھا کہ ثمن راضی نہیں ہو گی اور اس کی بھی خلاصی ہو جائے گی۔ وہ آرام سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"ویسے آپ اپنی بہن کی بھی رائے لیں' مجھے لگ رہا ہے انہیں یہ نیا تعلق پسند نہیں آ رہا۔" وہ ثمن کو آتا دیکھ کر جان بوجھ کر معنی خیزی سے بولا۔ "جی آپی! آپ نے مجھے بلایا۔" ثمن اس کی بات ان سنی کر کے زرین سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں' میں کہہ رہی تھی ہمارے ساتھ شاپنگ پہ چلو۔"

"مگر آپی! بہت ٹائم لگ جائے گا' میں۔۔۔"

"کچھ نہیں ہوتا' بس چلو' کبھی کبھی جانے میں حرج نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر کچھ سختی سے بولیں۔

"اچھا' چلیں' کب تک جانا ہے۔" وہ ابرار کے سامنے زیادہ بحث نہیں کر پائی۔

"کب تک چلو گے ابرار؟" انہوں نے اس سے پوچھا۔

ثمن نے چونک کر ابرار کی شکل دیکھی گویا اسے پتا نہیں تھا ابرار بھی جا رہا ہے۔ اس کو ہنسی تو بہت آئی مگر سنجیدگی سے بولا۔

"پہلے اس سے پوچھ تو لیں' میرے ساتھ جانے پہ تیار ہے؟"

"کیوں؟ اسے کیوں اعتراض ہو گا' اب اگر منگنی کے سال بعد شادی ہوئی تو کیا تم لوگ ایک گھر میں رہ کر سال بھر تک پردہ کرو گے؟ اچھا ہے اسی بہانے ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا۔" وہ فوراً بولیں' ثمن جز بز ہو گئی۔

"جاؤ ثمن! تیاری کرو' بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔" انہوں نے ثمن سے کہا۔ ان کے انداز میں ایک محسوس کن تنبیہ تھی۔ ثمن خاموشی سے پلٹ گئی۔

پھر وہ ان کی تمام شاپنگ کے دوران توبہ توبہ کرتا رہا۔ "آئندہ تم لوگوں کے ساتھ کبھی نہیں آؤں گا۔ میری سات نسلوں کی توبہ۔"

"ارے ہاں ابرار بھائی! یاد آیا' امی' ثمن آپی کے لیے انگوٹھی خریدنے کا کہہ رہی تھیں۔ اب اگر آپ دونوں اتفاق سے ساتھ آ ہی گئے ہیں تو آپ ثمن آپی کی پسند کی انگوٹھی بھی خرید لیں۔" رانی کو اچانک یاد آیا۔

"اونہوں۔۔۔ انگوٹھی کا کوئی چکر نہیں' اس نے دو ٹوک انکار کیا۔ "آپ لوگوں نے جو تیاری کی ہے' وہ ہی مجھے اتنی لگ رہی ہے' زبانی کلامی بات کافی ہے۔" وہ کچھ جھنجھلایا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی' امی بھی تمہارے لیے انگوٹھی لانے کا کہہ رہی تھیں۔ زرین آپی کا موڈ آف

ہونے لگا۔ ابرار نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا۔

"اوکے... دیکھ لیں گے بعد میں... ابھی تو چلیں..." اس کا دل اچانک ہی اچاٹ ہو گیا۔ اور اس کے موڈ کو دیکھ کر سب ہی خاموش ہو گئے۔ شاپنگ کا اینڈ کر کے سب نے واپسی کی راہ لی۔

"اتنی بھوک لگ رہی ثمن آپی! آپ بھائی سے کہیں، کچھ کھلا دیں، آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔" رانی نے ثمن کے سرگوشی کی، مگر اس کی سرگوشی اتنی بلند تھی کہ آگے چلتے ابرار اور ساتھ چلتی زرین اور زوبیہ نے بھی سن لی۔

"تمہاری بات کب ٹالی ہے، جو ادھر ادھر سے سفارشیں کروا رہی ہو۔" میکڈونلڈ پہ گاڑی روکتے ہوئے ابرار نے رانی کو گھورا۔

"آپ کا موڈ خراب تھا تو اس لیے۔" وہ منمنائی۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے، ثمن کے کہنے پہ میرا موڈ خوشگوار ہو جاتا؟" اس نے ثمن کو دیکھ کر کہا۔ فور چیئر ٹیبل پہ پانچویں کرسی ایڈجسٹ کرنے پہ اسے ثمن کے برابر میں جگہ ملی۔

"میں یہاں بیٹھ جاؤں، تم اٹھ کر بھاگو گی تو نہیں؟" اس نے انتہائی معصوم شکل بنا کر اس سے پوچھا۔ ثمن نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ، میری بہن اتنی بھی خونخوار نہیں۔" زرین آپی اس کے انداز پہ ہنستے ہوئے بولیں۔ آرڈر دینے کے بعد ابرار پھر ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔

"دیکھو میری بات سنو! دوستی تو ہمارے درمیان پہلے بھی نہیں تھی۔ مگر وہ کزنوں والی بے تکلفی تو تھی۔ سلام، دعا، بات چیت، کبھی کبھی تم مجھے چائے وغیرہ کا بھی پوچھ لیتی تھیں، مگر یار! اب تو میں اس سے بھی گیا۔ تم ہمارے درمیان بس ایک کزن شپ کو ذہن میں رکھو، باقی سب باتیں نکال دو، یقین مانو، بہت ایزی رہو گی، رائٹ؟"

ابرار نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اس کی جھجک دور کرنی چاہی۔ ثمن یوں ہی سر جھکائے خاموش رہی۔

"ثمن! ابرار تم سے بات کر رہا ہے۔" زرین آپی کو اس کا یوں لاتعلق بیٹھنا ایک آنکھ نہ بھایا۔

"جی سن رہی ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"سن رہی ہوں کیا، جواب دو۔" وہ ناراضی سے بولیں۔

"کیا جواب دوں، بات سن لی، اب عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"واہ! کیا فرماں برداری ہے۔" ابرار جھوم اٹھا، رانی اور زوبیہ ہنسنے لگیں۔

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟" ثمن نے غصے سے اسے دیکھا۔

"توبہ! میری یہ مجال؟" ابرار نے کانوں کو چھوا۔

"بہتر ہے، آپ مجھے مخاطب نہ کریں۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"ثمن!" زرین آپی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ورنہ... تم اس ہونے والی منگنی سے انکار کر دو گی؟" وہ زرین کا انداز نظر انداز کر کے شرارت سے بولا۔

"مگر نہیں یہ میری خام خیالی ہے، تم لوگ بہت ڈرپوک ہو۔" اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا اشارہ حاشر اور ثمن کی طرف تھا۔ اسی وقت ویٹرز آرڈر لے کر آیا تو سب کی توجہ بٹ گئی۔

"ڈیئر کزن، میں تمہیں کہہ رہا ہوں، مجھے اتنا اعصاب پہ سوار مت کرو، میں تمہارے منگیتر کے عہدے پہ فائز ہو رہا ہوں، سولی چڑھا دوں گا تمہیں۔"

"آپ فضول میں اس بات کو ایشو بنا رہے ہیں، میں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟" اس کی بک بک سے عاجز آ گئی۔

"اچھا... تو پھر یہ ساٹھ کی ہیروئن کیوں بنی ہوئی ہو، اداس، غمگین، افسردہ۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ وہ کچھ نہ بولی، چپ چاپ کھانے لگی۔

گھر آ کر زرین آپی نے ثمن کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔

"تم ابرار سے ٹھیک سے بات کیوں نہیں کر رہی

تھیں۔"
"کر تو رہی تھی اور کیسے کرتی۔" وہ چڑ کر بولی۔
"دیکھا تھا میں نے تمہارا بی ہیویر۔ ذرا جو اس کی بات کا ڈھنگ سے جواب دیا ہو جانتی ہو لڑکے ایسی باتیں کتنا نوٹ کرتے ہیں' اور وہ تو ہے بھی اتنا شارپ' تمہیں' تمہارے مزاج کو بچپن سے جانتا ہے۔ ہم کوئی بہانہ بھی نہیں بنا سکتے۔ تمہارے مزاج کی تبدیلی وہ فوراً" محسوس کرلے گا۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھایا' وہ خاموش ہی رہی۔ "تم اس رشتے سے خوش تو ہو؟" اچانک انہیں خیال آیا۔
"ہوں۔۔۔" اس نے ہلکے سے کہا۔
"ٹھیک سے بتاؤ ثمن! مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔" وہ الجھن کا شکار ہوئی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہوں آپی! میں بہت خوش ہوں۔" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی اور وہیں بیٹھ گئی۔
"تو پھر تم اس سے ٹھیک سے بات کیوں نہیں کر رہی تھیں۔ تمہیں پتا ہے' وہ ہمارے خاندان کا سب سے بیسٹ لڑکا ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہے کہ تمہاری منگنی اس سے ہو رہی ہے۔" وہ اسے اکسانے کو کچھ جوش سے بولیں۔
"اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں اس کے آگے پیچھے پھروں گی یا اس کے ساتھ رومانٹک گفتگو کروں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔" وہ رکھائی سے بولی۔
"مگر کیوں؟ کیا تمہیں ابرار پسند نہیں؟" انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
"مجھے اس کی عادتیں نہیں پسند۔ بہت پراؤڈ سا ہے' اوور کانفیڈنٹ۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔ میں اسے ایسا کوئی تاثر نہیں دینے والی کہ اس نے مجھ سے منگنی کر کے مجھ پہ احسان کیا ہے۔" اس نے خاصا کڑھ کر کہا۔ وہ ہنس پڑیں۔
"کہیں تم اس کے شروع کے انکار کو تو دل سے نہیں لگا کر بیٹھیں۔" وہ قدرے مسکرا کر بولی۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرا کر بولی اور کھڑی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو اسے بلا کر امی نے بھی یہی پوچھا کہ جب وہ اور ثمن اکٹھے چلے گئے تھے تو اس نے انگوٹھی کیوں نہیں لی؟ اور پھر وہی لمبی بحث چھڑ گئی۔ ابرار انگوٹھی کے حق میں نہیں تھا' لیکن امی کے دلائل کے آگے ہار مان لی۔
"ٹھیک ہے' آپ خریدنے کی کوشش مت کیجیے گا' میں خود لے آؤں گا۔" اس نے چڑ کر کہہ دیا' اور کمرے میں آتے ہی حاشر کا نمبر ملایا۔
"شکر ہے تمہیں توفیق تو ہوئی۔" حاشر نے اس کا طنز اس کو لوٹایا وہ ہنس پڑا۔
"اچھا خیر' اس وقت میں نے تمہیں انگوٹھی کے لیے فون کیا ہے۔ تم وہاں سے کوئی انگوٹھی بھیجو۔" ابرار نے کہا۔
"انگوٹھی۔۔۔ کیسی انگوٹھی؟" وہ حیران ہوا۔
"ہاتھی کے ناپ کی' میوزیم میں رکھوانا ہے۔" وہ جل کر بولا۔
"پلیز یار! میں سمجھا نہیں۔" حاشر الجھ کر بولا۔
"ارے یار! ثمن کے لیے' یہاں سب بضد ہیں کہ منگنی میں انگوٹھی بھی پہنانی ہے' تو میں چاہ رہا تھا ثمن تمہاری دی ہوئی انگوٹھی پہنے۔" ابرار نے وضاحت سے کہا۔ حاشر سوچ میں پڑ گیا۔
"مگر میرے پاس ثمن کا ناپ تو ہے نہیں۔" اس نے نکتہ اٹھایا۔
"تو یار! اندازے سے لے لینا' اور پھر تھوڑی ڈھیلی یا تنگ ہو بھی گئی تو کوئی مسئلہ نہیں' ثمن تمہاری نشانی سمجھ کر پہن لے گی۔" وہ شرارت سے بولا۔
"تو کیا تم ثمن کو ساری پلاننگ بتا دو گے؟" حاشر تشویش سے بولا۔
"نہ بابا نہ' لڑکیوں کو کوئی بات ہضم نہیں ہوتی۔ فضول میں اس نے کسی کو اپنا رازداں بنا لیا تو ہم دونوں تو مارے گئے اور پھر ایسی باتوں سے لڑکیاں اپنی انسلٹ فیل کرتی ہیں' اس لیے یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے۔" ابرار نے کہا۔
"چلو ٹھیک ہے۔" حاشر نے سوچتے ہوئے بولا۔ "میرے ایک دوست کا بھائی جا رہا ہے پاکستان ایک دو دن میں' اس کے ہاتھ سے بھجوا دوں؟" حاشر کو ایک دم خیال آیا۔
"ہاں' یہ طریقہ زیادہ صحیح ہے' تم اس کا ٹائم اور فلائٹ بتا دینا' میں اسے ایئرپورٹ پہ ہی چھاپ لوں گا۔" ابرار نے مسکرا کر کہا تو حاشر ہنس پڑا۔
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سب اوکے کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"آغا جی 27 جمادی الاول کو منگنی کا کہہ رہے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" صالحہ بیگم نے ابرار کو بتایا' ساتھ ہی اس کی رائے بھی جاننی چاہی۔
"ٹھیک ہے' آج 17 جمادی الاول ہے' یعنی دس دن ہیں' کافی ہیں۔" اس نے سر ہلا دیا۔
"ہاں' بس بچیوں نے اتنا وقت لے لیا' ورنہ آغا جی تو ہفتے بھر میں کر رہے تھے' اور پھر سہیل اور حنا بھی اسلام آباد سے آ رہے ہیں اور شہلا کو اسی وقت فرصت تھی بچوں کی پڑھائی سے' اس لیے سب کی سہولت دیکھ کر یہ تاریخ رکھی۔" انہوں نے تفصیل سے کہا۔
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے امی! آپ لوگ ایک عام سی تقریب کو اتنے وسیع پیمانے پہ کیوں کر رہے ہیں۔" وہ یہ سب تیاریاں دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔
"کیوں بیٹا! میرا ایک ہی تو بیٹا ہے' اس نے میری بات مان کر مجھے خوشی کا یہ موقع فراہم کیا ہے' میں کیوں نہ اپنے ارمان پورے کروں' اور منگنی کی بھی اپنی حیثیت ہوتی ہے' سب ہی بے تحاشا خوش ہیں اس رشتے پر۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ خاموش نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔

☼ ☼ ☼
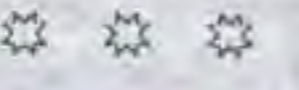
ابرار نے اس کے دوست کے بھائی سے انگوٹھی وصول کر لی تھی۔ انگوٹھی بلاشبہ اتنی خوب صورت اور نازک تھی کہ ابرار خود بھی کئی ثانیہ تک اس کی جگمگاہٹ سے نظر نہ ہٹا پایا۔ ابھی وہ انگوٹھی دیکھ ہی رہا تھا کہ حاشر کا فون آ گیا۔
"مل گئی انگوٹھی' کیسی لگی؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔
"بہت خوب صورت' بلاشبہ تمہارے انتخاب کی داد دینی پڑے گی۔ دونوں ہی چیزیں لاجواب پسند کیں۔ انگوٹھی بھی اور انگوٹھی والی بھی۔"
"ابرار! ایک بات پوچھوں؟" حاشر نے اس کی تعریف نظرانداز کی۔
"کیا؟"
"ثمن کو انگوٹھی تم پہناؤ گے؟" اس کا انداز بہت سرسری تھا' مگر ابرار کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔
"ہاں' ظاہری بات ہے' میری منگنی ہے تو میں ہی پہناؤں گا۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔
"نہیں' میرا مطلب تھا' تائی امی پہنا دیتیں تو۔۔۔" اس کا انداز اب بھی ویسا ہی تھا' وہ ابرار کی شرارت سمجھا نہیں۔ ابرار نے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"تم فکر مت کرو۔ میرا ارادہ امی سے ہی پہنوانے کا تھا' میں تو صرف ڈمی ہوں' اصل بندے تو تم ہو۔" ابرار نے اسے تسلی دی۔
"سوری یار! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم خود کو ڈمی کہو۔ اصل کردار تو تمہارا ہی ہے' میں تو پس پردہ ہوں یہ اور بات ہے کہ تم نے مجھے ہر چیز میں شامل رکھا ہے۔" وہ بری طرح شرمندہ ہوا ابرار ہنس پڑا۔
"خیر' یہ بتاؤ تمہارا آنے کا کب تک ارادہ ہے؟" ابرار نے کہا۔
"دیکھو' دو سال تو لگیں گے ہی۔" حاشر نے اپنا پروگرام بتایا۔
"کیا۔۔۔ ہوش میں تو ہو تم؟ آغا جی کو جانتے نہیں' دو سال انہوں نے اس منگنی کو رہنے دینا ہے' اسٹوپڈ! میں

بھی زیادہ سے زیادہ سال بھر کھینچ سکتا ہوں سال بھر میں تم نہیں آئے تو میں منگنی توڑ دوں گا اور تم جانتے ہو منگنی توڑنے کے بعد آغا جی نے دو دن میں ہی ثمن کی کہیں بھی شادی کر دینا ہے، پھر تم جاؤ بھاڑ میں، میری بلا سے۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی سے یہاں آنے کی کوشش شروع کر دو۔" وہ غصے سے بولا۔

"اچھا۔ اچھا تم اتنا ناراض کیوں ہو رہے ہو میں پوری کوشش کرتا ہوں سال بھر میں آنے کی۔" حاشر اس کے غصے پہ بوکھلا ہی گیا۔

"ہاں یہی تمہارے حق میں بہتر ہے تم سال بھر میں آجاؤ۔ ورنہ۔۔۔" ابرار نے اسے وارن کیا۔ پھر فون بند کر کے وہ ٹیرس پہ چلا آیا۔

اچانک اس کی نظر لان میں بیٹھی ثمن پہ پڑی۔ وہ ایک ہاتھ گال پہ رکھے یک ٹک گلاب کے پودے کو دیکھ رہی تھی اور سوچیں کہیں بہت دور شاید کینیڈا تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اسے جانے کیا سوجھی، نیچے اس کے پاس چلا آیا۔

"ہائے۔" وہ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ چونکی اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر جانے لگی۔

"ارے۔ ارے میں تم سے بات کرنے آیا ہوں اور تم اٹھ کر جا رہی ہو۔" اس نے تیزی سے اس کے سامنے آکر غالباً اس کے جانے کی کوشش ناکام کی۔

"ہاں، بس کچھ کام تھا۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"مجھے دیکھتے ہی کام یاد آگیا۔" اس نے طنز کیا۔

"ہاں۔ وہ بس۔" وہ اس کے پاس سے کنی کترا کر گزرنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ۔ اتنا تو مجھے جانتی ہی ہو گی کہ مجھے اپنے سامنے کسی کا بولنا پسند نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا اور بہت ضبط کر کے بیٹھ گئی۔ اس کی انہی باتوں سے اسے چڑ تھی، خود کسی کی نہیں سنتا اور اپنی مرضی سب پہ تھوپتا۔

"ویسے بائی دا وے۔ کس کو یاد کر رہی تھیں؟" وہ معنی خیزی سے بولا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"کم از کم آپ کو نہیں کر رہی تھی۔" اس نے اسے کسی بھی قسم کی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونے دیا۔

"آئی نو۔ آئی نو۔ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی ہے بھی نہیں۔ ویسے چاہو تو مجھے رازدار بنا لو۔ فائدے میں رہو گی۔ میں خاصا بے ضرر سا منگیتر ثابت ہوں گا۔" وہ خاصے دوستانہ انداز میں بولا۔

"میں آپ کی ان ہی فضول باتوں سے بچنے کے لیے اٹھ کر جا رہی تھی۔" وہ اس کی لایعنی باتوں سے اکتا کر بولی۔

اس کی بات پہ ابرار نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ واقعی کچھ تو اس میں ایسا تھا کہ حاشر جیسا نک چڑھا نخریلا بندہ اٹک گیا تھا اور وہاں کی رنگینی میں بھی اپنے ذہن سے اسے نکال نہیں پایا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل خود پہ جمی دیکھ کر ثمن گڑبڑا گئی۔

زیب بھائی نے کھنکار کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ چونک گیا۔

"میں جاؤں؟" ثمن تیزی سے کھڑی ہوئی اور اس نے بے دھیانی میں سر ہلا دیا۔

"میں بھی چلوں کچھ کام تھا۔" وہ گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔

وہ عجلت میں تھا نہیں مگر ظاہر کر رہا تھا۔ ابھی وہ ان کے کسی مذاق کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور بڑے ہونے کی حیثیت سے ان سے بدتمیزی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا راہ فرار ہی بہتر تھی۔

☼ ☼ ☼

منگنی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ اب تو ان سب لڑکیوں نے ڈھول بھی منگا لیے تھے بقول ان کے گھر میں خاصے عرصے بعد ایسا موقع آیا تھا۔ اسلام آباد سے سہیل بھائی اور حنا بھابھی بھی آچکے تھے اچھی خاصی رونق لگ تھی اور وہ یہ سب دیکھ کر بیزار ہو رہا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں منگنی توڑنے کا خیال نہ ہوتا تو شاید اسے بھی یہ سب رومین کا حصہ لگتا مگر اس وقت تو فضول ہی لگ رہا تھا۔ حاشر کے فونز کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آج وہ آفس سے آیا تو سب نے اسے دھر لیا تقریباً" پوری فیملی لاؤنج میں موجود تھی۔

"تمہیں کچھ یاد بھی ہے تم نے مجھے کچھ کہا تھا۔" وہ دونوں سے وہ اس سے پوچھنے کا سوچ رہی تھیں مگر بھول جاتی تھیں۔

"کیا۔؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"یہی کہ انگوٹھی کا انتظام تم خود کرو گے۔" انہوں نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

"او اچھا۔ رانی! میری مسہری کی سائیڈ دراز سے ذرا انگوٹھی لے کر آنا۔" اس نے چونک کر رانی سے کہا۔ رانی فوراً" ہی اچھل کر بھاگی اور انگوٹھی دیکھ کر تو سب کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔

"ارے واہ تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

"واہ بھئی۔ بالا ہی بالا سارے کام کر لیے۔"

"تمہاری پسند تو بڑی لاجواب ہے۔" سب نے ہی حسب توفیق فقرے کسے۔ وہ مسکرا کر سنتا رہا۔

"ویسے ڈیزائن بہت پیارا، نازک اور یونیک سا ہے۔ یہاں کا تو نہیں لگ رہا۔" حنا بھابھی نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔۔ یہاں کا نہیں ہے۔ ایک دوست سے باہر سے منگوایا ہے۔" ابرار نے جواب دیا۔

"خیر یہ سب چھوڑو اگر اس نے انگوٹھی اندازے سے منگوائی ہے تو اسے ثمن کو پہنا کر دیکھو، ایسا نہ ہو عین وقت پر ڈھیلی ہو۔" حنا بھابھی نے پتے کی بات کی، ساتھ ہی ثمن کو آوازیں لگانے لگیں۔ وہ ہچکچاتی ہوئی چلی آئی۔

"ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔" انہوں نے اپنے پاس اس کے لیے جگہ بنائی۔ اسی وقت امی چائے لیے چلی آئیں۔ سب ابھی پی کر بیٹھے تھے لہٰذا وہ ایک کپ ہی لائی تھیں۔

"چچی جان! اب تو آپ اس کی ذمہ داری ثمن کے حوالے کر دیں۔ بہت خدمتیں کر لیں اپنے صاحب زادے کی۔" حنا بھابھی نے ابرار اور ثمن کو ساتھ دیکھا تو چھیڑنے سے باز نہیں آئیں۔

"تو ابھی سے بچی کو پریشان کروں؟ بعد میں تو اس نے ساری زندگی ہلکان ہونا ہے۔" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو ابھی سے اس معصوم کی فکر ہو رہی ہے۔ اس بے چاری کو تو زیادہ بولنا بھی نہیں آتا۔" حنا بھابھی نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کیا اور کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی کی۔

"معصوم" ابرار محض سوچ کر رہ گیا اسے کچھ دن پہلے کا اس کا روکھا، دو ٹوک انداز یاد آگیا۔ "کم از کم آپ کو یاد نہیں کر رہی تھی۔" اس کا یہ جملہ اس کے ذہن سے نکلا نہیں تھا۔

"میں جاؤں بھابھی؟" ثمن حنا بھابھی کے کان میں منمنائی۔

"ارے نہیں رک جاؤ، انگوٹھی تو ٹرائی کر لو۔ بقول ابرار اندازے سے ہی اس نے منگوائی ہے۔ ویسے اس کا پول اب تم کھولو۔ ہم سب کا خیال ہے کہ اس نے تم سے ناپ لیا ہو گا۔ جبکہ وہ یہ بات قبولنے سے انکاری ہے۔ تم بتاؤ، سچ کیا ہے؟" انہوں نے کہتے ہوئے شرارت سے ابرار کو دیکھا کہ اب تو تمہارا پول کھل ہی گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، میں نے کوئی ناپ نہیں دیا۔" اس نے ایک نظر ان پہ ڈال کر آہستہ سے کہا اور اس کے جواب پہ ان سب کے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔

ابرار نے بغور ثمن کو دیکھا، وہ مارے باندھے بیزار سی بیٹھی تھی۔ اتنی دیر سے وہ یوں ترچھی بیٹھی تھی کہ وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ نہیں پایا تھا مگر اتنا اندازہ اسے ہو چکا تھا کہ اس کی موجودگی پہ وہ شرم و جھجک کا شکار ہونے کے بجائے اکثر غصے میں رہتی تھی۔

"بے فکر رہو ڈیر کزن! بہت جلد تمہاری شکایت دور کر دوں گا۔" وہ اس کے تصور سے مخاطب ہوا۔ اسی وقت رانی انگوٹھی لیے چلی آئی۔

"یہ دیکھو! ابرار نے تمہارے لیے کس قدر خوب صورت انگوٹھی منگوائی ہے۔" حنا بھابھی نے انگوٹھی

کا کرسٹل فریم اس کی ہتھیلی پہ رکھا اور نظریں جھکائے بیٹھی ثمن بے اختیار اسے اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی تھی۔

"اچھی ہے ناں؟" اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

"اب اسے پہن کر دیکھو ناپ ٹھیک ہے؟ بلکہ ابرار تم ہی پہنا کر دیکھ لو اچھا ہے پریکٹس ہو جائے گی۔" وہ شرارت سے ابرار کو دیکھ کر بولیں۔ اس نے محض مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

ثمن نے تیزی سے انگوٹھی نکال کر خود ہی پہن لی کہ کہیں واقعی ابرار نہ پہنا دے اور ابرار اس کی جلد بازی پر مسکرا دیا۔ انگوٹھی اس کی سفید براق مخروطی انگلی میں سج گئی تھی۔

"واؤ! کتنی خوب صورت لگ رہی ہے تمہارے ہاتھ میں، دیکھو ابرار!" انہوں نے ایک دم اس کا ہاتھ اٹھا کر ابرار کے سامنے کر دیا اور اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"ہوں۔" ابرار ایک سرسری نظر ڈال کر بولا۔ وہ کبھی اسے بھرپور نظروں سے نہیں دیکھتا تھا کہ کہیں دوست کی امانت میں خیانت ہو۔ مگر اس وقت اس کے چہرے پہ شرم اور انگوٹھی کی چمک نے اسے دوبارہ دیکھنے پہ مجبور کر دیا۔

"میں جاؤں؟" ثمن نے چہرے پہ سے بال پیچھے کرتے ہوئے کچھ کنفیوز ہو کر قدم بڑھائے تھے کہ حنا بھابھی بول اٹھیں۔

"ارے۔۔۔ ارے انگوٹھی تو دیتی جاؤ۔ اب کیا وہ تمہارے لیے منگنی پہ دوسری انگوٹھی لائے گا۔" اور ان کی بات پہ ایک زبردست قہقہہ پڑا ابرار بھی مسکرا دیا، ثمن خجل سی ہو کر انگوٹھی اتارنے لگی۔ اسی وقت ابرار کے موبائل کی بیل بجی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔" راہ فرار کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہ ہوتا۔ "رانی! ایک کپ چائے لے آنا میرے کمرے میں۔" حاشر کا نمبر دیکھ کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور رانی سے کہہ کر مڑا۔

"اب تو رانی کے بجائے ثمن سے کہو۔" حنا بھابھی نے ہانک لگائی۔

"او کے ڈونٹ وری، ثمن! تم ایک کپ چائے لے آنا میرے کمرے میں۔" وہ انگوٹھی اتار کر بھابھی کو تھماتی ثمن سے مخاطب ہو کر بولا اور اطمینان سے پلٹ گیا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ موبائل کی لگاتار بجتی ٹون سے بچنے کے لیے کال اٹینڈ کر چکا ہے اور اس کا جملہ حاشر نے بھی سن لیا۔

"تم ثمن سے بات کر رہے تھے؟" حاشر کے جملے پہ وہ ٹھٹک گیا۔

"او گاڈ! اب تم میرا دماغ مت گھمانا۔" حاشر کے جملے پہ وہ صحیح معنوں میں بھنایا تھا۔

"چائے کا میں نے رانی سے کہا تھا مگر اپنی فیملی کا تو تمہیں پتا ہے۔ سب پیچھے پڑ گئے کہ اب تم ثمن سے کام کہا کرو تو بس میں نے بھی انہیں بتانے کو کہہ دیا کہ ثمن تم چائے لے آنا۔ اسے بھی پتا ہے میں نے سب کو ٹہلایا ہے لہٰذا چائے نہیں لائے گی۔" اس نے خوامخواہ وضاحت کی۔

"لے آئے گی۔ جیسے سب نے تمہیں مجبور کیا ہے اسے بھی کریں گے۔" حاشر منہ بنا کر بولا۔

"ویسے ایک خوش خبری سناؤں؟" وہ اس کا موڈ بدلنے کو ڈرامائی انداز میں بولا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ واقعی تجسس میں مبتلا ہو گیا۔

"ثمن بھی تم میں دلچسپی رکھتی ہے۔"

"سچ! تمہیں کیسے پتا؟" وہ ایک دم پرجوش ہو گیا۔ "اس نے تم سے کہا ہے؟"

"دماغ ٹھیک ہے۔ وہ اپنے ہونے والے منگیتر سے اپنے ایکس محبوب کے بارے میں کیسے کہہ سکتی ہے؟" ابرار کو اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہوا۔

"نہیں، میرا مطلب تھا تم نے کس بنیاد پہ یہ بات کہی؟" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"بھئی میرا اندازہ ہے، جیسے تمہارے بارے میں لگایا تھا اور تم جانتے ہو ابرار کے اندازے ذرا کم ہی غلط ہوتے ہیں۔" وہ ایک تفاخر سے بولا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔۔۔ مگر پھر بھی، تمہیں اس کی کس بات سے فیل ہوا؟" یہ تو اسے معلوم تھا کہ اگر اسے محسوس ہوا تو پھر بات ٹھیک ہی ہو گی مگر وہ جاننا چاہتا تھا کہ ثمن کی کون سی حرکت اس کی گرفت میں آئی ہے۔

"مجھے لگا ہے جیسے وہ اس منگنی سے خوش نہیں۔ مجھ سے بھی ناراض اور کھنچی کھنچی سی رہتی ہے۔" ابرار نے اس کے رویے کو سوچتے ہوئے کہا۔

اچھا۔۔۔!" یہ اس کے لیے ایک خوش آئند بات تھی۔ "کاش! میں اس سے بات کر سکتا۔" اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

"ڈونٹ وری یار۔۔۔ میں ہوں نا، میں کروا دیتا ہوں۔" ابرار نے اسے تسلی دی۔

"نہیں، نہیں میں کیا بات کروں گا۔ میں اس سے اتنا زیادہ فری نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کوئی مسئلہ نہیں، خیر خیریت پوچھ لینا، بلکہ ہو سکے تو اظہار محبت بھی کر دینا، میری طرف سے اجازت ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔

"بکو مت! اس وقت اس نے میری حوصلہ افزائی نہیں کرنی۔ بلکہ بگڑ جائے گی کہ اب خیال آرہا ہے، جب میری منگنی ہو رہی ہے۔" حاشر مسکرا کر بولا تو وہ بھی ہنس دیا۔ اسی وقت دستک ہوئی۔

"یس!" اس نے یونہی لیٹے لیٹے کہا تو ثمن دروازہ کھول کر چائے لیے کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

"ارے ثمن تم۔ تم کیوں لائی ہو، میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔" وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھا اور جان بوجھ کر زور سے بولا تاکہ حاشر اس کا جملہ سن لے۔

"وہ چچی جان نے کہا تو۔" وہ دائیں کونے سے نچلا لب کچلتی جملہ ادھورا چھوڑ گئی۔

"او کے، کپ یہاں رکھو اور یہ لو، حاشر سے بات کرو۔" اس نے موبائل پہ ہاتھ رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

"کون حاشر۔۔۔؟" وہ بے ساختہ بولی۔ ابرار کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ابھی اگر یہ جملہ حاشر سن لیتا تو صحیح معنوں میں سلگ جاتا۔

"تمہارا کزن!" ابرار نے بمشکل خود کو "مجنوں" کہنے سے باز رکھا اور موبائل اس کی طرف اٹھا کر کپ لے کر ٹیرس پہ چلا آیا۔

"السلام علیکم حاشر بھائی!" سے ثمن کی آواز آئی اور وہ اس کے بھائی کہنے پہ مسکرا دیا۔

"جی۔۔۔ جی۔" وہ مسلسل جی جی کر رہی تھی۔

"آپ پاکستان کب آرہے ہیں؟" ابرار نے بے اختیار اسے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نظریں جھکا کر بڑے مگن سے انداز میں بات کر رہی تھی۔

"جی! ہم سب یاد کرتے ہیں۔ چچی جان سے بات کریں گے۔" ثمن نے پوچھا۔ اس نے پتا نہیں کیا کہا کہ اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"یہ لیجیے۔۔۔" ثمن نے موبائل لا کر اسے تھمایا۔

"کیا کہہ رہا تھا حاشر۔۔۔؟" ابرار نے اس کے چہرے پہ کوئی تاثر کھوجنا چاہا۔

"کچھ خاص نہیں، بس سب کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ آپ چچی جان سے بات کروا دیتے۔ اب پتا نہیں کب فون کریں وہ۔" اس نے کچھ افسوس سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، وہ فون کرتا رہتا ہے۔ ویسے تمہیں جب بات کرنی ہو، مجھے بتا دینا، میں کروا دوں گا۔" اس نے اسے حوصلہ دیا۔

"میری تو نہیں، چچی جان سے بات کروا دیجیے گا، وہ بہت یاد کرتی ہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"او کے اور کیا کہہ رہا تھا وہ۔۔۔ منگنی کی مبارک باد دی؟" ابرار نے اس کا چہرہ مکمل اپنی نظروں کی گرفت میں لیا۔ وہ اس کے انداز پر جزبز سی ہوتی نفی میں سر ہلا گئی۔

"تم نے بتایا تھا منگنی کا؟" اس نے اسی انداز میں کہا۔

"نہیں۔۔۔" اس کی نظروں سے خائف سی ہو کر وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ اسے نہیں یاد کہ کبھی ابرار نے اسے نظر بھر کر دیکھا ہو گا۔

دو دل مل رہے ہیں مگر چپکے چپکے

گانے کے آواز پہ ابرار اور ثمن دونوں نے ہی بے اختیار ٹیرس سے نیچے دیکھا، جمال اور سہیل لہک لہک کر انہیں دیکھتے ہوئے گا رہے تھے اور حنا، زرین، زوبیہ، رانی اور تو اور چچی جان بھی اپنی ہنسی روکنے کے چکر میں بے حال ہو رہی تھیں۔

"واٹ ربش!" ابرار کو ایک دم ہی شدید غصہ آیا۔
"تمہیں کس نے کہا تھا یہاں آنے کو۔" ان پہ تو اس کا بس نہیں چلا مگر اس پہ برس پڑا۔

"مم... میں، وہ آپ..." اس سے پہلے کہ وہ وضاحت دیتی وہ رکھائی سے ٹوک کر بولا۔

"اچھا... اچھا بس ٹھیک ہے جاؤ۔" ثمن نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ دوسرے لمحے وہ جھٹکے سے باہر تھی۔ ابرار نے اس کا انداز دیکھا، شاید اسے برا لگا تھا مگر پھر وہ خود بھی سر جھٹک کر اندر آ گیا اور ٹیرس کا دروازہ پوری آواز کے ساتھ بند کیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ آفس سے لوٹا تو ایک حیرت انگیز خبر اس کی منتظر تھی۔ منگنی سے محض پانچ دن پہلے امی نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔ اس کے لیے تو وہ بم ہی تھا۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ کئی لمحے تک کچھ کہہ ہی نہ پایا۔ تھوڑی دیر بعد سنبھل کر بولا۔

"مجھے ابھی نکاح نہیں کرنا۔"

"مگر کیوں...؟ نکاح ہی کر رہے ہیں۔ رخصتی تمہاری مرضی سے ہو گی۔ جب تم چاہو۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"بس میں نے کہہ دیا، سو کہہ دیا۔ مجھے ابھی ان خرافات میں نہیں پڑنا۔" اس نے بغیر کسی لچک کے کہا۔ اس نے بمشکل اپنے غصے پہ پہرے بٹھائے تھے کہ سامنے ماں تھی ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر دے۔

"تو پھر جا کر اپنا فیصلہ اپنے باپ، دادا کو سنا دو، نکاح کا فیصلہ ان کا ہے۔" وہ غصے سے بولیں۔

"امی! آپ آغا جی تک میرا انکار پہنچا دیں اور انہیں سمجھا دیں کہ ان کی پچھلی سات نسلیں بھی آ جائیں تو میں نے یہ نکاح نہیں کرنا۔ آخر میری سمجھ نہیں آتا، آغا جی ہمیں بے وقوف یا احمق کیوں سمجھتے ہیں، ہمارے پاس کوئی عقل نہیں، ہماری کوئی مرضی نہیں، کوئی پرابلم نہیں۔ انہیں بتا دیں کہ اب ہم دودھ پیتے بچے نہیں کہ وہ انگلی پکڑ کر چلائیں گے۔ کچھ فیصلے ہمیں ہماری مرضی سے کرنے دیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔" وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا اور بنا سوچے سمجھے بولتا چلا گیا۔

"ابرار... کیا ہو گیا ہے تمہیں... بالکل ہی چھوٹے بڑے سے بات کرنے کی تمیز بھول چکے ہو، تم اپنی ماں کے سامنے کھڑے ہو کر آغا جی کی پچھلی نسلیں نکال رہے ہو۔" وہ بھی بگڑ گئیں۔

"سوری امی! رئیلی سوری..." وہ شرمندہ ہو گیا اور ٹہلنا چھوڑ کر مسہری پہ بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"مگر پلیز! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"مگر اب تو گھر میں سب کو پتا چل چکا ہے اور بھائی بھابھی کیا سوچیں گے، پہلے خود ہی کہا اور اب منع کر رہے ہیں۔"

"یعنی کہ آپ لوگ سب فیصلے خود ہی کر چکے ہیں تو پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ پتا نہیں ہمارے بڑے ہمیں اتنا بلیک میل کیوں کرتے ہیں۔ پہلے آپ کی ضد پہ ہی میں منگنی پہ راضی ہوا، اب کہہ رہی ہیں نکاح کر لو۔ کچھ دن بعد کہیں گی رخصتی کروا لو۔ میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں یا دو دن بعد مر مرا جاؤں گا یا میری شادی نہیں ہوئی تو قیامت آ جائے گی۔" وہ ایک بار پھر کنٹرول کھو بیٹھا۔

"ہاں جتنے برے کلمات منہ سے نکال سکتے ہو نکال لو۔" وہ اس کے یوں مرنے جینے کی بات پہ رونے لگیں۔

"اف پھر ایموشنل بلیک میلنگ۔" اس نے پھر اپنا سر تھام لیا۔ "اچھا چپ تو ہو جائیں۔" ان کے رونے پہ وہ جھنجلا گیا۔

"نہیں کیا۔ تم تو اتنے پتھر ہو چکے ہو۔ تم پہ ماں کے آنسو کیا اثر کریں گے۔" وہ زور زور سے رونے لگیں۔

"آپ پتھر بولیں یا فولاد۔ مگر یہ سن لیں میں یہ نکاح نہیں کروں گا، بلکہ میرے ساتھ زور زبردستی کی گئی تو یہ منگنی بھی نہیں کروں گا۔ بھاڑ میں گئی ثمن۔ جس سے جی چاہے اس کی شادی کریں۔" وہ تلملا کر بولا۔

"تمہیں جو کہنا ہے خود جا کر کہو۔ میں تمہاری کوئی بات ان تک نہیں پہنچاؤں گی۔ میں تمہاری طرح بڑوں سے بدتمیزی کر سکتی۔ ان سے خود بات کرو اور جتنی بدتمیزی کرنا ہے کرو۔ خوب ماں باپ کا نام روشن کرو۔"

وہ غصے سے کہتی کمرے سے نکل گئیں۔ اسے معلوم تھا وہ کتنا ہی پیٹھ پیچھے ان پہ تنقید کرے مگر اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ دوبدو ان سے بحث کر سکے۔ اسے لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ اسی وقت موبائل پہ حاشر کی کال آنے لگی۔ مگر وہ اس حالت میں اس سے بات نہیں کر سکتا تھا اس نے موبائل ہی آف کر دیا۔

تھوڑی دیر یوں ہی ٹہل کر وہ اس مسئلے کا حل سوچتا رہا، پھر تنگ آ کر چابی اٹھا کر باہر نکل گیا وہ جان بوجھ کر رات کو دیر سے لوٹا اس کی توقع کے عین مطابق سب سونے جا چکے تھے۔ امی جاگ رہی تھیں، اسے دیکھتے ہی ناراضی سے اس سے کھانے کا پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اسی ادھیڑ بن میں دو دن گزر گئے۔ وہ شدید ٹینشن کا شکار تھا۔ حاشر سے بھی بات نہیں کر پا رہا تھا سا چھتا جا "پورا دن گھر نہیں آتا۔ رات گئے آتا اور بغیر کھانا کھائے سو جاتا مگر وہ جانتا تھا یوں راہ فرار اس مسئلے کا حل نہیں۔ صبح وہ ناشتہ کرنے جلدی چلا آیا۔

"آپ نے بات کی آغا جی سے؟" اس نے ماں کو اکیلا دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں..." انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"آپ نے ابھی تک بات نہیں کی۔ میں عین وقت پہ غائب ہو جاؤں گا نہ تو پھر بیٹھی رہیے گا لکیر پیٹتے۔" وہ ایک دم بگڑ گیا ان کا اطمینان دیکھ کر۔

"میں یہ ناشتا صرف اس صورت میں کروں گا، جب آپ آغا جی سے بات کر لیں گی۔" اس نے انہیں دھمکی دی۔

"تم نے تو قسم کھالی ہے کہ ہمیں سکھ سے نہیں رہنے دو گے۔ ہمارے ہر فیصلے سے اختلاف کرنا تمہاری عادت بن چکی ہے۔ اب جو ہو رہا ہے، خاموشی سے دیکھتے رہو۔ بس بہت ہو گئی تمہاری من مانی۔" انہوں نے بھی سخت انداز میں اسے وارن کر دیا۔

"پھر آپ بھی سن لیں میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" اس نے آخری داؤ آزمایا۔

"ہاں... بس یہی کسر رہ گئی ہے۔ جیسے وہ حاشر ذرا سی بات پہ گھر چھوڑ گیا اور اس کی ماں روتی رہتی ہے، ایسے ہی تم بھی چلے جانا۔ اس لیے تو تمہیں اتنا پال پوس کر جوان کیا تھا کہ یہ دن دکھاؤ۔" وہ سارے برتن چھوڑ چھاڑ کرسی پہ بیٹھ کر رونے لگیں۔

"امی... میری پیاری امی! آپ بس ایک بار آغا جی سے بات کر کے تو دیکھیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے بولا۔

کیا ہوا برخوردار! کیا بات کرنی ہے۔ آغا جی وہاں سے گزر رہے تھے، اس کا جملہ سن کر لاٹھی ٹیکتے اندر چلے آئے۔

"آغا جی! آپ..." اتنا اچانک وہ انہیں دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

"اب خود ہی بات کر لو۔" امی اس پہ ایک نظر ڈال کر چلی گئیں۔

"وہ آغا جی... میں دراصل اس نکاح کے حق میں نہیں ہوں فی الحال منگنی تک ٹھیک ہے پھر..."

"کوئی ٹھوس وجہ؟" آغا جی اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"بس ابھی میرا دل و دماغ اس سب کے لیے خود کو تیار نہیں کر پایا۔" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

"دیکھو برخوردار! تعلیم تمہاری کمپلیٹ ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ مل کر کما بھی ٹھیک رہے ہو یعنی کہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہو' کوئی معاشی 'مالی پرابلم نہیں۔ کوئی بہنوں کو بیاہنے کا لمبا چوڑا چکر نہیں۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فرمان ہے کہ "اولاد جب جوان ہو جائے تو ان کا نکاح کر دو" تو بس۔ ویسے بھی تم اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہو ان کو بھی خوشی دے دو۔ اور جو تم یہ کہہ رہے ہو کہ ابھی تیار نہیں ہو تو۔ کیا تیار ہونا ہے نکاح ہوتے ہی تم اپنی بیوی سے عشق جھاڑنا شروع کر دو۔ سال بھر تک خود کو تیار کرتے رہو' جب تک رخصتی ہوگی تو تمہارا دل و دماغ بھی راضی ہو ہی جائے گا۔

"آغا جی نے پوری تفصیل سے بات کی۔ وہ اس لیے ان سے بات کرنے سے گھبراتا تھا کہ وہ چاروں طرف سے بندے کو گھیر لیتے تھے اور ان کے آخری جملے پہ تو وہ اچھا خاصا جزبز ہو گیا تھا۔

"مگر آغا جی۔۔۔"

"اونہوں۔۔۔ کوئی معقول وجہ بتاؤ' تم جانتے ہو ایسے آئیں بائیں شائیں کرنا ہم کو پسند نہیں۔" آغا جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا اور چلے گئے۔

لب بھینچ کر اس نے زور سے پیالی پرچ میں پٹخی اور کرسی کو ایک زوردار لات مار کر باہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼
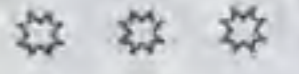
اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کرے۔ کوئی کچھ سمجھنے کو راضی نہیں تھا۔ آج وہ آفس سے سیدھا گھر چلا آیا۔ حاشر سے بات کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ فریش ہونے کے بعد وہ اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ یکدم ایک خیال آنے پر چونکا مگر پہلے خود کو کوسا بھی کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں اسے زیب بھائی سے بات کرنی چاہیے۔ آغا جی زیب بھائی کی بات نہیں ٹالتے تھے۔ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا سر پیٹا اور زیب بھائی کے کمرے کی طرف لپکا۔ زیب بھائی اپنا بریف کیس اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے زیب بھائی۔" اس نے انہیں روکا۔

"آؤ! کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ واپس پلٹ گئے۔

"آپ آغا جی سے بات کریں اور انہیں میرا نکاح کرنے سے منع کر دیں پلیز۔ ہر حال میں آپ کو میرا یہ کام کرنا ہے۔ بس منگنی تک ٹھیک ہے۔" وہ لجاجت سے بولا۔ ساتھ وہ مخصوص ہٹ دھرمی بھی تھی جو اس کا خاصا تھی۔

"مگر کیوں؟" انہوں نے بھی حسب توقع سوال اٹھایا۔

"اُفوہ۔ یہ جاننا ضروری ہے؟" وہ جھنجلا اٹھا۔

"ظاہر سی بات ہے' مجھے آغا جی کو مطمئن کرنا ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولے۔

"مگر میں آپ کو تفصیل یا وجہ نہیں بتا سکتا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہوں۔۔۔ مگر جو پلاننگ تم نے اور حاشر نے مل کر کی ہے' وہ انتہائی نامناسب ہے بلکہ حاشر بھی بے قصور ہے' ساری پلاننگ سراسر تمہاری ہے۔ تم لوگ بہت غلط حرکت کر رہے ہو۔" وہ سنجیدگی و ناگواری سے بولے۔

"آپ۔۔۔" اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ہاں' میں سب جانتا ہوں۔ جب تم حاشر سے بات کر رہے تھے تو میں ساتھ والے اپنے ٹیرس پہ موجود تھا' اور تم بات کرتے کرتے اپنے ٹیرس پہ چلے آئے تھے اس سے مجھے تمہاری اور حاشر کے درمیان ہونے والی گفتگو پتا چلی' مگر تم یہ سب غلط کر رہے ہو اگر تمہیں معلوم تھا کہ حاشر ثمن میں انوالو ہے تو تم یہ منگنی ہی نہیں کرتے یا پھر سب بات ذہن سے نکال کر ثمن کو اپنا لیتے' جیسے تمام شادیاں ہوتی ہیں مگر یہ سب پلاننگ۔۔۔"

"پلیز زیب بھائی! آپ جانتے ہیں' مجھے کسی کا اپنے معاملے میں انٹرفیر کرنا پسند نہیں۔" وہ ان کی بات کاٹ کر رکھائی سے بولا تو ان کے لب بھینچ گئے۔

"جانتا ہوں مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو۔ تم دونوں کے چکر میں ایک لڑکی پس جائے گی۔ اس کا کیا قصور ہے؟" انہیں دکھ ہوا تھا اس کے انداز پہ۔ پورا گھر ان کا احترام کرتا تھا۔ گھر میں سب سے بڑے پوتے ہونے کی وجہ سے ان کی ایک حیثیت تھی۔

"اس سب پہ میں غور کر چکا ہوں۔ ثمن بھی حاشر میں انوالو ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ چونک گئے۔

"بس پتا ہے۔" وہ ان کے یوں جرح کرنے پہ چڑ گیا۔

"یہ تمہارا اپنا قیاس ہے۔" وہ بہت صبر سے اس کے انداز کو برداشت کر رہے تھے۔

"لیکن غلط نہیں ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔"

کم آن زیب بھائی! آپ کو اس کی حالت نظر نہیں آرہی۔ جب سے یہ بات چلی ہے' تب سے اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی ہیں' بیزاری الگ۔ کم از کم میں نے تو اس کے چہرے پہ ایک مسکان بھی نہیں دیکھی۔ وہ منہ بنا کر بولا' وہ خاموش ہو گئے۔

"خیر۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" زیب بھائی سنجیدگی سے بولے۔

"آپ کو ساری بات پتا چل چکی ہے تو میری پوزیشن واضح ہو گئی ہوگی کہ میں یہ نکاح نہیں کر سکتا اگر آپ نے آغا جی کو فورس نہیں کیا تو میرے پاس آخری چوائس یہی ہوگی کہ میں گھر چھوڑ دوں۔"

اس کے چہرے پہ اتنی پتھریلی سنجیدگی رقم تھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے' کر دے گا' انہیں یقین ہو چلا تھا۔ اور یہ بات بھی وہ جانتے تھے کہ اسے سمجھانا بھڑ کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔

"تم نے حاشر کو بتایا' آغا جی نکاح کرنے کا کہہ رہے ہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے۔ آپ جانتے تو ہیں وہ کس قدر جذباتی انسان ہے۔ مجھے ڈر ہے وہ فضول میں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے' اب وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا۔" ابرار پریشان ہو کر بولا۔

"نہیں خیر' وہاں وہ تنہا ہے اس لیے ایسا کچھ نہیں کرے گا' کوئی بھی حرکت انسان اپنوں کو ٹارچر دینے کے لیے کرتا ہے' لہٰذا تم بے فکر رہو۔" انہوں نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔ وہ چپ رہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں آغا جی سے بات کرتا ہوں' ویسے تم یہ بات آغا جی کو بتا دیتے کہ حاشر ثمن سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میرا نہیں خیال کہ وہ رکاوٹ ڈالتے۔" زیب بھائی نے اپنی ایمان دار فطرت سے مجبور ہو کر ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا' انہیں اپنوں سے ایسی بے ایمانی پسند نہیں تھی۔

"مجھے آغا جی پہ کوئی بھروسا نہیں۔ وہ دو دلوں کے دشمن ہیں اور بالفرض وہ راضی ہو بھی جاتے تو میں اور حاشر یہ رسک نہیں لے سکتے تھے' وہ حاشر سے پہلے ہی بہت ناراض ہیں۔ اس نے ان کے مشورے کو مسترد کر دیا۔

"اور ہاں آپ نے آغا جی سے صرف بات نہیں کرنی بلکہ انہیں قائل بھی کرنا ہے۔"

اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بھی کھڑا کر دیا۔

پھر ان سے بات کر کے وہ بے فکر ہو گیا اسے یقین تھا' انہوں نے آغا جی کو قائل کر ہی لینا ہے' مگر وقتاً فوقتاً" حاشر کا نمبر ملانا نہیں بھول رہا تھا جو مسلسل بند جا رہا تھا' آخر اس پہ بھی لعنت بھیج کر زیب کا انتظار کرنے لگا۔

اسی وقت اس کا سیل فون بجا' حاشر کا نمبر دیکھ کر وہ چونک گیا۔

"ہیلو ابرار۔۔۔ مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔" حاشر کی سپاٹ آواز ابھری۔

"مہربانی۔۔۔ تم نے اس ناچیز کو اس قابل سمجھا۔" وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ وہ ان سنی کر گیا۔

"آغا جی اگر تم سے نکاح کرنے کا کہہ رہے ہیں تو تم کرلو... میں۔"

"حاشر..." ابرار نے اس کی بات کاٹی۔

"ایک منٹ پہلے میری بات پوری سن لو۔" اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا تو ابرار خاموش ہوگیا۔

"اگر تمہیں ثمن سے منگنی کرنی ہے تو کرلو۔ نکاح کرنا ہے یا پھر چھوڑنا ہے۔ سب تم پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے یہاں کسی مجبوری کے تحت پیپر میرج کی تھی، اب میں اسے کنٹی نیو رکھنا چاہ رہا ہوں تو سوپلیز ہمارے درمیان جو پلاننگ یا ڈیل ہوئی تھی، میں وہ ختم کررہا ہوں، اس لیے تمہیں اپنے لیے جو مناسب لگے وہ راہ اپنالو۔ میں نے تمہیں بتادیا اوکے۔ اور ہاں میں یہاں سے شفٹ ہورہا ہوں، نئی جگہ کے بارے میں تمہیں سیٹ ہونے کے بعد انفارم کروں گا۔ ٹھیک ہے، پھر بات ہوگی۔ اللہ حافظ۔"

"ایک منٹ حاشر! پلیز... وہ تو اس کی باتیں سن کر یوں گنگ ہوا کہ بولنا ہی بھول گیا۔ اس کے خدا حافظ کہنے پہ ہوش آیا تو اسے پکارتا رہ گیا مگر دوسری جانب لائن بے جان ہوچکی تھی۔ وہ گم صم سا موبائل دیکھتا رہ گیا۔

"ہیلو! کیا ہوا؟" ابرار والے ٹیرس پر سے زیب بھائی نے اسے مخاطب کیا۔

"زیب بھائی! غضب ہوگیا۔" ان کی آواز سن کر وہ چیخ اٹھا "ایک منٹ رکیں میں آرہا ہوں۔" وہ گھوم کر اپنے کمرے سے ان کے کمرے میں آیا۔

"آپ جانتے ہیں اس خبیث نے کیا کہا۔ او گاڈ! یہ شخص میرے سامنے آجائے تو اس کا خون یقیناً میرے ہی ہاتھوں سے ہوگا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"دھیرج' دھیرج۔ بیٹھ کر آرام سے بتاؤ، کیا ہوا؟" وہ مسہری پہ بیٹھے اور اسے بھی اشارہ کیا۔ اس نے اس کی فون پہ کی ہوئی گفتگو حرف بہ حرف سنادی۔

"ہوں... پھر تو قصہ ختم۔ اب کیا پرابلم ہے۔ جو تمہیں مناسب لگے کرو۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کا کیا خیال ہے اس نے جو کہا ہے سب کہانی اس نے ابھی بنائی ہے اس کا کوئی ... نہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں اگر یہ سب ہوگیا تو وہ یہاں لوٹ کر نہیں آئے گا اور میں نے یہ ساری ... اسے یہاں بلانے کے لیے ہی کی تھی۔ وہ بھی ... اکلوتا بیٹا ہے' زوبیہ کا اکلوتا بھائی ہے۔ وہ لوگ اس کے انتظار میں ہیں اور پھر وہ خود بھی وہاں اکیلا اور تنہا ... اس وقت کس کرب سے گزر رہا ہوگا' میں ... ہوں۔ اب لوٹ کر نہیں آئے گا زیب بھائی! انہیں آئے گا۔ جب اس نے ٹرسٹ کیا تھا مجھ پہ تو عمل کرتا۔" ابرار بولتے بولتے ایک دم جذباتی ہوگیا۔

"ایزی یار... ایزی' میں تمہارے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔ مگر یہاں بیٹھ کر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں' یہ بات اسے سوچنا چاہیے۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے۔" انہوں نے اس کے شانوں پہ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ نے آغا جی سے بات کی...؟"

"ہاں...!" ان کے جواب پر وہ چونک گیا

"کیا... کرلی... کیا کہا انہوں نے... اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں..." وہ بے تابی سے بولا۔

"بتانے آیا تھا' مگر تم سو رہے تھے اور اب آتے ہی نیا رونا لے بیٹھے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"اچھا... بتائیں تو کیا کہا انہوں نے...؟؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"ٹھیک ہے' فی الحال وہ منگنی پر ہی راضی ہوگئے ہیں۔ تمہارے نکاح کا پروگرام پوسٹ پونڈ ہوگیا۔" انہوں نے اتنی بڑی خوشخبری اسے بہت آرام سے سنائی۔

"کیا... رئیلی...؟" ابرار بے یقینی سے بولا۔

"ہاں' رئیلی..." وہ بھی اسی کے انداز میں بولے۔

"او تھینکس گاڈ... آپ نے میرے سر سے بڑا پہاڑ سرکا دیا۔" وہ مطمئن ہوکر کرسی پہ گر پڑا' اگر اسے زیب بھائی کی سنجیدہ فطرت کا اندازہ نہیں ہوتا تو وہ یقیناً" اسے مذاق سمجھتا۔

"اچھا اب بتاؤ... تمہارا کیا ارادہ ہے...؟" وہ سنجیدہ ہوگئے۔

"دیکھیں... کچھ سوچتے ہیں۔" وہ مبہم سا بولا ابھی تو وہ خود الجھا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج چونکہ 27 جمادی الاول تھی سو منگنی کی تیاری اپنے مکمل عروج پہ تھی' تقریب کا اہتمام انہوں نے اپنے لان میں ہی کیا تھا۔ پورا لان جگمگا رہا تھا۔ چیدہ چیدہ لوگوں کو بلانے کے باوجود خاصی گہما گہمی ہوگئی تھی۔ ابرار عجیب حالت میں تھا۔ اسے اپنے ضمیر کے سامنے سخت شرمندگی ہورہی تھی۔ اسی شرمندگی کے باعث اس نے کسی کام میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ حاشر سے برابر رابطے میں تھا مگر وہاں مکمل خاموشی تھی۔ کبھی کبھی اسے خود پہ غصہ آنے لگتا کہ آخر اس نے فضول میں یہ جھنجھٹ کیوں مول لے لیا۔

"دیکھئے... یہاں دولہا میاں ایسے ست کاہلوں کی طرح پڑے ہوئے ہیں' ابھی تک تیار ہی نہیں ہوئے' وہاں سب مہمان آگئے..." اس کے دوست فہد اور سمیع اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اسے یونہی پڑا دیکھ کر بھنا اٹھے۔ وہ بے چارے صبح سے ہی لان کی سجاوٹ اور دیگر کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

"چلو اٹھو' تیار ہوجاؤ۔ سب مہمان آگئے... تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو۔" فہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہوجاؤں گا یار... دیر ہی کتنی لگے گی۔" وہ بیزاری سے بولا۔ دونوں نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"خیر تو ہے چندا! ایسے اہم موقع پہ ایسی بے زاری..." سمیع نے کچھ تشویش سے کہا۔

"کچھ نہیں یار... بس تھک گیا ہوں۔" وہ سنبھلا اتنے میں زیب بھائی اندر داخل ہوئے۔

"ارے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے' آغا جی رسم کا کہہ رہے ہیں۔" وہ اسے یونہی لیٹا دیکھ کر حیرت سے بولے۔

"آغا جی کو تو ہر کام کی جلدی رہتی ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔ زیب بھائی اسے گھورتے باہر چلے گئے۔

نہا کر وہ سفید کاٹن کا کلف لگا شلوار قمیص پہن کر تیار ہوگیا۔ اتنی دیر میں فہد اور سمیع خود بھی تیار ہوچکے تھے

"مانا کہ تم کلف لگے شلوار قمیص میں بہت ہینڈسم لگتے ہو مگر آج کیوں یہ ڈریس بنایا۔ کوئی فینسی ڈریس بناتے۔"

ابرار نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور برش کرنے میں ہی مصروف رہا۔ اس نے باقاعدہ تائی امی سے کہہ کر یہ ڈریس بنوایا تھا۔ اسے رنگ برنگے کڑھے ہوئے ریشمی کرتے پسند نہیں تھے۔ تائی جان نے اس کی پسند کا خیال رکھا تھا اور سفید شلوار سوٹ کے ساتھ میرون شال بنادی۔ سمیع پرفیوم اسپرے کرنے لگا۔ فہد شال لپیٹ کر اس کے گلے میں ڈالنے لگا' پھر مناسب نہیں لگا تو دونوں سرے آگے کردیئے۔ پھر ایک سرا آگے کردیا۔ سمیع اس کے بال بنانے لگا۔ کبھی سائیڈ مانگ نکالتا کبھی اسپائکس بنادیتا۔ وہ انتہائی تحمل سے دونوں کی حرکتیں برداشت کرتا رہا' پھر جب دونوں متفق ہوکر ہٹ گئے تو اس نے آئینہ دیکھا اور اپنی مرضی سے شال گلے میں ڈالی اور دونوں سرے آگے کردیئے۔ بال بھی جیسے ہمیشہ وہ رکھتا سائیڈ مانگ نکال کر بنالیے۔

"اگر خود ہی کرنا تھا تو ہمیں منع کردیتے..." فہد جل کر بولا

"میں نے سوچا' تمہارے دل میں کوئی ارمان نہ رہ جائے" اس نے اطمینان سے کہا۔

تیار ہوکر تینوں نیچے چلے آئے۔ ابرار دیگر مہمانوں سے ملنے لگا۔

"ویسے تیری منگنی ارینج ہے یا لو...؟" فہد نے پوچھا۔ سب سے ملنے کے بعد وہ ایک بار پھر ان کے نرغے میں تھا۔ دراصل ملاقات بھی کافی عرصے بعد

ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد تینوں اپنی اپنی جاب میں مصروف ہو گئے تھے۔

"ارنج۔۔۔" وہ جواب دے ہی رہا تھا کہ اس کی نظر ثمن پہ پڑی۔ زوبیہ اور رانی اسے تھام کر اسٹیج پہ لا رہے تھے۔ وہ اس قدر حسین اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی کہ ابرار کی نظروں نے پلٹنے سے انکار کر دیا۔

"اوہو! نظریں تو کچھ اور کہہ رہی ہیں تیری۔۔۔" فہد نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ سنبھل گیا۔

"مطلب بھی اب ہم بتائیں اسے۔۔۔" فہد نے سمیع کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں کو گھورا۔

"آجاؤ شہزادے! آغا جی رسم کرنے بلا رہے ہیں۔" جمال بھائی نے اس کے شانے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

"جی آرہا ہوں۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹی سہلاتے ہوئے کچھ مضطرب انداز میں کہا۔ وہ سرہلا کر چلے گئے۔

وہ اسٹیج پر آیا تو سب نے مل کر اسے ثمن کے برابر میں بٹھا دیا۔ چونکہ گھر کی بات تھی لہٰذا مشترکہ منگنی ہو رہی تھی۔

"چلو بیٹا۔۔۔ بسم اللہ کرو۔" آغا جی برابر والے صوفے پہ براجمان تھے۔ امی نے انگوٹھی کی ڈبیہ اٹھا کر اسے تھمایا۔

"آیئے آغا جی آپ۔۔۔" وہ اٹھ کر انگوٹھی انہیں دینے لگا کہ انہوں نے روک دیا۔

"ارے بیٹھو بیٹا بیٹھو۔۔۔ تم پہناؤ، ہم دیکھ رہے ہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"امی آپ۔۔۔" اس بار اس نے امی کو دینی چاہی مگر وہ ہاہاکار مچی کہ وہ جملہ مکمل نہ کر پایا۔

"شرم کرو یار! تم تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔" شہلا آپی کے شوہر حسن نے اسے لتاڑا۔

"اور ہمارا نام بھی ڈبو رہے ہو۔۔۔" فہد نے لقمہ دیا۔

اور پھر تو سب نے ہی اسے حسب توفیق شرمندہ کیا۔

"امی۔۔۔ چچی سے کہہ دیں نا۔۔۔" ثمن نے بہت آہستہ سے برابر میں بیٹھی تائی جان سے کہا تھا مگر ابرار نے اس کی سرگوشی سن لی۔

"تم کہو تو چھوٹی چچی سے پہنوا دوں۔۔۔؟" ابرار نے معنی خیزی سے جھک کر سرگوشی کی۔ اس کا اشارہ حاشر کی امی کی طرف تھا، مگر برا ہو، سب نے اسے سرگوشی کرتے دیکھ لیا۔

"اوہو۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے بھئی۔ زور سے کہو ہم نے سنا نہیں۔" چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔

"اُف۔۔۔ میں کوئی رومانٹک بات تھوڑی کر رہا ہوں۔" وہ جھنجلایا۔

"نہیں، یہ اس وقت آٹے دال کا بھاؤ پوچھ رہا ہے ثمن سے۔۔۔" جمال بھائی کی بات پہ زبردست قہقہہ پڑا۔ وہ بری طرح جھینپ گیا۔ ثمن کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کا سر مزید جھک گیا۔

"ارے یار! اب انگوٹھی پہناؤ جلدی۔۔۔" حسن بھائی نے کہا۔

"مگر میں۔۔۔" وہ پھر جھجک گیا۔ اسے حاشر کا خیال آ رہا تھا اور اس کی بات بھی یاد آ رہی تھی۔

زیب بھائی نے پیچھے سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے غائبانہ تسلی دی۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور اتنے ہی حوصلے سے اس کی جو تناؤ کی کیفیت تھی، وہ قدرے کم ہو گئی۔ وہ سر جھٹک کر انگوٹھی کی ڈبیہ کھولنے لگا۔

ثمن کا ہاتھ تھامنے پر اس نے بخوبی اس کے ہاتھوں کی لرزش محسوس کی تھی۔

"ریلیکس یار۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے انگوٹھی پہناتے ہوئے بہت دھیرے سے اسے تسلی دی۔ ثمن موقع محل بھول کر اسے بھی اسے دیکھنے لگی۔ وہ دوستانہ انداز میں مسکرا دیا۔

"ارے واہ! تم لوگ تو ایویں شور کر رہے تھے، منگنی نہیں کرنی، نکاح نہیں کرنا۔ مجھے تو دونوں ٹھیک ٹھاک راضی لگ رہے ہیں۔۔۔" سہیل بھائی نے معنی خیزی سے نظریں گھمائیں۔

"ہاں تو اب یہ میری منگیتر ہے، کوئی اعتراض۔۔۔؟" ابرار نے اپنی مخصوص بے نیازی سے کہا۔

"واہ بھئی! منگنی کرتے ہی ٹون بدل گئی۔۔۔" جمال بھائی کو اس کی پریشانیاں یاد آئیں تو وہ ہنس کر بولے۔ باقی سب بھی ہنس پڑے۔۔۔ ان میں آغا جی کی ہنسی سب سے بلند تھی۔

"اس لیے کہا تھا برخوردار! نکاح کرلو۔۔۔ اور زیادہ حق جتا سکو گے۔" آغا جی بارعب انداز میں بولے اور ان کی بات سن کر ابرار سچ کھسیا گیا۔ وہ ان کی موجودگی فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

"چلو بھئی ثمن اب تم انگوٹھی پہناؤ جلدی سے بہت ہنسی مذاق ہو گیا۔" شہلا آپی آگے بڑھیں اور ثمن کے ہاتھ میں انگوٹھی تھما دی۔ "لاؤ ابرار! ہاتھ آگے بڑھاؤ۔"

ابرار نے دونوں ہاتھ ثمن کے سامنے کر دیے۔

"یہ کیا، دس انگوٹھیاں تھوڑی ہیں۔۔۔؟" شہلا آپی نے اسے گھورا۔ ابرار نے گہری سانس لی۔

"شاباش ثمن! انگوٹھی پہناؤ۔۔۔" شہلا آپی نے جھک کر اسے کہا۔ وہ کافی نروس تھی۔ ساری لڑکیاں پیچھے اس کی ہمت بڑھانے جمع تھیں۔ اب سب اسے چھیڑ رہے تھے۔

"اوہو۔۔۔ بھئی ہمارا یار تو جیت گیا، کیا اسپیڈ میں انگوٹھی پہنائی تھی۔" سمیع نے لڑکیوں کی ٹیم کو چھیڑا۔

ثمن ابرار کا ہاتھ تھامے بغیر ہی انگوٹھی پہنانے کی کوشش کرنے لگی جبکہ ابرار نے جان بوجھ کر ہاتھ ڈھیلا چھوڑا ہوا تھا۔

"ارے بھئی۔۔۔ دوسرا ہاتھ تو استعمال کرو، وہ کس لیے ہے۔۔۔" حسن بھائی بولے۔

"وہ اپنے ہی ہاتھ کی مورل سپورٹ کے لیے ہے۔" اس کا اپنا انگوٹھی والا ہاتھ اتنا کانپ رہا تھا کہ فہد نے نکڑا لگایا اور ثمن نے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہٹا کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"بھئی، آپ لوگ انہیں پزل کر رہے ہیں۔۔۔" زوبیہ نے گھور کر فہد کو کہا۔

"ہاں۔۔۔ تو ہم یہاں کھڑے ہی اس لیے ہیں۔" وہ مزے سے بولا۔

"آپی! آپ کچھ نہ سوچیں بس جلدی سے انگوٹھی پہنا دیں۔" رانی نے بے تابی سے کہا۔

"چلو گڑیا! شاباش، انگوٹھی پہناؤ، گھبراؤ نہیں۔ چلو میں تمہارا ہاتھ پکڑ لیتی ہوں۔" شہلا آپی نے پیار سے ثمن کو حوصلہ دیا۔

"سوچ لیں۔۔۔ پھر میں آپ کا منگیتر کہلاؤں گا۔" ابرار نے شرارت سے انہیں چھیڑا۔

"ارے بھئی! ایسا ظلم مت کرنا، ہمیں اپنی بیگم بہت عزیز ہیں۔" حسن بھائی نے ہانک لگائی۔ ابرار نے سرسری نظر زیب بھائی کے چہرے پہ ڈالی، وہ سر جھکائے کھڑے تھے اور یونہی ہوتا تھا۔ شہلا آپی اور حسن بھائی کی موجودگی میں انہیں چپ سی لگ جاتی تھی، حالانکہ وہ پہلے ہی کافی کم گو تھے۔ اور اسی کیفیت سے وہ حاشر کو بچانا چاہتا تھا، اس لیے وہ اتنی مغز ماری کر رہا تھا۔ زیب بھائی کی حالت دیکھتے ہوئے اسے اپنا فیصلہ درست لگ رہا تھا۔ ابرار کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ثمن نے تیزی سے اسے انگوٹھی پہنا دی تھی۔

"واؤ۔۔۔" فہد اور سمیع نے سیٹی بجائی۔

"چلو بھئی، معرکہ سر ہوا۔" جمال بھائی نے ہاتھ جھاڑے۔ اسی وقت ابرار کے موبائل پہ بیل آئی۔ اس نے دیکھا تو حاشر کی مس بیل تھی، وہ چونک گیا۔

"کیا ہوا بھئی۔۔۔؟ کس کی بیل تھی جو یوں پریشان ہو گئے؟" چونکہ سب اس کی طرف متوجہ تھے سو اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گئے۔

"گرل فرینڈ کی۔۔۔" حسن بھائی نے نکڑا لگایا، سب ہنس پڑے۔

"آپ لوگ بھی۔۔۔" اس نے سر جھٹک کر خود کو نارمل کیا اور موبائل لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو بھئی! بہت ہنسی مذاق ہوگیا۔ اب کھانا اسٹارٹ کرو۔" تایا ابو نے سب کی بھوک چمکادی۔
ابرار کمرے میں آیا اور بار بار حاشر سے رابطے کی کوشش کرنے لگا مگر پاور آف۔۔۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔
"میں جانتا ہوں تم اس وقت کتنے ڈسٹرب ہوگئے۔ تمہارے ذہن میں ہوگا شاید میرا اور ثمن کا نکاح ہو رہا ہے۔ فار گاڈ سیک حاشر۔ پلیز میری بات تو سنو۔۔۔" وہ ٹہلتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی میسج کردیے۔
"پلیز حاشر لسن ٹو می یار! ہمارا نکاح نہیں ہوا پلان کے مطابق صرف منگنی ہوئی ہے۔۔۔"
"ٹرسٹ می حاشر۔۔۔!" مگر جواب ندارد۔
"تم ٹھیک نہیں کر رہے حاشر! دس از ناٹ فیئر۔۔۔" وہ تھک ہار کر بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ اسی وقت دوبارہ کال آنے لگی۔ اس نے چونک کر دیکھا' جمال بھائی کال کر رہے تھے۔
"کہاں غائب ہوگئے یار۔۔۔! سب تمہارا پوچھ رہے ہیں۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔
"جی آرہا ہوں۔۔۔" اس نے بیزاری سے کہہ کر فون آف کردیا اور یونہی کھڑکی میں آکر کھڑا ہوگیا۔ نیچے لان میں محفل عروج پہ تھی۔ اس کی نظر سب کا جائزہ لیتے ہوئے آخر میں اسٹیج پہ بیٹھی ثمن پہ جاکر ٹک گئی۔ وہ اس وقت خاصی مطمئن لگ رہی تھی۔ ساری لڑکیاں اس کے اردگرد موجود اسے کھانا کھلانے میں مصروف تھیں اور ہنسی مذاق بھی چل رہا تھا۔ وہ اضطراری انداز میں ایک بار پھر حاشر کا نمبر ملانے لگا۔ آخر فائنل فیصلہ کرکے نیچے آگیا۔

☼ ☼ ☼

"ابرار بھائی! آپ کو بابا جان بلا رہے ہیں۔" رانی اسے اطلاع دے کر چلی گئی۔
"جی بابا جان!"
"اکاؤنٹ میں سے روپے تم نے نکالے ہیں؟" انہوں نے اسے دیکھ کر پوچھا۔
"جی۔۔۔!" اس نے مختصراً کہا۔
"ہیں۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔؟ تمہیں اچانک اتنے روپوں کی کیا ضرورت پڑگئی؟" امی گھبرا کر بولیں۔
"امی پلیز۔۔۔ میرے سر میں درد ہے۔ ایک کپ چائے بنادیں۔" اس نے کچھ جھنجلا کر انہیں ٹالا۔ وہ گھورتے ہوئے چلی گئیں۔
"میں بھی یہی پوچھوں گا بیٹا! تمہیں اچانک اتنے روپوں کی کیا ضرورت پڑگئی۔۔۔؟" بابا جان امی کے جانے کے بعد بولے۔
"کمال ہے بابا جان! میرا اکاؤنٹ ہے' میں اس میں سے اپنی مرضی سے رقم بھی نہیں نکال سکتا؟ اگر کبھی نکالے نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی نکالوں گا بھی نہیں۔" وہ ناراضی سے بولا۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا بیٹا مگر۔۔۔" وہ کہتے کہتے خود ہی چپ ہوگئے۔
"کسی کام سے ہی لیے ہیں بابا جان! آپ کو مجھ پہ اتنا ٹرسٹ تو ہے تاکہ میں کسی بری صحبت یا برے کام میں استعمال نہیں کروں گا۔" اس نے رسان سے کہا۔
"مگر بیٹا میں آغا جان سے کیا کہوں؟" ان کے سوال پہ اس کا دل چاہا اپنا سر دیوار سے ٹکرا دے۔
"بھلا آغا جان کو یہ بات بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ پلیز بابا جان کبھی کوئی بات اپنے تک بھی رہنے دیا کریں۔ کچھ مسئلے خود بھی حل کریں۔ ضروری نہیں ہے ہر بات آغا جان تک پہنچانا۔" وہ جھلاہٹ کی انتہا پہ تھا۔
"اب میں کچھ نہیں جانتا' آغا جان کو مطمئن کرنا آپ کا کام ہے۔ میں صفائی پیش نہیں کروں گا۔ اور ہاں۔۔۔ میں آپ کو انفارم کر رہا ہوں' پندرہ بیس دن کے لیے میں اسلام آباد جا رہا ہوں' مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔ آپ امی اور آغا جان کو سنبھال لیجیے گا اور روپے کس کام کے لیے لیے تھے' یہ میں آپ کو بتادوں گا مگر فی الحال نہیں۔۔۔ اوکے۔" اسے معلوم تھا ایک وہی ہیں جو بنا بحث کیے اسے ہر کام کی اجازت دے سکتے ہیں لہٰذا اس نے انہیں اپنے ارادے کا بتادیا اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ زیادہ بحث نہیں کرسکے۔

☼ ☼ ☼

"ہاں بھئی! ہم نے سنا ہے تم اسلام آباد جا رہے ہو؟" رات کے کھانے پر آغا جی نے اس سے پوچھا تقریباً' پورا گھر ہی موجود تھا۔ وہ جز بز ہوگیا اور ناراضی سے بابا جان کو دیکھا' بھلا اتنی جلدی بتانے کی کیا ضرورت تھی' جانے سے ایک دن پہلے بتا دیتے۔
"جی۔۔۔!" اس نے مختصر جواب دیا۔
"خیریت۔۔۔؟" آغا جی کی اس کے مختصر جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔
"دوست کی شادی ہے۔" اس نے پھر مختصر کہا۔
"دوست کی شادی میں مہینہ بھر رکو گے؟" وہ حیران ہوئے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو ایک ہزار جھوٹ بولنے کے لیے تیار کیا۔
"جی' سب دوستوں کا پروگرام ہے۔ شکار کا بھی ہے اور گھومنے پھرنے کا بھی۔ سب نے بہت زور دیا ہے اور میرا اپنا بھی موڈ ہو رہا ہے۔" اس بار اس نے وضاحت سے جواب دیا۔
"تمہیں پتا ہے حماد اور شبنم آرہے ہیں۔" آغا جی نے کھانے کا اختتام کیا۔
"کب تک آئیں گے وہ۔۔۔" اس نے پوچھا۔
"ابھی فلائٹ کنفرم نہیں ہوئی مگر اس مہینے آجائیں گے۔" انہوں نے کہا۔
"تو بس پھر ٹھیک ہے۔۔۔ وہ یقیناً اتنی دور سے دو دن کے لیے تو نہیں آئیں گے' ان کے قیام کے دوران ہی میں لوٹ آؤں گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
"وہ تم سے ملنے آرہے ہیں بطور خاص۔" آغا جی نے اسے جتایا۔
"تو آغا جی! میں بھی ملنے سے انکار نہیں کر رہا۔" اس کا تحمل آخری حدوں پہ تھا۔
"ٹھیک ہے' اب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جاؤ۔ اچھا ہے ابھی گھوم پھر لو' پھر بیوی بچوں کے چکر میں لگ کر تو انسان مصروف ہوجاتا ہے۔" آغا جی اس سے ہار مانتے لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہوگئے۔
"اور ہاں آخری بات۔ بڑوں سے اجازت لی جاتی ہے' انہیں اطلاع نہیں دیتے۔" ان کا اشارہ اس کی من مانی کی طرف تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے جاتے ہی سب کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔
"یار تم اتنی بحث کیسے کرلیتے ہو آغا جی سے ہم تو ایک جملے سے زیادہ نہیں کہہ پاتے۔" جمال بھائی اس کے حوصلے پہ حیران ہوئے۔
"وہی مجبور کرتے ہیں۔" وہ چڑ کر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
اسی وقت ثمن بھی کھڑی ہوئی۔
"واؤ۔۔۔ آپ دونوں نے کیا تول کر کھانا کھایا ہے؟" رانی دونوں کو یوں ایک ساتھ اٹھتے دیکھ کر شرارت سے بولی۔ دونوں کی نظریں بے ساختہ ہی ملی تھیں۔ ثمن نظر انداز کرکے باہر نکل گئی۔ ابرار کو زیب بھائی نے مخاطب کرلیا۔ "فارغ ہوکر میرے کمرے میں آنا۔"
"جی۔۔۔ فرمایئے۔" کچھ دیر بعد ہی وہ ان کے روبرو تھا۔
"تم واقعی اسلام آباد جا رہے ہو۔۔۔؟" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔
"آپ۔۔۔!" وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"یعنی میرا اندازہ درست ہے' تم کینیڈا جا رہے ہو۔" وہ گہری سانس لے کر بولے۔
"جناب۔۔۔!" وہ انگڑائی لیتا ان کی مسہری پہ لیٹ گیا۔
"کیوں۔۔۔؟" انہوں نے ابرو اچکائے۔
"روٹھے یار کو منانے۔۔۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"ابرار! میں سنجیدہ ہوں۔" انہیں اس کی شوخی پسند نہیں آئی۔
"آئی نو۔۔۔ آپ شاذ و نادر ہی مذاق کرتے ہیں۔ ویسے بائی دا وے آپ کا کیا خیال ہے میں غیر سنجیدہ ہوں۔" وہ اسی انداز میں بولا۔
"تم صرف حاشر کا سوچ رہے ہو۔ ثمن کا بھی تو

سوچو' لڑکیوں کے جذبات نازک کانچ کے ہوتے ہیں' وہ بڑی جلدی خواب دیکھنا شروع کردیتی ہیں۔ تم سے منگنی کے بعد۔۔۔"

"کم آن زیب بھائی! آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھ سے منگنی کے بعد ثمن نے میرے نام کے خواب دیکھنے شروع کردیے ہوں گے۔" اس نے اپنا سر پیٹا۔

"یہ آپ کی خام خیالی ہے' اس کے دل و دماغ میں صرف حاشر کا بسیرا ہے' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اب یہ رشتہ ہونے۔ وہ زبردستی میرا خیال اپنے دل و دماغ میں بھرنے کی کوشش کرے۔۔۔ وہی سمجھوتہ۔ جو اکثر لڑکیاں کرتی ہیں۔" اس نے ناگواری اور تلخی سے کہا۔

"اور اگر حاشر تمہارے ساتھ نہیں آیا تو۔۔۔؟"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔ میں اسے لے کر ہی آؤں گا۔ آپ جانتے ہیں میں جو ٹھان لیتا ہوں کر کے رہتا ہوں۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"جو بھی فیصلہ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ ایسا نہ ہو بعد میں خود بھی پچھتاؤ۔ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔" انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"پچھتاووں کا میری زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں۔ میں اپنے غلط فیصلوں پہ بھی ایڈجسٹ کر لیتا ہوں۔" اس نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

"یہ سب کہنا بہت آسان ہے۔ مجھے تمہارے فیصلوں کا انجام ابھی سے نظر آرہا ہے۔" انہوں نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔۔؟" وہ الجھ کر بولا۔

"جو تم سمجھنا نہیں چاہ رہے۔ حالانکہ تم خاصے سمجھ دار ہو۔ اپنی شخصیت کا زعم اچھی چیز ہے مگر اتنا غرور ٹھیک نہیں' ورنہ بعض اوقات ایسی ٹھوکر لگتی ہے کہ انسان سنبھل ہی نہیں پاتا۔" انہوں نے جتایا۔

"پھر بھی میں آپ کی بات نہیں مان سکتا۔ مجھے افسوس ہے۔" اس نے دوٹوک کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس۔۔۔" زیب بھائی نے کہا تو ثمن چائے کا ایک کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔

"ارے بس ایک کپ؟ میرا کہاں ہے؟" ابرار حیرت سے بولا۔

"وہ۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا ناں آپ یہاں ہیں۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"ہاں۔۔۔ ورنہ تم یہاں نہیں آتیں۔۔۔ ویسے بھی تمہیں میرے علاوہ سب کی خبریں ہوتی ہیں۔" اس نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"یہ سب کیا ہے ابرار! تمہارے اس رویے کو وہ غلط معنی بھی دے سکتی ہے۔ جب تم اس سے تعلق توڑنا چاہتے ہو تو پھر؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"او گاڈ زیب بھائی! ایس بحیثیت کزن۔۔۔"

"تم سمجھتے ہونا صرف ایسا۔۔۔ جبکہ وہ لڑکی ہے۔ تم سے اس کا بہت نازک رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ ایسے میں اگر وہ ایسا سوچے تو کچھ غلط بھی نہیں ہے۔۔۔ تم نہیں جانتے لڑکیوں کے خوابوں کو۔۔۔ ایسا نہ ہو وہ تم سے امید باندھ لے۔" انہوں نے رسان سے اسے سمجھایا۔

"آپ بھی میرا مقصد نہیں سمجھ رہے۔ مجھے دیکھ کر جو اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگ جاتی ہیں' وہ ڈسٹرب ہو جاتی ہے' اس کی ہنسی غائب ہو جاتی ہے۔ میں یہ سب نارمل کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ بہت افسوس کا مقام ہے کہ آپ کی شخصیت کسی کے لیے یوں اذیت کا باعث بنے۔ میں اس کی خوشیاں قائم رکھنا چاہتا ہوں۔" وہ گہری سانس لے کر وضاحت سے بولا۔ "خیر۔۔۔ میں آپ کی بات پہ عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور ثمن سے مذاق تو چھوڑ' اسے مخاطب بھی نہیں کروں گا اوکے؟" اس نے انہیں تسلی دی۔

"اب میں کیا کہوں؟" وہ بڑبڑائے۔

"چلیں آپ ریسٹ کریں۔۔۔ بہت دماغ کھالیا میں

ے آپ کا۔ وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

سارے انتظامات کرنے اور ویزا حاصل کرنے میں اسے ایک ماہ لگ گیا تھا۔ زیب بھائی اسے ایئرپورٹ چھوڑنے آئے تھے' باقی لوگوں سے اس نے بمشکل پیچھا چھڑایا تھا۔

کینیڈا پہنچ کر حاشر کا فلیٹ تلاش کرنے میں اسے بہت زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بغیر اطلاع کے آیا تھا۔ نئی جگہ' نیا ماحول' نئے لوگ۔۔۔ وہ اچھا خاصا خوار ہو گیا' مگر سوائے حاشر کو کوسنے کے اور کچھ نہیں کر سکا۔ وہ تو بھلا ہو اس کے پاس اس کا ایڈریس تھا۔ وہ پہنچ ہی گیا' مگر دروازہ مقفل تھا۔ پل بھر کو اسے خیال آیا کہیں وہ واقعی شفٹ نہ کر گیا ہو۔ کچھ سوچ کر اس نے برابر والا دروازہ کھٹکھٹایا' کسی بزرگ نے دروازہ کھولا۔

"یس۔۔۔؟" وہ اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولے۔

"مسٹر علی حاشر یہیں رہتے ہیں؟" اس نے حاشر کے دروازے کی سمت اشارہ کر کے انگریزی میں پوچھا۔

"جی مگر وہ تو رات کو ہی آتے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ۔۔۔" ابرار پریشان ہوا کہ اب رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔

"اگر آپ چاہیں تو اندر آجائیں' ان کا انتظار کر لیں۔" انہوں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی' مگر ابرار کو مناسب نہیں لگا۔ اس نے معذرت کر لی۔

"اوکے۔۔۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" انہوں نے سر ہلایا اور اندر چلے گئے۔

وہ کچھ دیر تک ٹہلتا رہا' پھر تھک کر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں حاشر کو ڈھیر ساری گالیاں دیں۔

رات کو کافی دیر سے حاشر آیا۔ ابرار کو کینیڈا میں اپنے فلیٹ کے سامنے دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی تھی۔ کافی دیر تک تو وہ کچھ بول ہی نہیں پایا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گیا۔ کافی دیر تک دونوں یوں ہی کھڑے رہے' پھر ابرار نے ہی اسے الگ کیا۔ حاشر نے دروازہ کھولا اور اس کا بیگ اٹھالیا۔ ابرار مسکرا کر اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

اس نے ایک طائرانہ نظر فلیٹ پر ڈالی۔ پورا فلیٹ ہی ابتری کا شکار تھا۔ ابرار کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کتنا نفاست پسند تھا۔ کپڑے' تولیہ' کتابیں' گلاس' ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ ابرار کو جائزہ لیتے دیکھ کر حاشر کو شرمندگی ہوئی۔ اس نے فریج سے تیار شدہ کباب اور سینڈوچ نکال کر اوون میں گرم کیے' ساتھ ہی دو کپ کافی بنا کر ابرار کے سامنے رکھی۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ سرسری سی رسمی باتیں ہوئیں۔ پھر دونوں ہی سونے کے لیے اٹھ گئے۔ ابرار سوچ رہا تھا تسلی سے بات کرے گا۔ ابھی حاشر کو ریلیکس ہونے دیا جائے۔

صبح اٹھ کر حاشر نے ناشتا بنایا۔ ناشتا کرتے ہوئے ابرار نے بات شروع کی تو حاشر نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"فریج میں سب کچھ رکھا ہے۔ جو کھانا چاہو' اوون میں گرم کر لینا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ابرار اسے دیکھ کر رہ گیا۔ حاشر اسے خدا حافظ کہتا ہوا آفس چلا گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح بیٹھا رہ گیا۔

ناشتا کر کے اس نے سارے گھر کی صفائی کر ڈالی۔

رات کو حاشر آیا تو فلیٹ کی سدھری ہوئی حالت دیکھ کر شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

"لگتا ہے شادی کر لی۔ لڑکیوں والے گن آگئے سارے۔" تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے فلیٹ کی صفائی پر طنز کیا تھا۔

"تمہیں روگ نہیں لگتا تو تمہیں بھی یہ سارے گن آتے تھے۔" اس نے بھی جوابی وار کیا۔

"الحمد اللہ! مجھے کوئی روگ نہیں لگا ہوا۔ میں شروع سے ایسا ہی رہتا ہوں۔ تم نے نیا نیا دیکھا ہے اس لیے تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔" وہ بھنویں اچکا کر اطمینان سے بولا۔

"اتفاق سے تمہارے مقابل ابرار موجود ہے' جو تم سے اور تمہاری صفائی پسند طبیعت سے بچپن سے ہی اچھی طرح واقف ہے۔" ابرار نے کھانے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے رکھی۔ حاشر محض شانے اچکا کر رہ گیا گویا جو سمجھتے ہو' سمجھتے رہو۔

"یہ اتنے سینڈوچ کس لیے بنائے ہیں' وہ حیرت سے بولا۔

"ہم دونوں کے لیے۔ میں دوپہر سے بھوکا ہوں۔ تم کو تو اتنا خیال نہیں آیا کہ گھر آئے مہمان کی کچھ خاطر کر لو۔" ابرار نے اسے شرم دلانی چاہی۔

"بن بلائے مہمان کی میں کچھ خاص خاطر نہیں کرتا۔" اس نے اطمینان سے کہا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"پھر تم نے کیا سوچا۔۔۔؟" ابرار نے حاشر سے پوچھا۔

"کس بارے میں۔۔۔؟" حاشر نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"دیکھو۔۔۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں جھک مارنے نہیں آیا۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ سارے معاملات کلیئر کرو اور چلو پاکستان۔

میرا دماغ مت خراب کرو۔" اس کے یوں انجان بننے پہ اسے غصہ آگیا۔

"مجھے تمہارا دماغ آل ریڈی خراب لگ رہا ہے۔ تھکن ہو رہی ہو گی' سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے گڈ نائٹ۔" وہ آرام سے کہتا صوفے پہ لیٹ گیا۔

"اچھا وہاں کیوں سو رہے ہو۔ مسہری پہ لیٹو۔" ابرار نے بہت ضبط سے اس کی بات برداشت کی۔

"نہیں تم سو جاؤ۔۔۔ میرے مہمان ہو۔ اتنا تو ڈیزرو کرتے ہو' پھر جا کر شکایت کرتے پھرو گے' حاشر نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔" وہ شرارت سے بولا۔

"نہیں تم ادھر آکر سوؤ۔۔۔ میں تمہاری جگہ پہ قبضہ کرنے نہیں آیا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"وہ تو تم پہلے ہی کر چکے ہو۔" حاشر معنی خیزی سے بولا۔ ابرار کا تکیہ اٹھاتا ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔

اسے مذاق میں بھی حاشر سے اس بات کی امید نہیں تھی وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا اور وہ۔۔۔

حاشر ابرار کے جوابی وار کے انتظار میں تھا' تھوڑی دیر تک جواب نہیں آیا تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور چونک گیا۔۔۔ یہ کہاں گیا' وہ تیزی سے اٹھ کر باہر آیا۔

"کیا ہوا ابرار!" وہ اسے کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھ کر محتاط انداز میں بولا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ نیند نہیں آرہی' تم سو جاؤ۔۔۔" وہ سپاٹ انداز میں بولا۔

"تم نے شاید میری بات کا برا مان لیا۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ پھر بھی تمہیں برا لگا ہو تو سوری۔۔۔ رئیلی سوری۔۔۔" وہ شرمندگی سے بولا۔ ابرار نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں تم سے کہہ رہا ہوں ابرار۔۔۔" حاشر نے جھلا کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"ہاں سن لیا۔ ٹھیک ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس طرح تو نہیں کرو ابرار۔۔۔ دیکھو میں تمہارے آنے سے کتنا خوش تھا۔ کتنے عرصے بعد مجھے میرا کوئی اپنا نظر آیا۔۔۔ ورنہ یہاں کوئی انتظار کرنے والا ہے' نہ کوئی جواب طلبی کرنے والا۔ یہاں رہ کر انسان خود بخود مشین بن جاتا ہے۔ کتنے بیمار ہو آپ' کتنے تھکے ہوئے ہو۔ آکر اپنا کھانا خود ہی بنانا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر کھانا بھی اکیلے ہے کوئی آپ کے منہ میں نوالے نہیں ڈالے گا۔ کوئی آپ کی ایک آواز پہ آپ کے سامنے چائے نہیں لائے گا۔۔۔ ہمارا پاکستان کتنا اچھا ہے ناں ابرار' وہاں کے رشتے' وہاں کے رسم و رواج وہاں کا رہن سہن۔۔۔ ہماری ماں ہو' بہن ہو' بیوی ہو یا بیٹی یہ تمام رشتے ہمارے پاس ہوتے ہیں اور ہم نا شکرے لوگ۔۔۔"

عجیب یاسیت اتر آئی اس کے لہجے میں۔ وہ ان دو سالوں میں ہی تھکن کا شکار ہو گیا تھا۔ بھرے پرے خاندان سے آیا تھا۔ تنہائیاں اسے ڈسنے لگی تھیں۔

"تو پھر اتنا سوچ کیا رہے ہو۔ چلو پاکستان۔" ابرار نے پورے خلوص سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ اس کی اتنی اداسی پہ وہ اپنی ساری ناراضی بھول گیا تھا۔ حاشر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں' آؤں گا مگر فی الحال نہیں۔" وہ گویا کسی ٹرانس سے باہر آیا تھا دھیرے سے ہاتھ چھڑا کر بولا۔

"نہیں حاشر۔۔۔ خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو میں تمہیں لینے آیا ہوں اور تمہیں لے کر ہی جاؤں گا۔ میرے ساتھ چلو' ثمن تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" اس نے پورے یقین سے کہا اس کی ابھی کی کیفیت دیکھ کر تو ابرار کا ارادہ اور پختہ ہو گیا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔

"چلو' چل کر سوتے ہیں۔"

ابرار نے مایوسی سے اسے دیکھا اور ایک دم چونکا۔

"ارے میں تمہارے لیے ایک زبردست سی چیز لایا تھا۔" وہ تیزی سے اپنے بیگ کی طرف بڑھا اور اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ حاشر کے چہرے پر بھی تجسس ابھر آیا۔

"یہ دیکھو۔۔۔!" اس نے ثمن کی منگنی کی سنگل تصویر نکال کر ایک دم اس کے سامنے کر دی۔ اس کی نظریں پلٹنا بھول گئیں۔ ابرار مسکرا دیا۔ خود وہ بھی پہلی بار اسے اس روپ میں دیکھ کر ایسے ہی چونکا تھا جبکہ حاشر کا تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ فیروزی اور گلابی سوٹ اس کا سجا سنورا روپ اور جھکی نظریں۔ وہ واقعی بہت دلفریب لگ رہی تھی۔

ابرار نے ہلکے سے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔

وہ نظریں چراتا سرسری انداز میں رخ موڑ گیا۔

ابرار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"میں تم سے واضح کہہ رہا ہوں' جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔۔۔ بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم احمقوں کی طرح پلاننگ کر کے بیٹھ گئے تھے۔۔۔ بچپن سے ہی ساتھ رہے تو وہ مجھے تھوڑی پسند تھی وٹس اٹ۔۔۔ مگر ایسا حال نہیں کہ میں اس کے روگ میں جوگ لے لوں گا۔" اس نے ابرار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے ہوئے خود کو انتہائی نارمل ظاہر کیا۔

"فضول میں نکاح رکوانے کے لیے اتنی محنت کی۔۔۔ اگر ہو جاتا تو ساری بات ہی ختم ہو جاتی۔ مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا' میری مانو منگنی مت توڑو۔ سب بھول جاؤ۔ میرے خیال میں تم ثمن کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کی ابتدا کر سکتے ہو۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔" اس نے بہت پیار اور نرمی سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ابرار نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"ناراض کیوں ہو رہے ہو۔۔۔ یقین مانو دو سال سے اسے نہیں دیکھا اب تو میں اس کا فیس بھی بھول گیا ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولا ابرار نے ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ حاشر کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"گوڈو ہیل۔۔۔" ابرار سچ مچ اس پر لعنت بھیج کر مسہری پہ اوندھا لیٹ گیا۔

"اف۔۔۔ غصہ! مجھے یقین نہیں آرہا' میں اس بندے کو زچ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو ہر کسی کو زچ کیے رکھتا ہے۔" حاشر مسکرا کر بولا۔ ابرار نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ابرار نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حاشر کے جاتے ہی اس کے پاسپورٹ کی تلاش شروع کر دی۔۔۔ پاسپورٹ تو مل گیا' مگر اسے وہاں کے راستوں کا علم نہیں تھا اور حاشر سے وہ مدد لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے

حاشر کے پڑوسی سے مدد لینے کی ٹھانی۔
شام کو وہ تھکا ہارا گھر لوٹا تو حاشر اس کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔
"کہاں غائب ہو گئے تھے یار! میں تو پریشان ہو گیا تھا۔" وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔
"میں نے کہاں جانا ہے۔ آؤٹنگ پہ نکل گیا تھا۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔
"نہیں میرا مطلب تھا ابھی تمہیں یہاں کے راستوں کا اتنا علم نہیں تو اکیلے۔"
"کم آن یار۔۔۔ اب تمہارے انتظار میں میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تو بیٹھ نہیں سکتا اور دوسری بات جب تم یہاں نئے آئے تھے تو تمہیں علم تھا یہاں کے راستوں کا؟" وہ اس کی بات کاٹ کر اکتاہٹ سے بولا حاشر لاجواب ہو گیا۔
"اچھا چلو، تمہیں کسی اچھی جگہ سے ڈنر کرواتا ہوں۔" حاشر ایک دم کھڑا ہو گیا اور ابرار نے بھی دیر نہیں کی۔

☼ ☼ ☼
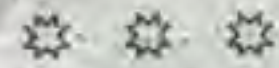
رات کا کوئی پہر تھا کہ اچانک ابرار کی آنکھ کھلی اس نے ٹائم دیکھا، تین بج رہے تھے۔ پتا نہیں کیا احساس تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا تو چونک گیا۔ حاشر نہیں تھا۔ یہ اس وقت کہاں گیا؟ وہ سوچتے ہوئے آہستہ سے اٹھا اور باہر آیا۔ حاشر کھڑکی میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور ساکت رہ گیا۔
حاشر کے ہاتھ میں ثمن کی تصویر تھی اور وہ بے دھیانی میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ ابرار کا دل چاہا اس کا بھرم نہ توڑے اور خاموشی سے پلٹ جائے مگر اسے جھکانے کا اس سے بہتر موقع اسے کبھی نہیں ملتا۔ اس وقت اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہوتا ورنہ اسے اس کی ضد سے ہٹانا ابرار کو خاصا مشکل لگ رہا تھا۔
ابرار نے آہستہ سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ اس بری طرح چونکا کہ تصویر اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ابرار کو دیکھنے لگا۔ ابرار نے جھک کر تصویر اٹھاتے ہوئے قدرے تاخیر کی اور اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ اس کا چہرہ یونہی فق تھا۔ ابرار نے تصویر اس کے ہاتھ میں تھمائی اور بہت اطمینان سے کہا۔
"ابھی تک سوئے نہیں۔ صبح کام پہ نہیں جانا۔" وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف بڑھا۔
حاشر کی نظریں جھک گئیں۔ وہ واقعی کچھ کہنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ فوری طور پہ وہ کوئی بہانہ بھی نہیں بنا پایا اور خاموشی سے جا کر مسہری پہ لیٹ گیا۔ ابرار بھی اس کے برابر میں لیٹ گیا۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے مگر دونوں ہی جانتے تھے ان کی سوچیں بھٹکی ہوئی ہیں۔
"تم جانتے ہو، ثمن کی حالت بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد ابرار کے لب ہلے وہ چت لیٹا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے۔ البتہ آنکھیں بند تھیں۔ حاشر نے چونک کر اسے دیکھا وہ بھی اسی کے انداز میں لیٹا ہوا تھا مگر اس کی نظریں ابرار پہ جمی تھیں۔ ابرار نے اس کا چونکنا محسوس کر لیا مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔
"ثمن بھی تم میں انوالو ہے۔ تم نے کبھی محسوس تو کیا ہو گا؟ یا اس کے دل کی حالت جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔" ابرار یوں بڑبڑایا گویا خود سے باتیں کر رہا ہو۔
"پتا نہیں، ہمارے درمیان کبھی ایسی بات ہی نہیں ہوئی اور نہ ہی ثمن نے اپنی فیلنگز ظاہر کیں۔" بے اختیار حاشر نے کہا۔ ابرار دھیرے سے مسکرایا گویا وہ حاشر کا خول چٹخانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
"منگنی کے بعد اس کی جو حالت ہو گئی ہے وہ تو ایک اندھا بھی جان لے کہ وہ اس رشتے سے خوش نہیں۔" ابرار نے دھیرے سے کہا۔
"کیا مطلب؟" سب حاشر نے بے ساختہ پوچھا۔
"مطلب یہ کہ اس کے چہرے کی شادابی ختم ہو گئی ہے۔ وہاں لالی کی جگہ زردیاں کھنڈ رہی ہیں۔ ہنستا اور

کھلکھلاتا تو دور، وہ مسکرانا بھی بھول گئی ہے۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ وہ تمہیں مس کر رہی ہے یار!" اس نے کچھ باتیں اپنی طرف سے جمع کرتے ہوئے آخری جملہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھ کر کہا۔
"تم سچ کہہ رہے ہو؟" حاشر کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ابرار تم۔۔۔ تم ہرٹ تو نہیں ہوئے اس کی کنڈیشن پہ آئی مین۔۔۔" وہ بولتے ہوئے جھجکا۔
"یعنی تمہارا مطلب ہے۔ وہ تمہیں یاد کر رہی ہے تو میں ہرٹ ہوں گا؟ بھائی! میں نے اس سے کوئی توقعات نہیں باندھیں کہ وہ مجھے دیکھ کر شرمائے، گھبرائے۔ یہ سب کھڑاگ میں نے تم لوگوں کو ملانے کے لیے پالا ہے، ورنہ میرا اپنا اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔" اس نے سرپیٹ کر اسے یقین دلایا۔
"تم۔۔۔ تم بہت اچھے ہو ابرار!" حاشر ایک دم اس کے گلے لگ گیا۔ ابرار گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ یہ معرکہ سر کرنے جا رہے تھے ہمیں خبر ہی نہیں۔" جمال بھائی حاشر سے گلے ملنے کے بعد ابرار سے مخاطب ہوئے۔ وہ مسکرا دیا۔
گھر میں زیب بھائی نے سب کو بتا دیا تھا، سو ایک خوشگوار ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چچی اور زوبیہ تو حاشر سے مل کر خوب روئیں، چچا احتجاجاً غائب تھے۔
"چچی جان! اس کا تمہیں میرا شکریہ ادا کریں کہ میں اس کو لے آیا دو سال میں ہی، ورنہ تو اس نے بیس سال بعد بھی نہیں آنا تھا۔" ابرار مزے سے بولا۔
"ارے بیٹا! تمہارا شکریہ تو ادا کر ہی نہیں سکتی۔ اتنا عرصہ تم نے ہی حوصلہ دیا کہ حاشر آ جائے گا۔ تم تو میرے بہت اچھے بیٹے ہو میرے دل کی ٹھنڈک۔" ان کی جھلملاتی آنکھوں میں ممتا کی چمک تھی انہوں نے آگے بڑھ کر ابرار کی پیشانی چوم لی۔
"میرے جاتے ہی زیادہ ویلیو نہیں بن گئی تمہاری۔" وہ مسکرا کر بولا۔
فکر مت کرو، کچھ دن میں ویلیو ڈاؤن ہونے والی ہے۔"
ابرار نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور آغا جی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔
"السلام و علیکم آغا جان!" ابرار نے ذرا جوش سے سلام کیا اس کے پیچھے حاشر نے بھی منمناتا سلام کر دیا۔
"وعلیکم السلام!" انہوں نے دونوں پہ سرسری نظر ڈال کر جواب دیا اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابرار تو اطمینان سے ان کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔
"تمہیں جھوٹ بول کر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا کیا خیال تھا، ہم انکار کر دیتے؟ حالانکہ تم نے ہمارے انکار کو کیا اہمیت دینی تھی۔" آغا جی فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کچھ برہمی سے بولے۔ اسے شرمندگی تو ہوئی مگر اس نے ظاہر نہیں کی۔
"مجبوری تھی آغا جان۔۔۔ ورنہ میں ایسا کرتا۔" وہ پہلے ہی اس سوال کے لیے تیار تھا، اطمینان سے بولا۔
ایسی کیا مجبوری تھی کہ تمہیں جھوٹ بولنا پڑا۔
"جانتا ہوں۔۔۔ جھوٹ جھوٹ ہے چاہے مجبوری میں ہو یا مذاق میں۔۔۔ مگر ایک چھوٹی بات یہ تھی کہ میں خود بتا کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ پھر چچا، چچی، زوبیہ بلکہ پورے گھر کو آس بندھ جاتی اور میں خود بھی کنفرم نہیں تھا کہ حاشر میرے ساتھ آئے گا بھی یا نہیں۔ اگر وہ نہیں آتا تو سب کی آس ٹوٹ جاتی اور چچا چچی بہت دکھی ہو جاتے۔ تو بس اتنی وجہ تھی۔"
حاشر نے بہت رشک سے اس کے اعتماد کو دیکھا، کس طرح اس نے اپنی غلطی کو اپنے حق میں ہموار کیا تھا۔ وہ واقعی جادوگر تھا۔ آغا جی اس کے شانوں پہ تھپکی دے رہے تھے۔ ابرار نے ہلکے سے بت بنے حاشر کو اشارہ کیا تو وہ ہوش میں آیا اور ہمت کر کے آغا جی کے

دائیں طرف بیٹھ گیا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے آغاجی؟" وہ آہستہ سے بولا۔ ابرار کو ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر گیا۔

"ہوں..... بہتر ہے۔" انہوں نے مبہم انداز میں کہا۔ ابرار نے پھر آنکھ سے اشارہ کیا۔

"وہ آغاجی! میں..... آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے بہت غلط حرکت کی تھی اور بدتمیزی بھی کی تھی..... مجھے بہت شرمندگی ہے۔" وہ سر جھکا کر روانی سے بولا۔

"چلو، اتنا بہت ہے، تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اپنے ماں باپ سے معافی مانگو۔" انہوں نے اس کے شانے پہ بھی تھپکی دی۔ اس کی جان میں جان آئی۔

"آپ مجھ سے خفا تو نہیں؟" اس نے شرمندگی سے پوچھا۔

"نہیں..... بڑے کبھی اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتے، بس وہ جو مان ہوتا ہے ناں، وہ ٹوٹ جائے تو دکھ ہوتا ہے۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"ویسے اگر اب ہم تمہارا رشتہ کہیں جوڑنا چاہیں تو تم بھاگو گے تو نہیں۔" انہوں نے قدرے مسکرا کر سرسری انداز میں کہا۔ دونوں کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"بالکل، بالکل! اب یہ بھاگ کر تو دیکھے۔ اس کی یہ مجال" ابرار کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا ساتھ ہی اس نے حاشر کو بھی اٹھنے کا اشارہ کر دیا، اور آغاجی سے اجازت لے کر باہر آ گیا۔

"اوہ گاڈ..... تم نے سنا آغاجی کیا کہہ رہے تھے۔" حاشر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر تقریباً "جھول ہی گیا" اس کے اس انداز پہ ابرار گرتے گرتے بچا۔

"ہاں سن لیا اور تم بھی ایسے موقع پہ اپنے حواس مت کھویا کرو۔" اس نے جھنجلا کر حاشر کے ہاتھ جھٹکے۔

"کچھ کرو ابرار! کچھ کرو..... اب خاندان میں کون سی لڑکی بچی ہے، جس کے پلے آغاجی مجھے باندھ سکتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے اچھل پڑا۔ "رانی۔"

ابرار تلملا کر مڑا اور اس کا کان پکڑ لیا۔ "تمہیں میری بہن ہی ملی تھی۔"

"یار! آغاجی کی نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ زریں آپی جمال بھائی کے ساتھ اور ثمن تمہارے ساتھ انگیج ہیں، زوبیہ میری ہی بہن، پھر رانی ہی بچی ناں۔" اس نے وضاحت کی۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ اگر آغاجان کے ذہن میں یہ بات آ گئی تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔" ابرار سنجیدگی سے بولا۔

"تو..... تو پھر تم جلدی سے یہ منگنی توڑ دو۔" حاشر بے چینی سے بولا۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ دراصل میں یہ چاہ رہا تھا کہ کچھ دن گزر جائیں تاکہ تمہارے آنے کو منگنی ٹوٹنے سے ریلیٹڈ نہ کیا جائے مگر اب....." وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"پہلے میں سوچ رہا ہوں، امی سے بات کر لوں کہ میں نے رانی کے لیے ایک لڑکا دیکھا ہے تاکہ وہ فوری طور پر آغاجی کو ہاں نہ کہہ دیں۔ ٹھیک ہے ناں؟" ابرار نے کہا۔

"کون سا لڑکا؟" حاشر ہونق پن سے بولا۔

"یہ لڑکا....." اس نے دانت پیس کر حاشر کی ہی سمت اشارہ کیا۔

"ابے گھامڑ! میں ایک فرضی لڑکے کی بات کر رہا ہوں۔" وہ جل کر بولا۔

"او..... اچھا۔" حاشر شرمندہ ہو گیا اس کی بات سمجھ کر۔

چلو پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن اس نے امی سے بات کر لی کہ وہ رانی کے لیے ایک فیملی کو نظر میں رکھے ہوئے ہے

"مگر میں تو چاہ رہی تھی کہ حاشر اور رانی....."

"کیا! وہ ایک جھٹکے سے پلٹا۔" اس بارے میں سوچیے گا بھی نہیں۔"

"مگر کیوں؟ حاشر اچھا لڑکا ہے۔ خاندان کا دیکھا بھالا پھر تمہاری دوستی بھی ہے۔" انہوں نے اسے قائل کرنا چاہا۔

"امی..... امی! آپ سے یہ سب کس نے کہا۔" وہ سب مچلتے ہوئے بولا "آغاجی نے؟"

"نہیں یہ تو میرا اپنا خیال تھا۔" وہ کچھ مایوسی سے بولیں۔ ابرار کی جان میں جان آئی۔

"بس پھر اپنے خیال کو اپنے تک محدود رکھیں۔ حاشر کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ اس کا خیال ذہن سے نکال دیں اور خاندان سے باہر بھی بہت وسیع دنیا ہے۔ صرف ہمارے خاندان میں ہی اچھے لوگ نہیں بستے۔" وہ رکھائی سے بولا۔ ثمن چائے بنا رہی تھی حاشر چلا آیا۔

"ایک کپ چائے مل جائے گی؟" وہ کچن کے دروازے پہ کھڑا ہو گیا، ثمن نے پانی میں ایک کپ کا اضافہ کر دیا۔

"تم اتنی سنجیدہ اور کم گو کیوں ہو گئی ہو۔ پہلے تو ایسی نہیں تھیں؟" حاشر نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں شروع سے ہی ایسی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے اس پہ ایک نظر ڈال کر بولی۔ وہ کھسیا گیا۔ اسی دم ابرار نے کھنکھار کر حاشر کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔

"تم ضرور بیچ میں ٹپکنا۔"

"مائنڈ اٹ..... بیچ میں، میں نہیں تم ٹپکے ہو۔" وہ معنی خیزی سے بولا اور ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔

"ایک کپ چائے مل جائے گی؟" چائے بن چکی تھی۔ وہ کپوں میں نکال رہی تھی۔ اس نے ایک نظر ابرار کو دیکھا، پھر دونوں کو ایک ایک کپ تھما کر سائیڈ سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

کئی دن اسی ادھیڑبن میں گزرے کہ آخر وہ کس چیز کو مسئلہ بنا کر یہ منگنی توڑے۔ مگر کوئی لائحہ عمل ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ حاشر کی وجہ سے وہ خاصا محتاط ہو چکا تھا۔ کوئی اس کو ثمن کے حوالے سے چھیڑتا بھی تو وہ ایک دم سنجیدہ رہتا، ورنہ پہلے تو وہ خود بھی کوئی شوخ سا جواب دے کر انجوائے کر لیتا تھا۔

اب بھی وہ کمپیوٹر پہ بزی تھا مگر اس کا سارا دھیان اسی کشمکش میں تھا، منگنی کیسے توڑے۔ آج ہی حاشر سے اس کی پھر بحث ہوئی تھی۔ وہ کچھ دن میں ہی اکتا گیا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی مجھے تو نہیں لگتا ثمن مجھ میں انوالو ہے۔ تم نے ناحق زحمت کی..... وہ مایوس ہو رہا تھا۔

اتنے میں ثمن دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئی چونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس نے کھٹکھٹایا نہیں۔

"ارے آپ نے کیوں زحمت کی، رانی سے کہہ دیتیں۔" ابرار نے اسے دیکھ کر بہت فارمل انداز میں کہا۔

"چچی جان نے بھیجا تھا۔" اس نے صفائی دینا ضروری سمجھا کہ وہ خود نہیں آئی۔ وہ مسکرا دیا۔

"ثمن! ایک بات پوچھوں؟" وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"تمہیں حاشر کیسا لگتا ہے؟" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ سوال کا مقصد تو سمجھ میں نہیں آیا مگر اس نے جواب دے دیا۔ "اچھے انسان ہیں۔"

"میرا اور حاشر کا موازنہ کیا جائے تو کون بہترین ہے۔" ابرار سنجیدگی سے بولا۔

"یہ آپ کس قسم کے سوال پوچھ رہے ہیں؟" وہ الجھ کر بولی۔

"تم جواب تو دو....." اس نے کچھ لمحے سوچا پھر کہا۔

"حاشر....." ابرار کو امید نہیں تھی۔ وہ اتنی صاف گوئی کا مظاہرہ کرے گی۔ حالانکہ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ اس جیسی لڑکی کبھی منگیتر کے سامنے اتنی

صاف گوئی سے منگیتر کا نام نہیں لے سکتی۔
"گڈ۔۔۔ اچھی لگی تمہاری صاف گوئی۔ اب یہ لو اس کا انعام۔" ابرار نے کہنے کے ساتھ ہی دراز سے انگوٹھی نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دی۔
"یہ کیا؟" وہ شاکڈ رہ گئی۔
"انگوٹھی ہے بھئی۔۔۔ میری طرف سے اجازت ہے، تم حاشر سے شادی کر سکتی ہو۔" اس نے بہت اطمینان سے کہا۔
"یہ کیا فضول بکواس ہے۔ آپ مجھے بلیم کر رہے ہیں؟" وہ ایک دم بھڑک گئی۔
"ارے کوئی بلیم نہیں۔۔۔ منگنی میں توڑ ہی رہا تھا۔ تمہارے جواب نے مشکل آسان کر دی۔"
"یعنی آپ میرے کندھے پہ بندوق رکھنا چاہ رہے ہیں۔۔۔" وہ سلگ کر بولی۔
"اونہہ۔۔۔ کوئی کندھا وندھا نہیں ہے۔۔۔ بے فکر رہو میں کسی سے یہ نہیں کہوں گا کہ ثمن حاشر کو پسند کرتی ہے اس لیے میں نے منگنی توڑ دی۔" وہ دل جلانے والے انداز میں بولا اور ثمن ایک دفعہ پھر بھڑک اٹھی۔ وہ بہت دامن بچا کر چلنے والی لڑکی تھی۔
"آپ کو جو کرنا ہے کر لیجیے گا۔۔۔ مگر یہ منگنی بڑوں نے کی تھی لہٰذا آپ یہ انگوٹھی بھی انہیں ہی دیں۔" اس نے زور سے انگوٹھی ٹیبل پہ پھینکی اور پاؤں پٹخ کر باہر نکل گئی۔
اسی وقت امی اندر داخل ہوئیں۔ "یہ ثمن کو کیا ہوا اتنے غصے میں کیوں تھی؟" وہ حیرت سے بولیں۔ ابرار نے شانے اچکا کر لاعلمی ظاہر کی۔
"ٹھیک سے بتاؤ۔۔۔ تم نے ہی کچھ کہا ہو گا۔" وہ مشکوک انداز میں اسے دیکھ کر بولیں۔
"ہاں، سارے قصور میرے ہی کھاتے میں نکلتے ہیں۔" اسے پتا نہیں کیوں غصہ آ گیا۔
"کیونکہ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کی صلح جو لڑکی ہے۔" انہوں نے کہا۔
"پتا نہیں یہ ساری خوبیاں مجھے کیوں نظر نہیں آتیں۔ مجھے تو وہ نخریلی، بدتمیز، گھمنڈی لڑکی لگی۔" وہ ابھی تک اس کے سامنے بدتمیزی سے انگوٹھی پھینک کے جانے پہ سلگ رہا تھا۔
"پھر تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" امی نے اس انداز میں کہا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔
"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا۔
"مجھے بھی تم سے ایک بات کرنی ہے۔" انہوں نے بھی فوراً کہا۔
"تو پھر پہلے آپ کریں۔۔۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر مسہری پہ بیٹھ گیا۔
"ثمن کا آخری سمسٹر ہے اور تم بھی اپنے پیروں پہ کھڑے ہو۔ میں چاہ رہی تھی کہ جلدی سے اپنے اس اکھڑ، خود سر، ضدی بیٹے کے سر پر سہرا سجا دوں۔" وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ کر بولیں۔
"یہ آپ نے میری تعریف کی ہے؟" وہ ہنس پڑا۔
"ویسے آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔ میں کم از کم دو تین سال سے پہلے تو ایسا نہیں کرنے والا۔۔۔ یوں بھی میں خود آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں یہ منگنی توڑنا چاہتا ہوں۔ میں ثمن کی طرف سے مطمئن نہیں وہ میرے معیار پہ پوری نہیں اتر رہی۔"
اس نے سرسری انداز میں کہا جیسے کوئی عام سی بات ہو۔ ان کا منہ کھل گیا اور دونوں ہاتھ سینے پہ جا پڑے۔
"ابرار! کیسی کیسی بدفالیں منہ سے نکالتا ہے تو۔" وہ دہل کر بولیں۔
"سچ کہہ رہا ہوں امی! ثمن بھی اس رشتے سے خوش نہیں لگتی۔ ساری زندگی کی خواری سے اچھا ہے، یہ دو دن کی خواری برداشت کر لیں۔" اس کا انداز ہنوز وہی تھا۔
"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ ہم تمہاری ہر بات مانتے ہیں تو تم ہمیں اس کا یہ صلہ دو گے۔ یوں ہمیں ذلیل و رسوا کرو گے۔ ایسا ہی تھا تو پہلے ہاں نہیں کہنا

تھا۔ اب تمہیں وہ اپنے معیار کی نہیں لگتی۔ مت لو یوں کسی بچی کی بددعا۔ اب اس میں تمہیں عیب نظر آ رہے ہیں۔۔۔" وہ رونے لگیں۔
"میں کوئی عیب نہیں نکال رہا۔۔۔ وہ بلاشبہ بہت اچھی ہے مگر۔۔۔ اور نہ ہی مجھے کوئی بددعا دے گی بلکہ وہ بھی پرسکون ہو جائے گی۔۔۔ اور پلیز آپ روئیں تو نہیں میں اتنی آرام سے بات کر رہا ہوں کہ آپ رونا شروع ہو جاتی ہیں۔" وہ جھنجھلا گیا۔
"آرام سے بات کرو یا غصے سے، بات تو دل چیر دینے والی ہے۔ خدا معلوم کیا کیا تمہارے دماغ میں چلتا رہتا ہے۔ رہنے دو مت کرو ابھی شادی، دو چار سال بعد کر لینا جیسی تمہاری خوشی۔۔۔ ہم تو بس تمہارے غلام ہیں۔" وہ اسی انداز میں بولیں۔
"اچھا آپ کچھ مت کریں۔ بس یہ انگوٹھی واپس کر دیں۔" اس نے انہیں انگوٹھی دینا چاہی مگر وہ غصے سے ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

بات صرف ایک بار منہ سے نکالنا مشکل ہوتا ہے پھر اس کو بار بار دہرانا مسئلہ نہیں بنتا۔
ان سب کی روٹین تھی کہ رات کے کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پی جاتی تھی اس وقت گھر کے تقریباً تمام ہی افراد موجود ہوتے اور گھنٹے دو گھنٹے، کبھی سیاست کبھی بزنس یا گھریلو مسئلوں پہ بحث ہوتی، سو آج بھی یہی ہو رہا تھا۔ ابرار بھی چائے پیتے ہوئے حاشر سے باتوں میں مگن تھا۔ کہ زرین آپی نے شوشا چھوڑا۔
"بھئی ایک ہی روٹین سے اکتا گئے ہیں کچھ ہلا گلا ہونا چاہیے۔ آغا جان! ابرار اور ثمن کی شادی کر دیں۔ اب اس سمسٹر کے بعد ثمن بھی فارغ ہے۔" ابرار اور حاشر دونوں چونک گئے۔
"بالکل ہم بھی یہی چاہ رہے تھے۔" آغا جان نے پُرزور تائید کی۔
"کیوں بھئی ابرار تمہارا کیا خیال ہے۔" آغا جان نے خاصی خوشدلی سے اس سے رائے لی۔
اس نے ایک طائرانہ نظر لاؤنج پہ ڈالی وہاں زوبیہ اور ثمن کے علاوہ تقریباً سب تھے۔
"آپ لوگوں نے خود ہی بات نکال دی ورنہ میں کئی دنوں سے کچھ کہنے کا سوچ رہا تھا۔" حاشر نے ہاتھ دبا کر اسے روکنا چاہا مگر اس نے ہاتھ ہٹا کر اسے نظرانداز کر دیا۔ "میں نے امی سے بھی کہا۔ مگر وہ میری کسی بات کو اہمیت نہیں دیتیں۔" اس نے ناراضی سے اپنی ماں کو دیکھا جن کی نگاہوں میں خاموش رہو کی التجائیں تھیں۔ وہ اسے بھی نظرانداز کر گیا۔ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔
"کیا کہنا چاہتے ہو؟" آغا جی نے بارعب انداز میں پوچھا۔ اس کی غیر معمولی سنجیدگی سے سب دہل گئے تھے۔
"میں جانتا ہوں میری بات سن کر آپ لوگوں کو دکھ ہو گا۔ مگر دو زندگیاں برباد کرنے سے بہتر ہے، آپ

لوگ یہ عارضی دکھ برداشت کرلیں۔ میں نے اس معاملے میں بہت سوچا۔ آپ لوگ مجھے جانتے ہی ہیں میرا مزاج بہت سخت ہے۔ ثمن بہت معصوم اور بھولی ہے وہ میرے مزاج کی سختی سہہ نہیں پائے گی۔ اس کا مزاج مجھ سے یکسر مختلف ہے۔ اس کا مجھے ایک ہی حل نظر آیا کہ میں یہ منگنی توڑ دوں۔ ساری زندگی جبر اور زبردستی کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ میں آپ لوگوں کی کچھ دنوں کی ناراضی برداشت کرلوں۔" اس نے پوری تمہید باندھ کر آخر میں واضح بات کی اور انگوٹھی اتار کر سینٹر ٹیبل پہ رکھ دی۔

پورے لاؤنج میں ایک جامد خاموشی طاری تھی۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا اور حاشر۔۔۔ اس کو کم از کم ابرار سے اتنی دلیری کی امید نہیں تھی۔ اس کا اپنا دل اتنا تیز دھڑک رہا تھا گویا نکل کر باہر آجائے گا اور اس خاموشی کو ابرار کے بابا جان نے توڑا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ہنسی مذاق کا کھیل نہیں اگر تمہیں کوئی اعتراض تھا تو پہلے کہتے ہم نے زبردستی تو نہیں کی تھی۔۔۔ اب یوں کسی بچی پہ ظلم ڈھانا۔۔۔ یوں پورے خاندان کی توہین کرنا۔۔۔ یہ ایک شریف انسان کو زیب نہیں دیتا بیٹا!" انہوں نے اپنے اکھڑ مزاج بیٹے کو دیکھا۔ بے بسی سے ان کی آواز دب گئی۔

"بابا! یہ ظلم نہیں اگر بعد میں مجھ سے کوئی حق تلفی ہوئی تو کیا فائدہ۔ نہ میں خوش رہوں گا نہ ثمن۔۔۔ ویسے بھی منگنی ٹوٹنا اتنی انوکھی بات تو نہیں۔۔۔ ہوجاتا ہے ایسا بھی۔ یقین مانیے! ثمن کو مجھ سے بہتر رشتہ ملے گا۔ آپ لوگ اتنا پریشان مت ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس نے بابا کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہیں تسلی دینی چاہی مگر انہوں نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم۔۔۔ تم۔" ان کی سمجھ نہیں آیا وہ اس ذلت اس شرمندگی کا ازالہ کیسے کریں۔

"رہنے دو زاہد۔۔۔! جب تمہارے بیٹے نے یہ فیصلہ کرلیا تو وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ ہماری اور ہماری بچیوں کی مزید توہین مت کرو۔" آغا جان کے چہرے پہ شدید کرب کے آثار تھے۔ ابرار آگے بڑھ کر تائی جان اور تایا جان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس سارے قصے میں اسے سب سے زیادہ شرمندگی ان سے ہی ہوئی تھی۔

"مجھے معاف کردیں تایا جان! مجھے بہت شرمندگی ہے مگر یقین مانیے یہ سب میں نے ثمن کی خوشی کے لیے ہی کیا ہے۔" اس نے دونوں کے ہاتھ تھام کر قدرے شرمندگی سے معذرت کی۔ گھر کا بچہ تھا وہ اسے کہتے بھی کیا۔ وہ ایک بے بس سی نظر اس پہ ڈال کر رہ گئے۔

"آغا جان! اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں ایک بات کہوں؟" اچانک ہی زیب بھائی نے مداخلت کی۔ آغا جان نے محض نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"اس کا ایک حل ہے اور گھر کی بات گھر میں نپٹ جائے گی۔ زیادہ پھیلے گی بھی نہیں۔" انہوں نے تمہید باندھی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" آغا جان نے بغور انہیں دیکھا۔

"آپ ثمن کی شادی حاشر سے طے کردیں۔" انہوں نے دھماکہ کیا۔ سب تو سب حاشر اور ابرار بھی چونک گئے۔ یہ کم از کم ان کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔

"تمہاری بات اپنی جگہ درست بیٹا۔۔۔ مگر اب ہم کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے۔۔۔ ایسا نہ ہو حاشر صاحب پھر گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں اور ہماری بچیاں تماشہ بنتی رہیں۔" آغا جان بے بس سی ہنسی ہنس کر بولے۔

"نہیں، نہیں آغا جی! اب ایسا نہیں ہوگا۔" راشد علی (حاشر کے والد) نے فوراً ان کی ڈھارس بندھائی۔

"کیوں حاشر! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" زیب بھائی نے فوراً حاشر سے پوچھا۔

"دیکھو بیٹا۔۔۔ آغا جی بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم اگر دل سے راضی ہو تو ٹھیک۔۔۔ ورنہ بعد میں کسی اونچ نیچ سے اچھا ہے۔ ابھی منع کردو۔" راشد علی نے بھی دو ٹوک بات کی۔

جی، جی، جی بابا!" وہ گڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ فوری طور پہ اس کے سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ ابرار نے گھور کر اسے دیکھا۔ سوچ تو ایسے رہا ہے جیسے اچانک پہاڑ ٹوٹا ہو۔

"پھر بیٹا! کیا رائے ہے تمہاری۔" بابا نے بہت امید سے اسے دیکھا۔

"جی بابا۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔" چند لمحے بعد وہ انتہائی مؤدب بنا فرمانبرداری سے کہہ رہا تھا۔ سب کے چہروں پہ رونق لوٹ آئی۔

آغا جی نے ثمن کے والدین سے رائے لی۔ انہیں بھی کوئی اعتراض محسوس نہیں ہوا۔

"یہ لیں آغا جی! آپ ہی حاشر کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا دیں۔" زرین آپی نے ٹیبل پہ سے انگوٹھی اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی اور ایک کاٹ دار نظر ابرار پہ ڈالی۔

آغا جی نے انگوٹھی حاشر کی انگلی میں پہنا دی۔ "بس اب سن لو مہینے بھر میں یہ شادی ہونا ہے۔ ہم اس سے زیادہ تاخیر برداشت نہیں کریں گے۔" آغا جی نے کہا تو سب نے ہی ان کے فیصلے کی پرزور تائید کی۔ اکثریت کے ستے ہوئے چہرے کھل اٹھے تھے۔ حاشر سے تو اپنی خوشی کنٹرول کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا یہ سب اتنی آسانی سے ہوجائے گا۔

ابرار نے ایک نظر حاشر پہ اور ایک پورے ماحول پہ ڈالی سب کچھ معمول پہ آگیا تھا۔ سب خوش تھے۔ اس کے والدین، تایا تائی سے معافی تلافی کر رہے تھے۔

اسے اپنی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ جب حاشر سے منگنی ہوگی سب اس میں خوش ہوجائیں گے مگر اسے ایک دم اپنا دل، اپنا آپ خالی خالی لگا۔

لگاتار چار چھ مہینے سے ثمن کا نام اپنے نام کے ساتھ سن رہا تھا تو انسیت سی ہوگئی تھی۔ یہ شاید اس کا اثر ہے۔ اس نے خود کو تسلی دی اور ایک گہری سانس لے کر باہر نکل آیا۔

کچن میں ثمن اندر کے ہنگامے سے بے خبر مصروف تھی۔ وہ وہیں چلا آیا اور یونہی چوکھٹ پہ کھڑا ہوگیا۔ وہ چند ثانیے تو اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر کچھ الجھ کر پوچھا۔

"کچھ چاہیے تھا آپ کو۔۔۔؟" وہ چونکا۔

"ایک گلاس پانی دے دو۔۔۔" ثمن نے ہاتھ دھو کر پانی اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لو۔" پانی پی کر اس نے گلاس اس کی طرف بڑھایا، وہ حیران ہوئی۔ وہ سلیب پر بھی رکھ سکتا تھا۔

"خوش رہا کرو ثمن۔۔۔! مجھے تمہارے ہونٹوں پہ ہنسی بہت بھلی لگتی ہے۔" اس نے کہا اور تھوڑا قریب آکر اس کے چہرے پہ آئی لٹ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"اور اب تو اس ہنسی کا میں نے مستقل حل بھی ڈھونڈ لیا ہے۔" اس نے قدرے مسکرا کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ثمن حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ ایسی شوخ شرارت تو اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼
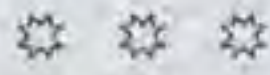
امی، بابا کی ناراضی اور دیگر گھر والوں کی نظروں سے ممکنہ حد تک بچنے کے لیے گزشتہ کئی روز سے اس نے یہ روش اختیار کی ہوئی تھی کہ صبح سویرے نکل جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔۔۔ شہلا آپی، سہیل بھائی اور حماد جس کی فلائیٹ کینسل ہوگئی تھی اور اس نے کہا تھا اب شادی پہ آئے گا۔۔۔ ان سب کی ملامت وہ فون پر وصول کرچکا تھا۔

تمام تر احتیاط کے باوجود اب اسے اپنا یہاں رہنا مشکل لگ رہا تھا۔۔۔ اسے یقین تھا ثمن نے اب ہمیشہ اسے مخاطب کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار رہنا تھا اور حاشر۔۔۔ اسے ایک چھوٹا سا جملہ بھی بدگمان کرسکتا ہے اور وہ خود بھی تو اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ اب اس میں ثمن کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی ثمن کو منگیتر کی حیثیت سے نہیں دیکھا تھا مگر۔۔۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اسلام آباد سیٹل ہوجائے گا۔ وہ ملک چھوڑنے کی بات کرتا تو یقیناً اس کے ناراض والدین مزید ناراض ہوجاتے۔ مگر اسلام آباد جانے پر کسی کو کوئی اعتراض

نہیں ہو گا' اور آغا جی تو بزنس کے معاملے میں زیادہ مداخلت نہیں کرتے تھے۔

یہی سب فیصلے کر تا وہ آج آفس سے سیدھا گھر چلا آیا۔ ورنہ روز تو شہر بھر کی خاک چھان کر لوٹتا تھا۔ تھکاوٹ اتنی تھی کہ وہ جوتوں سمیت مسہری پہ لیٹ گیا کہ رانی چائے لے کر آگئی۔

"بھائی...... بھائی۔" اس نے دو آوازیں دیں۔

"ہوں...... اس نے چونک کر آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔ رانی نے چائے رکھ دی۔

اس نے پھر ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لیے۔ وہ چند لمحے اس کا تھکا تھکا پژمردہ انداز دیکھتی رہی پھر بولی۔

"کچھ کھائیں گے آپ؟ لے کر آؤں؟"

یہ ماں بہنیں بھی موم کی بنی ہوتی ہیں' ہم کچھ بھی کر لیں' ان کے دل میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ہر بار معاف کر دیتی ہیں۔ وہ محض سوچ کر رہ گیا۔

"بھائی آپ نے ایسا کیوں کیا؟" اتنے دن سے گھر والے بھی ناراض تھے اور کچھ وہ بھی موقع نہیں دے رہا تھا' سو سوال جواب سے بچا ہوا تھا مگر آج رانی پوچھ ہی بیٹھی۔

"پتا ہے ثمن آپی بھی اتنی اداس ہیں۔ انہوں نے اپنے کمرے سے نکلنا بھی چھوڑ دیا ہے۔" وہ دکھ سے بولی۔

"اچھا......!" وہ ہلکے سے مسکرا دیا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"تم اتنا پریشان نہیں ہو...... سب ٹھیک ہو جائے گا' یہ بات تو تم نے سنی ہو گی کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ تو بس میرا اور تمہاری ثمن آپی کا جوڑ نہیں تھا۔" رانی بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ابرار فریش ہو کر ٹیرس پہ چلا آیا۔ سگریٹ کو لائٹر دکھاتے ہوئے بے اختیار اس کی نظر نیچے لان میں ٹہلتے حاشر اور ثمن پہ پڑی۔ وہ لائٹر بند کرنا بھول گیا۔ لائٹر کے شعلوں نے چند لمحوں میں سگریٹ جلا کر راکھ کر دی اسے ہونٹوں پہ تپش کا احساس ہوا تو اس نے بے اختیار لائٹر بند کیا اور ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"جب خود ہی یہ سب کچھ کیا تو پھر اتنا جھٹکا کیوں؟" برابر کے ٹیرس سے زیب بھائی کی آواز آئی تو وہ چونک گیا اور تیزی سے خود کو سنبھالا۔

"کیسا جھٹکا؟ میں تو......" ان کے ہونٹوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ دیکھ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے...... تم ثمن میں انوالو ہو چکے ہو۔"

زیب بھائی نے لان میں ٹہلتے حاشر اور ثمن کو دیکھتے ہوئے انتہائی سرسری انداز میں کہتے ہوئے صحیح معنوں میں اس کے سر پر بم پھوڑا...... مگر اسے اپنے جذبات پہ مکمل کنٹرول تھا۔

"مانا کہ آپ بہت جینئس ہیں۔ اور اکثر ہی آپ کے اندازے درست ہوتے ہیں مگر کم از کم اس بار آپ کا اندازہ درست نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ حاشر اسے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس نے بھی جواباً مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور اپنے کمرے کے اندھیروں میں لوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ لائٹ آف کیے آرام کرسی پہ بیٹھے سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی...... اس نے بے اختیار ٹائم دیکھا' دو بجنے والے تھے۔ اس وقت کون...... پھر خیال آیا حاشر ہو گا۔

"یس......!"

"ثمن تم......!" وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

"ہاں...... ایک سوال کافی دن سے پریشان کر رہا تھا۔ سوچا' پوچھ لوں۔" اس کا انداز کچھ غیر معمولی تھا۔

"کیا......" اس نے سگریٹ بجھا کر کچھ محتاط انداز میں پوچھا اور لائٹ آن کر دی بلکہ دروازہ بھی تھوڑا کھلا چھوڑ دیا۔

"اپنی عزت بہت پیاری ہے؟" اس کی احتیاط دیکھ کر اس نے طنز کیا۔

"سب کو ہونی چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"صرف اپنی نہیں دوسروں کی بھی۔" وہ کاٹ دار

انداز میں بولی۔ وہ خاموش ہی رہا۔ وہ چاہ رہا تھا وہ جو پوچھنے آئی ہے' جلدی سے پوچھ کر چلی جائے۔ وہ حقیقت میں بہت مضطرب ہو چکا تھا' اسے یہاں دیکھ کر اسے خوف تھا حاشر نہ آجائے' وہ وقت بے وقت اس کے کمرے میں چلا آتا تھا۔ ثمن کی موجودگی اس کے کمرے میں' وہ بھی رات کے اس پہر۔ اس کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"تمہیں کیا پوچھنا تھا ثمن؟" اس نے بہت سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

"آپ کسی اور لڑکی میں انوالو ہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"نہیں!" تیزی سے اس کے منہ سے نکلا اور اسے فوراً" ہی اپنی جلد بازی کا احساس ہوا۔

"پھر آپ نے یہ منگنی کیوں توڑی...... بقول زرین آپی کے اور اکثریت کے کہ میں آپ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔ زیادہ فری نہیں ہوئی یا اور منگیتروں کی طرح بے تکلفی نہیں دکھائی تو یہ اس کا نتیجہ ہے مگر میں نہیں مانتی۔ میں آپ کا مزاج اچھی طرح جانتی ہوں۔"

ابرار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ مجھے وجہ بتائیں منگنی توڑنے کی؟" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

"چھوڑو اب...... جو ختم ہو گیا اسے کریدنے سے کیا حاصل۔" ابرار نے دانستہ سرسری انداز اختیار کیا۔

"کیوں...... آپ نے پورے گھر میں میرا تماشا بنایا اور میں وجہ بھی نہیں جانوں؟ اگر میں آپ کو پسند نہیں تھی تو آپ اس منگنی پہ راضی نہ ہوتے...... اور یہ بات تو میں اچھی طرح جانتی ہوں' آپ کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔" اس نے خاصے تلخ انداز میں کہا۔

"دیکھو ثمن! میں جانتا ہوں میں نے غلط کیا اور اگر تمہاری دل آزاری ہوئی ہے یا میری وجہ سے تم ہرٹ ہوئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں...... ویسے بھی تم کون سا مجھے پسند کرتی تھیں۔" اس نے گفتگو کو ہلکا پھلکا

رنگ دینے کو قدرے مسکرا کر کہا۔

"یہ کس نے کہا آپ سے....." وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

"آپ جانتے ہیں جب میں میٹرک میں تھی تب سے آپ کو پسند کرتی ہوں اور اب میرا بی ایس سی کا لاسٹ سمسٹر ہے۔ پانچ چھ سال کافی نہیں ہوتے کسی کو پسند کرنے کے لیے ..... وہ عمر کتنی نادانی اور کمسنی کی ہوتی ہے، ایک بار جو دل میں بس جائے اور آنکھوں میں جو خواب سما جائے پھر ساری زندگی بھی چاہو تو نہ دل سے کھرچ سکتے ہیں نہ آنکھوں سے..... آپ اتنے شارپ ہیں کہ ذرا سی کوشش سے میری آنکھوں کی تحریر پڑھ سکتے تھے مگر آپ تو اپنی شخصیت کے زعم میں ہی گم تھے۔ آپ کو خبر نہیں تھی کون آپ کی کتنی پرستش کرتا ہے۔ میں نے اپنی دو سہیلیوں سے دوستی صرف اس لیے ختم کی تھی کہ انہوں نے آپ کو آئیڈیل بنا لیا تھا۔ آپ کا مغرور اور گھمنڈی انداز دیکھ کر میری صرف یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح بھی آپ کو میرے جذبوں کی بھنک نہ پڑے۔ خود سے بھی چھپا کر سینت سینت کر رکھے تھے میں نے یہ جذبے کیونکہ مجھے ان کی تحقیر گوارا نہیں تھی۔ اس کے باوجود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں خدا سے تڑپ تڑپ کر دعاؤں میں آپ کو مانگا کرتی تھی۔

میرا خدا تو مہربان ہو گیا مگر مجھے معلوم نہ تھا بندے مہربان نہیں ہوتے۔ خدا نے میرے یک طرفہ جذبوں کی لاج رکھ لی اور آپ سے میری منگنی ہو گئی۔ میں اپنی خاموش محبت کے اس انجام پہ بہت خوش تھی، بے پناہ خوش ..... مگر آپ کا رویہ دیکھ کر میری ساری خوشی خاک میں مل جاتی۔ کبھی منگنی سے انکار اور کبھی نکاح سے ..... میرا دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا ..... کبھی دل چاہتا جھنجھوڑ کر آپ کو پوچھوں ..... آپ اتنے پتھر دل کیوں ہیں۔ مگر میں کبھی یہ ہمت نہیں کر پائی ..... لیکن آج میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا بگاڑا تھا میں نے .....؟ کیا قصور تھا میرا .....؟ آخر کیوں کیا آپ نے ایسا .....؟"

اپنے جذبوں کو اتنا سینت کر رکھنے والی ایک کمزور لمحے میں اس پہ عیاں ہو گئی ..... دکھ کی کیفیت میں یوں گھری کہ اس جارحانہ انداز میں اور مضبوط قدموں سے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی وہ پانی بن کر بہہ گیا۔ قطار کی طرح اس کے آنسو کسی موتی کی طرح لڑھکتے چلے گئے۔ اس کے انکشافات ابرار کی قدموں سے زمین کھینچنے کو کافی تھے۔ وہ پتھر بنا بغیر کوئی جنبش کیے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"مگر تمہارا رویہ .....؟" کافی دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوا۔

"وہ تو ایک معصوم سا احتجاج تھا ..... وہ ہتک جو میں آپ کے رشتے کے انکار پہ فیل کرتی تھی۔ وہ تو مان تھا، یقین تھا کہ آپ مجھے منا لیں گے ..... مجھے یہ گمان تھا کہ اب آپ کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا مگر آپ ....."

وہ بلک بلک کے بے آواز رونے لگی۔ ابرار بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا تسلی کا ایک لفظ نہیں تھا اس کے پاس۔ بے بسی کا یہ مقام تو نہیں آیا تھا اس کی زندگی میں۔ وہ ہر طرح کے حالات کو اپنے تابع کر لیتا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا اندازہ غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو حاشر اور ثمن ..... اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔

اس نے ایک نظر ثمن کو دیکھا۔ اس کے آنسو ابرار کو بے انتہا مضطرب کر رہے تھے۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ثمن کی طرح جذباتی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے فوراً ہی اپنی پوزیشن کا احساس ہوا ..... جو وہ اس کے انکشافات میں بھلا بیٹھا تھا۔ وہ ایک دل جوڑنے کی کوشش میں دوسرا دل توڑ بیٹھا تھا۔ مگر اب اسے معاملہ سنبھالنا تھا۔

"دیکھو ثمن ..... پلیز خود کو کنٹرول کرو۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا ..... تم۔"

"جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں آپ سے محبت کی بھیک مانگنے نہیں آئی۔ محبتیں اعزاز سے حاصل کی جاتی ہیں، خیرات سے نہیں ..... مجھے اپنی عزت نفس، خودداری اور انا اپنی محبت سے بڑھ کر عزیز ہے۔"

وہ چیخ کر بولی۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ نظریں چرا گیا۔

"حاشر ایک اچھا انسان ہے۔ اس کی ہمراہی میں تم سب بھول جاؤ گی ....." وہ دھیرے سے بولا۔

"اب آپ کو میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ..... وہ واقعی ایک اچھا انسان ہے، کم از کم آپ سے لاکھ درجہ اچھا ..... اس نے میرے والدین کو کسی صدمے سے بچا لیا۔ ایک ٹھکرائی ہوئی بے قصور لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ باقی ہمارا کیا۔ ہم لڑکیوں کے خواب تو ٹوٹتے رہتے ہیں، ہمیں عادت ہوتی ہے سمجھوتے کی بھینٹ چڑھنے کی۔" وہ تلخ انداز میں بولی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

"تم واقعی بہت خوش رہو گی حاشر کے ساتھ۔ مجھ جیسے انسان سے تمہیں کچھ ملنے والا نہیں تھا۔ میں بہت بے حس انسان ہوں ..... تمہیں ایک قدر دان انسان ملا ہے، اس کی قدر کرنا، کوشش کرنا اسے یہ سب معلوم نہ ہو ..... زندگی سہل گزرے گی۔" اس نے بہت بے رحمی سے اپنا آپ واضح کیا تھا۔

"چپ ہو جائیں آپ ..... خدا کے لیے خاموش ہو جائیں۔" آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں بھرنے لگے۔

"میری خوشی، غمی سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ یاد ہے؟ آپ نے کہا تھا "میرے چہرے پہ ہنسی بہت بھلی لگتی ہے۔ پھر کیوں یہ ہنسی آپ نے ہمیشہ کے لیے چھین لی؟ کیوں.....؟" وہ سسک اٹھی۔

"اب اس چہرے پہ ہنسی کے لیے آپ ترس جائیں گے ..... اب صرف مصنوعی ہنسی رہے گی اس چہرے پہ، بہت ظالم انسان ہیں آپ۔ بہت سنگدل ..... میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں ..... میری بددعا ہے، خدا آپ کے دل میں بھی محبت کا بیج بو دے اور وہ شخص کبھی آپ کا نصیب نہ بنے۔" اس نے اس پتھر کے بت پہ آخری نظر ڈالی اور روتے ہوئے بھاگ گئی۔

ہاں مجھے رسم محبت کا سلیقہ ہی نہیں فیض
جا کسی اور کا ہونے کی اجازت ہے تجھے

ابرار بے جان قدموں سے وہیں ڈھے گیا۔

یہ کیا ہو گیا تھا؟ یہ کیوں ہو گیا تھا۔

اس کا اندازہ اتنا غلط کیسے ہو گیا؟

اس کی چہرہ شناسی کہاں گئی؟

وہ اس کا دلوں تک رسائی پا لینے والا زعم کہاں گیا؟

اسے تو چہرے پڑھنے پہ عبور حاصل تھا۔ اسے تو دل میں اترنے کا فن آتا تھا؟ پھر جو دل کے اتنے قریب تھی ..... جس کے دل میں وہ خود بسا تھا ..... اس کے بارے میں نہیں جان سکا.....؟

جو کچھ حاشر کے اور اس کے درمیان چل رہا تھا ..... وہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچ ہی نہیں پایا ..... وہ بیچ میں قسمت کو بھول چکا تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ قسمت کو اپنے تابع نہیں کر سکتا تھا ..... وہ ہر شخص کو اپنے آگے جھکا سکتا ہے، مگر قسمت کو نہیں ..... تقدیر نے اس کے ساتھ بہت خوفناک داؤ کھیلا تھا۔ اس کے تصور سے کہیں زیادہ۔

اس کی شخصیت کا سارا مان، غرور، طنطنہ، خاک میں مل گیا تھا۔ اسے زیب بھائی کی بات یاد آئی۔

"اپنی شخصیت کا زعم اچھی چیز ہے مگر اتنا غرور ٹھیک نہیں۔ ورنہ بعض اوقات ایسی ٹھوکر لگتی ہے کہ انسان سنبھل ہی نہیں پاتا۔"

اور یہ ٹھوکر ایسی ہی تھی کہ اب اسے ساری عمر اپنے زخم چاٹنا تھے۔

خدا نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا تھا اور اسے اس کی اوقات بتا دی تھی۔

اپنی وجہ بربادی تو سنیے، بڑے مزے کی ہے
زندگی سے یوں کھیلے، جیسے دوسرے کی ہے

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی منزل

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے، بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بہو اور اس کے گھر والوں کو مورود الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ زبیر کے ہاتھوں لٹ جانے پر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ تو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلاپاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

بارہویں قسط

دلہن بنی فوزیہ پہ کمال کا روپ آیا تھا۔

یہ نسیم بیگم ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ اس تقریب میں موجود سب ہی لوگوں کا خیال تھا۔ فوزیہ کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

ساتھ بیٹھا خالد نہ صرف جچ رہا تھا بلکہ ہر کسی نے ایک جیسی جوڑی کہہ کر خوب تعریفیں بھی کیں۔

نسیم کی خوشی کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں کا بوجھ کسی نے یک لخت ان کے کاندھوں سے اتار دیا ہو۔

"اے بہن! تمہاری بہو کہاں ہے؟ اپنے عدیل کی بیوی شادی کی کسی تقریب میں نہیں تھی۔ کیا لڑ بھڑ کر میکے جا بیٹھی ہے؟" خالدہ بھابھی کی بہو اتنی معصوم تھی نہ سادہ اور خاندان میں پھیلی اس خبر سے یقیناً "نا آشنا بھی نہیں ہو گی مگر کمبخت نے ایسے موقع پر ساری خوشی کا جیسے مزاہی کرکرا کر دیا ہو پوچھ کر۔ نسیم نے پہلے تو یوں ظاہر کیا جیسے فضول بکواس انہوں نے سنی ہی نہیں مگر وہ بھی سوڈھیٹوں کی ایک تھی۔

"اے آپا۔۔۔ سنتیں نہیں، تمہاری بہو نہیں نظر آرہی مجھے۔ کسی اور سے پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ ہو جاتی ہیں گھروں میں سو باتیں پر ایسے موقع پر تو بہو کو موجود ہونا چاہیے۔" شمسہ کی یہی عادت سارے خاندان کو بری لگتی تھی۔ وہ کسی بات کے پیچھے پڑ جاتی تو اس کے بخیے ادھیڑ دیتی تھی۔

"دیکھو تو اپنے عدیل کی طرف۔ دیکھا نہیں جا رہا۔ کیسے اکیلا اکیلا لگ رہا ہے۔"

"ہاں تو کچھن تھے گھر بسانے والے اس بشریٰ کے؟" نسیم جیسے پھٹ کر بولیں۔

شمسہ تو یوں بھولی بن کر دیکھنے لگی جیسے کسی بہت بڑے انکشاف کی منتظر ہو۔

"شمسہ! میں صاف بولوں اتنی کم فہم تم بھی نہیں ہو عمن تو لی ہو گی اڑتی پڑتی کوئی ایسی بات۔۔۔ پر زخموں پر نمک چھڑکنے کا تو اس خاندان کو ہڑکا ہے۔" نسیم اس پر الٹ پڑیں۔

"اللہ توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ سو بار میری توبہ، میں نہ تین میں نہ تیرہ میں اور مجھے کون ایسی باتیں بتائے گا بھلا، جو میں نے کبھی دلچسپی لی ہو۔ ہمیشہ زندگی بھر ایک ہی اصول رہا ہے میرا۔ اپنے کام سے کام رکھو بابا!" وہ خود کو خوب معصوم ظاہر کرنے پہ پورا زور لگانے لگی۔

نسیم بری طرح بے زار ہو گئیں۔ پیچھا چھڑانے کے لیے صاف کہہ دیا۔

"طلاق دے دی ہے عدیل نے اس کو۔ جینا دو بھر کر رکھا تھا اس نے میرے بچے کا۔ دن رات فرمائشیں ضدیں ۔۔۔ ہر وقت ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ مرد بچہ تھا برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے سو تین حرف بولے اور چوٹی پکڑ کر چلتا کیا۔" نسیم نے یوں سینے پر ہاتھ رکھ کر چار لائنوں میں پوری کہانی کہہ دی جیسے عدیل نے بڑا مردوں والا کارنامہ انجام دیا ہو۔

"اوئی طلاق دے دی؟" وہ صدمے سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"چچ۔۔۔ چچ بے چارہ بچہ۔۔۔ کیسا اکیلا سا نظر آرہا ہے اجڑا ہوا۔" وہ جی بھر کے تڑپی اور ہمدردی لہجے میں سمو کر بولی۔

"اجڑیں اس کے دشمن۔ میرا بچہ گھر بار والا، ایسی اچھی نوکری گاڑی، گھر کیا نہیں میرے بچے کے پاس۔ لڑکیوں کا کوئی کال پڑ گیا ہے۔ ابھی اسی فنکشن میں دس ماؤں نے میرا پلو پکڑ کر صاف اپنی بیٹیوں کے رشتے میرے آگے ڈال دیے ہیں۔ پر اب کے تو میں کوئی دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ اپنے بچے کے لیے خوب چھان پھٹک کر بہو لے کر آؤں گی۔" نسیم سینہ ٹھونک کر بولیں۔

شمسہ لحہ بھر کو تو کھلے منہ کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔ نسیم نے طلاق کی بات سنا کر اسے افسوس

کرنے کا چانس بھی نہیں دیا تھا۔
عدیل کی نئی شادی کی بات شروع کردی تھی۔
"ایک لڑکی بھی تھی نا عدیل کی اس بشریٰ سے؟" شمسہ کو ارد گرد بھاگتے بچوں کو دیکھ کر کچھ یاد آیا۔
نسیم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
"کمبخت شکل سے ایسے ہی معصومہ بنی کھڑی ہے جیسے میں اس کی بھینگی عظمیٰ کو اپنے عدیل کے لیے مانگ ہی لوں گی نا!"
"ہاں ہے تو۔ وہ عدیل کے پاس ہی رہے گی بچی تو اسی کی ہے۔" وہ پھر سے اسی طرح سینہ چوڑا کرکے بولیں۔
"اچھا!" شمسہ کچھ خاموش سی ہوگئی۔
"کیوں کیا ہوا؟" نسیم کو اس کے اتنے مختصر "اچھا" سے کچھ وحشت سی ہوئی تو گھبرا کر پوچھنے لگیں۔
"آپا! برا نہیں ماننا۔ دوہاجو تو ہو گیا نا تمہارا عدیل اب اگر تم پسند کی لڑکی ڈھونڈو گی تو یہ لڑکی دم چھلا ہو گی عدیل کا تو تمہارے خیال میں لوگ ہنسی خوشی دے دیں گے رشتہ۔" گنوں کی پوری تھی یہ شمسہ۔ جو بات نسیم کے دل میں کسی سنپولیے کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھی کیسے اس نے کھٹاک سے کہہ دی۔ نسیم فورا" تو جیسے کچھ بول ہی نہ سکیں۔
"میں تو کہوں آپا! اس لڑکی کو ماں کے حوالے کردو سیدھا سیدھا۔ تم یا عدیل کیوں یہ مصیبت اٹھاؤ۔ ایک تو پالنے کا کشٹ پھر پڑھاؤ لکھاؤ۔۔۔ لڑکی ذات اس کی چوکیداری الگ سے دوسرے عدیل کے رشتے کے رستے میں رکاوٹ پھر آخر میں بیاہنے کا مسئلہ۔ اپنی فوزیہ کو لے لو اچھے رشتے کی تلاش میں سمجھو دانتوں پسینہ آگیا۔ اب تم سوچ لو خوب اچھی طرح۔"
نسیم تو اس کی شکل ہی دیکھتی رہ گئیں۔
کیسے شمسہ نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرکے رکھ دیا تھا۔
"بولو آپا نسیم! کیا میں نے غلط کہا؟" وہ نسیم کو بت بنا دیکھ کر فخریہ لہجے میں پوچھنے لگی۔
"اب یہ ساری باتیں میں اور تم تو سمجھ سکتے ہیں۔ عدیل کو کون سمجھائے گا۔ وہ تو اس بالشت بھر کی لڑکی کے لیے باولا ہوا جا رہا ہے۔ جیسی جادوگرنی ماں تھی ویسی ہی بیٹی ہے اسے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ سمجھو مارے باندھے اس نے بہن کی شادی کے انتظامات کیے ہیں۔ ہر بات کو مجھے دس دس بار کہنا پڑا ہے۔ پھر بھی دس کام ادھورے رہ گئے۔ وہ تو اللہ نے کرم کیا فوزیہ کی ساس بلکہ سارا سسرال ہی ایسا اچھا اور مہربان ملا کہ آدھا ادھورا جہیز بھی انہوں نے ماتھے پہ شکن ڈالے بغیر قبول کرلیا۔ اب عدیل کو یوں چھوڑ تو نہیں سکتی نا میں!" نسیم کو تو جیسے سب کچھ کہنے کو کسی ہمدرد کا کاندھا مل گیا کہتی چلی گئیں۔
"لو اس عدیل کو کیا ہو گیا۔ اب دفتر جائے گا یا اس بچی کی دیکھ ریکھ کرے گا بلکہ میں تو کہوں آپا! یہ تمہاری سمدھن کی ہوشیاری ہو گی ساری۔" وہ قریب ہو کے یوں رازداری سے بولی جیسے سمدھن کا کوئی وہاں ضرور ہی موجود ہو گا۔
"کیا مطلب؟" نسیم جیسی گھاگ عورت کی عقل شمسہ کی ذہانت کے سامنے چوپٹ ہو گئی تھی جیسے!
"میری بھولی آپا! تمہاری سمدھن اپنی چھوکری کو سدا گھر میں بٹھا کر رکھے گی کیا؟" نسیم تو ٹکر ٹکر دیکھے گئیں۔ وہ واقعی شمسہ کا مطلب نہیں سمجھی تھیں۔
"آپا! وہ اس کی شادی عدت ختم ہوتے ہی فورا" کرنے کی کوشش کرے گی۔ دوہاجو یا اس جیسے طلاق والے اسے بھی جلد یا بدیر مل ہی جائیں گے۔" شمسہ نسیم سے جڑ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں ہنوارا تو ملنے سے رہا۔ کم عمر تو نہیں ہے بشریٰ۔ اوپر سے یوں ہی لڑکیوں کا سا بناؤ سنگھار کیے پھرتی ہے۔"
نسیم کو پھر خوامخواہ ہی بھر کر بشریٰ پر غصہ آیا۔
ایک دم انہیں لگا کہ وہ جس کام کو بہت آسان سمجھ رہی تھیں وہ تو بہت کار دشوار ثابت ہونے والا ہے۔ عدیل کا دوسرا رشتہ تلاشنا آسان نہیں ہو گا اور اتنے دنوں تک گھر کی گاڑی کیسے چلے گی۔۔۔ کون چلائے گا کیسے ہو گا

نسیم تو زمانے ہوئے کام کاج سے فارغ بیٹھی تھیں۔ کچھ فوزیہ نے سنبھال لیا تو کچھ بشریٰ نے۔ اب پھر۔۔۔ نئے سرے سے لڑکی ڈھونڈنا خاندان کی چھان پھٹک۔۔۔ لڑکی کے چال چلن اور دس بکھیڑے۔۔۔
"یہ کیا پنگا لے لیا عدیل نے؟" نسیم کو آخر میں ۔ عدیل پر ہی غصہ آیا۔
"ظاہر ہے اب دوسرا رشتہ بھلے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ملے۔ وہ بھی بشریٰ کو ایک بچے کے ساتھ تو قبول نہیں کریں گے نا۔" شمسہ اپنی ہی راگنی چھیڑے ہوئے تھی۔
نسیم خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ ساری خوشی اڑن چھو ہو گئی تھی۔
فوزیہ جا رہی تھی اور پورے گھر اور گھرداری کی ذمہ داری نسیم کے بوڑھے کندھوں پر آپڑی تھی۔
وہ تو سالوں سے صوفے اور بستر پر بیٹھی بس حکم چلا رہی تھیں یا کیڑے نکال رہی تھیں۔
"سو وہ تمہاری سمدھن تو یہی چاہے گی کہ بچی باپ کے پاس چلی جائے پر آپا! میری مانو تو بالکل بھی یہ غلطی نہیں کرنا۔ ورنہ سر پکڑ کر روؤ گی۔" وہ نسیم کے پریشان چہرے سے قطع نظر بولے جا رہی تھی۔
"کیا مطلب۔۔۔ میں کیوں روؤں گی؟" نسیم جلے کٹے انداز میں بولیں۔
"تو تو کیا آنے والی آسانی سے اس بچی کو قبول کرلے گی۔ عدیل کی زندگی سیٹ ہونے سے پہلے ہی نئی مصیبتوں کا شکار ہو جائے گی۔" وہ سر جوڑے نسیم کے کانوں میں زہر گھولے جا رہی تھی۔
فوزیہ اسٹیج پر بیٹھی ماں کو یوں خود سے غافل دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔
"امی کو نظر نہیں آرہا کہ بیٹی داماد کے پاس آکر بیٹھیں میری ساس اللہ میاں کی گائے کب سے آکر بیٹھی ہیں ان کو پہناؤنیوں کا زیور دکھاتا ہے پر امی کو تو کوئی ہوش نہیں۔ اب وہ کس کے ذریعے ماں کو پیغام بھجوائے۔ کوئی اپنا قریبی نظر بھی تو نہیں آرہا تھا۔"
"کیوں جھوٹ بولا میں نے کچھ آپا!" شمسہ فخریہ انداز میں نسیم کو سارے زریں مشوروں سے نواز کر سر اٹھا کر بولی۔
"سب صحیح کہا تم نے مگر یہ عدیل کو کون سمجھائے۔" نسیم تو بس رو ہی دینے کو تھیں۔
"تم ماں ہو آپا! بہت کچھ کر سکتی ہو۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے عدیل نے بشریٰ کو طلاق تمہارے کہنے پر دی جب ایک بار وہ اپنا گھر تمہارے کہنے پر اجاڑ سکتا ہے تو دوسری بار بسانے کے لیے تمہارے کہے پر کیوں نہیں عمل کر سکتا۔" اور نسیم کا جی چاہا اس شمسہ کا گلا ہی دبا دیں۔ منحوس کیسی بکواس کر رہی تھی مگر اس وقت اس سے بھڑنے کا موقع نہیں تھا۔
"ہاں دیکھو جو رب کو منظور میں دیکھوں ذرا فوزیہ کی ساس بھی اسٹیج پر بیٹھی ہے۔" بالآخر نسیم کو رخصت ہو کر جانے والی بیٹی کا خیال آہی گیا۔
شمسہ سے جان چھڑا کر سست قدموں سے وہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ شمسہ اب دوسری عورت کے ساتھ بیٹھی فوزیہ اور خالد کی جوڑی پر کھلے عام تبصرے کر رہی تھی جن میں سے ایک بھی اگر نسیم سن لیتیں تو واقعی شمسہ کا گلا ہی دبا دیتیں۔

☼ ☼ ☼

"بس امی..... بالکل بھی نہیں۔ میں ایسا مر کر بھی نہیں کر سکتی۔" بشریٰ نے جلدی سے مثال کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"پاگل ہو گئی ہو تم اور مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل کر دو گی۔ ایک جو میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہو۔ حد ہے کوئی کم عقلی کی بھی۔"

اتنے دنوں سے ذکیہ جو ضبط کے جاں گسل مرحلوں سے گزر رہی تھیں جیسے پھٹ ہی پڑیں۔

"اور تم جاؤ۔ باہر جا کر کھیلو۔ عمران آ گیا ہے اس سے کہو، تمہیں کسی پارک میں لے جائے۔ ہر وقت اسے ساتھ چمٹائے رکھتی ہو۔ بڑی ہو رہی ہے یہ۔ اب اس کو خود بھی کچھ کرنے دو۔" ذکیہ نے زور سے مثال کو کھینچ کر ماں سے الگ کیا۔

لمحہ بھر کو تو بشریٰ شاکڈ سی ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ ماں کا رویہ بہت بدلا ہوا تھا۔

محسوس تو وہ اسی دن سے کر رہی تھی، جب سے اسے ٹھیک سے ہوش آیا تھا مگر دو تین دن سے یہ بدلاؤ کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا مثال بھی ڈر کر نانی کو دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ بے چارگی سے ماں کی طرف دیکھا۔ جیسے اس سے اجازت طلب کر رہی ہو کہ جائے یا نہیں۔

"سنا نہیں تم نے۔ جاؤ کھیلو جا کر باہر۔ مجھے تمہاری ماں سے کچھ بات کرنی ہے۔" ذکیہ اور بھی سختی سے بولیں تو مثال اور بھی ڈر گئی اس نے مڑ کر ماں کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ آہستگی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"مثال رکو۔ آؤ میرے پاس۔" بشریٰ تو اسے ایک لمحہ کے لیے خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔ جیسے ابھی عدیل کہیں سے آ کر اسے چھین کر لے جائے گا۔

"آؤ ادھر، باہر نہیں جانا تم نے۔" وہ مضطرب ہو کر میں بولی۔

"کوئی اس کو چھین کر نہیں لے جا رہا۔ نکال دو اس وہم کو اپنے دماغ سے..... تمہارے پاس ہی ہے یہ۔" ذکیہ بے زار کوفت بھرے لہجے میں بولیں۔

بشریٰ نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

اس بے زاری اور کوفت میں کون سے اشارے تھے، جو بشریٰ کو سمجھ لینے چاہیے تھے۔

"تنگ آ گئی ہیں آپ ہم دونوں سے؟" وہ دل گرفتی سے بولی۔

"تم سے نہیں تمہاری کم عقلی سے..... نادانی سے۔" ذکیہ نے بھی بے لحاظی سے کہہ دیا۔

"کیا مطلب..... میں نے کیا کیا ہے؟" بشریٰ نے دروازے کے باہر سے نظر آتے مثال کے سرخ فراک پر نظریں جما کر پوچھا۔

"عدیل..... آیا تھا پھر۔" ذکیہ کچھ دیر بعد، بہت سوچ سمجھ کر بولیں۔

"تو میں کیا کروں؟" بشریٰ کا چہرہ ایک دم سے جیسے پتھر کا بن گیا۔

"وہ مثال کو کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔" ذکیہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

"میں یہ مر کر بھی نہیں ہونے دوں گی۔" بشریٰ بے لچک لہجے میں بولی۔

"باپ ہے وہ اس کا۔ جیسے تم اس کی ماں ہو۔ تمہارا حق ہے مثال کو پاس رکھنے کا تو اس کا بھی حق ہے۔" ذکیہ نپے تلے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ جیسے وہ دل میں بہت کچھ طے کر چکی ہوں۔

بشریٰ کو ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ خوف سا آیا۔

"امی! وہ باپ ہوتا تو اسے اپنی ذمہ داری جو اللہ نے اس پہ ایک بیٹی کی شکل میں ڈالی ہے اس کا احساس ہوتا تو وہ بچے اور اسے اپنی زندگی سے کاٹ پھینکنے سے پہلے سوچتا۔"

بشریٰ کو احساس ہو رہا تھا کہ ذکیہ آج اس معاملے کو ٹھکانے لگانا چاہتی ہیں تو وہ بھی اس پر بات کرے گی، پیچھے نہیں ہٹے گی۔

"ہو گیا جو اس سے ہونا تھا غصے میں..... ماں، بہن نے جتنی اسے آگ لگا رکھی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ کمان سے نکلا تیر واپس کمان میں نہیں آ سکتا۔" ذکیہ جیسے عدیل کو رعایتی نمبروں سے پاس کرنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔

"تو.....؟" بشریٰ تنک کر بولی۔

"آگے کا سوچو اب۔" ذکیہ معنی خیزی سے بولیں۔

"آگے کا ہی تو سوچ رہی ہوں۔ اب مجھے صرف اپنی بیٹی کے لیے جینا ہے، اسے پالنا ہے اور اس کی اچھی تعلیم اور تربیت پر دھیان دینا ہے۔ یہ کبھی عدیل کے پاس جائے اور کبھی میرے پاس آ کر رہے اور اس کی نفسیات تقسیم ہو کر رہ جائے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" بشریٰ نے بے دھڑک اپنی پلاننگ ماں کو سنا دی۔ ذکیہ کا جی چاہا اسے خوب کھری کھری سنا دیں مگر اس کھری کھری کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اس خیال نے انہیں روک دیا۔

"فوزیہ کی شادی ہو گئی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولیں۔ بشریٰ نے غصے سے ماں کی طرف دیکھا۔

اس کی پلاننگ کا یہ بھونڈا سا جواب ماں نے کیا اسے تپانے کے لیے دیا ہے۔

"اس منحوس نے دفع تو ہو ہی جانا تھا ایک دن۔ میری بچی کا گھر تو نہ خراب کرتی۔" ذکیہ نفرت سے منہ میں بڑبڑائیں۔ بشریٰ نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

باہر خزاں شروع ہو چکی تھی۔ درختوں کے ہرے پتے پیلے ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ایک اداسی، ایک گہرا سناٹا۔ ادھر ادھر بھٹکتی ہوائیں جب اس کے کمرے کی کھڑکی آ کر بجاتیں تو اسے اپنے بیڈ روم کی وہ کھڑکی یاد آنے لگتی جس کے پیچھے امرود کا پیڑ تھا، جس کے پتے ایسی ہوا کے ساتھ کچھ ایسے شور مچاتے جیسے تالیاں بجا رہے ہوں۔

ہاں وہ دن تو ایسے ہی تھے جو اس نے عدیل کے ساتھ گزارے کہ ہر طرف خوشیاں تھیں۔ رنگ تھے اور.....

"تم سن رہی ہو میں کیا کہہ رہی ہوں۔" ذکیہ اسے یک ٹک باہر دیکھتے رہنے پر کچھ جھنجلا کر بولیں۔

بشریٰ خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

ذکیہ کو لمحہ بھر کے لیے اس کی شکل دیکھ کر بہت ترس آیا۔ جی تو چاہا کہ جو کچھ وہ کہنے جا رہی ہیں، اسے ابھی کچھ دنوں بعد کے لیے اٹھا رکھیں مگر وہ عمران کا بے زار رویہ بھی دیکھ رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ عمران کا یہ رویہ بشریٰ پہ کھلے، وہ بہت گہرائی سے کچھ محسوس کرے یا عمران ہی کچھ ایسا کہہ دے۔

"نہیں..... یہ بھرم تو ابھی قائم رہنا چاہیے۔ کم از کم بشریٰ کی زندگی نئے سرے سے جب تک سیٹ نہیں ہو جاتی۔" ذکیہ نے دل میں عزم کیا۔ عمران کی چلتی بات بھی رک گئی تھی۔ اس کی بے زاری کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

ابھی بہت کچھ نئے سرے سے شروع کرنا تھا۔ ذکیہ یک دم ہی خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگیں۔

"مثال کو کچھ دنوں کے لیے باپ کے پاس بھیج دو۔" ایک گہرا سانس لے کر بدقت وہ بات زبان پر لے آئیں جو کہ نہ جانے کتنے
بہت دنوں سے دل کے اندر پکے جا رہی تھی۔
"ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"بات سن لو پہلے میری پوری۔" وہ سختی سے بولیں۔
"امی! کچھ نہیں سنوں گی میں۔" وہ قطعیت سے بولی۔
"مثال کی شکل دیکھی ہے تم نے؟" ذکیہ نے دل گیری سے کہا۔
بشریٰ ایک دم سے کچھ بول نہیں سکی۔
"کیا ہوا ہے اسے... وہ ٹھیک ہے۔ خوش ہے۔" وہ کچھ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔
"کیا خوشی اسی کو کہتے ہیں؟ ٹھیک ہونا یہ ہوتا ہے؟ بچی سرسوں کا پھول بنی ہوئی ہے۔ کملائی ہوئی، مرجھائی ہوئی۔ چھوٹی سی بچی اور اس کا چہرہ دیکھو جیسے اسے ہنسے ہوئے زمانے گزر گئے ہوں۔" ذکیہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولیں۔
"امی!" بشریٰ کے ہونٹ کانپے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"ابھی کچھ دن لگیں گے اسے سب کچھ سمجھنے میں۔ سیٹ ہونے میں۔" وہ ذرا دیر بعد جیسے خود کو ڈھارس دیتے ہوئے بولی۔
"اور کتنے دن... بشریٰ! عقل کو ہاتھ مار بیٹا! وہ بچی تم دونوں کے ساتھ بہت ہلی ہوئی ہے۔ وہ تم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سوچ ذرا۔" ذکیہ دہائی دے کر بولیں۔
"لیکن امی! اب اسے رہنا ہوگا۔" بشریٰ خود کو جیسے مضبوط کرتے ہوئے قطعی لہجے میں بولی۔
"تم دونوں کی غلطی کی سزا اس ننھی جان کو ابھی سے کیوں دے رہی ہو تم۔" ذکیہ جتانے والے انداز میں بولیں۔
"ہم دونوں کی غلطی؟" وہ ماں کی غلطی پکڑ کر بولی۔
"میری کیا غلطی ہے کہ میں چپ چاپ آپ کی دی ہوئی مٹھائی کا ٹوکرا پکڑ کر ان کے پاس چلی گئی جو آپ نے مجھے کہا۔ وہی جا کر بول دیا... یہ ہے میری غلطی؟" وہ اس دن کا وہ تلخ ترین منظر دہرا کر بولی جسے سوچتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں کرچیاں چبھنے لگتی تھیں۔
اس نے پھر سے منہ دوسری طرف کر لیا۔
"جو ہوا سو ہوا۔ اب اس کو جتنا کھینچیں گے تکلیف ہی بڑھے گی۔" ذکیہ بات نپٹانے کے موڈ میں تھیں۔
"صرف میری تکلیف۔" بشریٰ اضطراب سے بولی۔
"اتنی خود غرض مت بنو۔" ذکیہ سے برداشت نہیں ہوا۔
"پہلے دن سے میں... تمہارا بھائی تمہارے ساتھ ہیں۔ دن رات کا سارا آرام سکون چین سب تمہاری ایک آنکھ کے اشارے سے جڑا ہے تم روتی ہو ہم روتے ہیں۔ تم مسکراتی ہو تو ہمیں چین کا سانس آتا ہے۔" ذکیہ بہت کچھ اسے گنوا کر بولیں۔
"امی! اب میری سمجھ میں آ رہا ہے... کہ عورتیں گھر والوں کے ہوتے ہوئے بھی دارالامان کیوں جاتی ہیں۔" وہ اذیت پسندی سے بولی۔
"بشریٰ!" ذکیہ کو تو جیسے کسی نے پتھر کھینچ کر مار دیا۔ "یہ سمجھتی ہو تم؟" وہ دکھ کے گہرے سمندر میں اتر گئیں۔
"امی! میں مثال کو اس شخص کے پاس اس گھر میں نہیں بھیجوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اب کوئی مجھے مجبور نہیں کرے گا۔ میں عدت گزاروں گی یہاں۔ اس کے بعد میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔ آپ دونوں پہ بوجھ

نہیں بنوں گی۔" وہ بے لچک لہجے میں کہہ کر اٹھی اور باہر نکل گئی۔
ذکیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
"اس لڑکی کو میں اب کیسے سمجھاؤں اور کب تک میں اسے یہاں بٹھا سکوں گی۔ میری زندگی کا کیا پتا اور یہ عمران... یہ میرا لحاظ نہیں کرتا۔ موڈ ہو تو ٹھیک ورنہ تو کون میں کون... اور یہ بشریٰ..." انہیں بہت کچھ سوچنا تھا اور دماغ تو جیسے ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ اس بشریٰ کو کون سمجھائے۔ میں تو ہار گئی اس کے آگے۔
ہاں وہ انسپکٹر طارق بھلا شخص ہے۔ وہ اگر اس کو مثال کو عدیل کو دینے کی دھمکی دے تو... شاید... انہیں راہ سجھائی دی تو وہ سوچنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں ایک دم سے گمبھیر سناٹا چھا گیا تھا۔ سب مہمان ایک ایک کر کے چلے گئے تھے۔
اور نسیم جو سوچ چکی تھیں، جس رات فوزیہ کو رخصت کریں گی۔ اس رات وہ خوب مزے سے سوئیں گی۔ سکون جیسا انہیں اس رات نصیب ہوگا، ویسا سکون انہیں کسی اور بات سے نہیں مل سکتا۔
مگر اب تو انہیں گھر کی طرف دیکھ کر خوف سا آ رہا تھا۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔
سارا فنکشن ہوٹل میں تھا۔ گھر ان چھوا اسی طرح صاف ستھرا پڑا تھا، جیسے دوپہر کو فوزیہ پارلر جانے سے پہلے اپنی نگرانی میں صاف کروا کے گئی تھی۔
"یہ عدیل کہاں رہ گیا۔" دونوں ہاتھوں سے پنڈلیوں کو دباتے ہوئے انہوں نے کوفت سے سوچا۔
"ایسا گو تم بدھ بنا پھرتا رہا ساری شادی میں، سب ہی نے پوچھا سبھوں نے سوال کیے اب میں اس سے کچھ کہوں گی تو بھڑک اٹھے گا اس ذرا سی چھوکری کے غم میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔"
وہ کڑھ کر سوچتی چلی گئیں۔
پھر کچھ سوچ کر فون اٹھا کر بمشکل عدیل کا نمبر نکال کر ملانے لگی تھیں کہ گھر کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ فون رکھ کر وہ اس کا انتظار کرنے لگیں۔
"میں بس وہ ہوٹل والوں کا کچھ حساب رہ گیا تھا۔ وہی کلیئر کرنے میں کچھ ٹائم لگ گیا۔" وہ بے حد تھکا ہوا سنجیدہ اور بہت اجنبی سا لگ رہا تھا۔ نسیم بیگم جو بہت کچھ سوچے ہوئے تھیں کہ عدیل کو خوب سنائیں گی کہ آج اس بشریٰ کی وجہ سے کیسے کیسے انہیں خاندان بھر کی باتیں سننا پڑیں، مگر عدیل کو اتنا سنجیدہ دیکھ کر کچھ ایسا بول ہی نہ سکیں۔
"تھک گئے ہو بہت۔" وہ یہی کہہ سکیں۔
"ہاں" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔
"آ جاتی مثال بھی۔ وہ بشریٰ سے بھیج دیتی تو وہ پھوپھی کی شادی تو دیکھ لیتی۔ فوزیہ آخری لمحے بھی جاتے ہوئے مثال کی راہ دیکھتی رہی۔" صرف عدیل کے مزاج کا درجہ بھانپنے کے لیے انہوں نے اس طرح مثال کا ذکر چھیڑا۔
عدیل کچھ نہیں بولا۔
دونوں بالکل خاموش تھے۔
نسیم بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا بات کریں۔ جس سے عدیل کا مزاج کچھ کھلے اور عدیل کے پاس تو جیسے کوئی بات ہی نہ رہی تھی کرنے کو۔ "وہ سلمیٰ کی دونوں بیٹیوں کو دیکھا تم نے لگتا ہی نہیں اتنے سال کینیڈا میں رہ کر آئی ہیں وہ لڑکیاں۔" نسیم نے موضوع کے لیے راہ ہموار کی۔
"امی! آپ کو کچھ چاہیے تو نہیں۔ میں تھک گیا ہوں کافی، سونے جا رہا ہوں۔" اس نے جیسے نسیم کی بات سنی

ہی نہیں۔ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔
"نہیں۔ ہاں پانی کا گلاس لا دو، روز تو فوزیہ رکھتی تھی ابھی سوچا بھی تھا کہ خود جا کر لے کر آتی ہوں، پھر بھول گئی۔" لہجے میں مسکینی سمو کر نسیم کہنے لگیں مگر عدیل اس سے پہلے ہی پانی لینے جا چکا تھا۔
گلاس نسیم کے سرہانے رکھ کر وہ کچھ کہے بغیر مڑ کر جانے لگا۔
"عدیل!" نسیم کو اکیلے پن سے عجیب ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔
"میں تو کہتی ہوں کل کسی طرح جا کر مثال کو لے آؤ مجھ سے تو گھر کا سونا پن دیکھا نہیں جا رہا۔" وہ لہجے میں نمی سی لیے ہوئے بولیں۔
عدیل نے پہلے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا پھر کچھ بھی جواب دیے بغیر خاموشی سے چلا گیا۔
"اب کیا ہو گا۔ یہ لڑکا تو بہت عجیب سا ہو گیا۔ مجھے تو اندازہ نہیں تھا کیسے یہ کھلے گا۔ اس کے دل میں کیا ہے وہ بچی گھر آئے گی تو شاید یہ ٹھیک ہو جائے۔ بعد میں شادی کروا دوں گی، خود ہی بچی کی طرف سے دھیان ہٹ جائے گا تو اسے بشریٰ کے پاس واپس بھجوا دوں گی۔" نسیم کو فوراً یہ اس مسئلے کا سوجھا۔

☼ ☼ ☼

"جی فرمائیے۔"
"ہمیں آپ کا اوپر والا پورشن دیکھنا تھا۔ عاصمہ دروازہ کھول کر کچھ متذبذب سی کھڑی رہ گئی۔
سامنے کھڑی عورت ادھیڑ عمر تھی۔ پینتالیس چھیالیس سال کی۔ حلیے سے اچھے گھر کی لگتی مگر...
اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اسے بہت عجیب سی لگیں۔ جانے کیوں بظاہر وہ اچھے لباس میں تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سیاہ اور سفید کانچ کی سادہ چوڑیاں تھیں۔ باقی اس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔
"آپ کو کس نے بھیجا ہے یہاں۔" اب اسے کچھ تو پوچھنا تھا۔
"الیاس بھائی نے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ کا اوپر والا پورشن خالی ہے۔" وہ ذرا بھاری آواز کی مالک تھی۔
اس کے ماتھے پر گہری گہری دو تین لکیریں تھیں۔
یہ جھریاں بھی نہیں تھیں کہ اس کے چہرے کی باقی جلد کسی ہوئی تھی۔
"آپ کے ساتھ کون ہے۔" اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔
"ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی تو ہوتا ہے خواہ اس کا ہمزاد ہی کیوں نہ ہو" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی تھی۔
"جی!" عاصمہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔
"عادت ہے میری مذاق کرنے کی۔" اگرچہ یہ مذاق نہیں تھا مگر اس عورت کو لگا تھا تو خود ہی مزے لے کر بولی۔
"ویسے میری اماں اور میری بہنیں ہیں میرے ساتھ۔ دونوں گاؤں گئی ہوئی ہیں دو دن میں آ جائیں گی۔ اس سے پہلے تین گلیاں چھوڑ کر رہ رہی تھیں۔ وہ مالک مکان۔ مطلب وہ آدمی۔" وہ رکی جیسے کوئی موزوں سا بہانہ سوچ رہی ہو۔
"آدمی تو شاید بہتر ہو انسان اچھا بالکل نہیں تھا۔" وہ سر ہلا کر بولی۔
عاصمہ اس کی باتوں پہ کچھ چکرا سی گئی۔ "میں سمجھی نہیں۔" عاصمہ نے دل میں سوچ لیا اس عورت کو گھر بالکل نہیں دینا۔
"اگر آپ مجھے گھر دکھا دیں تو میں کچھ سوچ لوں کیونکہ مجھے گھر آج ہی چاہیے۔" وہ عورت کچھ عجلت سے بولی۔ عاصمہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ صاف جواب کیسے دے۔
الیاس کو یوں اس عورت کو اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔

"ویسے میں آپ کی تعریف کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ نے جس طرح اپنے شوہر کے بعد اپنے بچوں کو سنبھالا وہ واقعی قابل تعریف ہے۔" وہ عورت صحن میں آ چکی تھی۔ کمروں سے جھلکتا سلیقہ اور صفائی دیکھ کر تعریفی انداز میں بولی۔
"جی۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟" عاصمہ کو کچھ حیرت ہوئی۔ "یہ آپ کے ماتھے پر۔ جو بیوگی کی لکیر ہے بالکل معدوم سی جس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ چند ماہ... سال پورا نہیں ہوا ابھی آپ کے شوہر کو مرے ہوئے۔ ہے نا؟" وہ عاصمہ کے ماتھے پر انگلی پھیر کر بولی۔ عاصمہ کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس کی انگلی برف کی طرح سرد تھی۔ اسے لگا جیسے کسی نوک دار چیز نے اس کی پیشانی کو ذرا سا چھیل دیا ہو۔ اس نے بے اختیار اپنی پیشانی کو چھوا۔ "اور بھروسا ایک بار جو ایسے ویسے شخص پر کر چکی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا محتاط انداز آپ کے لیے بہت سود مند رہے گا۔" وہ عاصمہ کی نظروں کو اپنے حصار میں لے کر بولی۔ عاصمہ جیسے اس کی نظروں کے گھیرے میں الجھ کر رہ گئی۔ وہ اسے باہر بھیجنا چاہتی تھی۔ خود دور جانا چاہتی تھی۔ مگر اس عورت کی نظروں نے جیسے اسے بے بس کر دیا تھا وہ جیسے جکڑی کھڑی تھی۔ وہ عورت اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔ عاصمہ شدت سے وہاں سے بھاگنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے دونوں پاؤں زمین نے پکڑ لیے تھے۔ "ابھی چند مہینے تمہیں نوکری نہیں ملے گی بلکہ سال بھر تو ہے ہی نہیں ایسا کوئی سلسلہ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہولے سے گہری آواز میں بولی۔ عاصمہ تو کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ "میں اچھا کرایہ دوں گی اور یہ اس کا ایڈوانس اور یہ دو مہینے کا کرایہ۔ بس میری صرف ایک شرط ہے کہ اوپر نہیں آؤ گی اور نہ تمہارا کوئی بچہ ورنہ مشکل ہو جائے گی ہم دونوں کے لیے۔" وہ اپنے برف جیسے سرد اور سنگلاخ ہاتھ سے عاصمہ کے ہاتھ میں رقم تھما چکی تھی۔
"ویسے ہم دونوں بہنوں کی طرح رہیں گی۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" اس نے آہستہ سے عاصمہ کے چہرے پہ پھونک ماری۔ پلکیں دوبارہ جھپکیں اور یونہی ہنس کر بولی۔ عاصمہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی کی سخت گرفت سے آزاد ہوئی ہو۔ اسے کسی نے دھکا دے کر پرے کیا ہو۔ وہ جھرجھری سی لے کر پیچھے ہوئی۔
"یہ لو بیٹے حساب کتاب تو ماں بیٹی میں بھی چلتا ہے۔" وہ بڑے بے تکلف انداز میں بولی۔ عاصمہ سحر زدہ سی یونہی نوٹوں کو ہاتھ میں پھرانے لگی۔ ورنہ اسے کوئی گنتی کوئی حساب کتاب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "میرا نوکر ابھی میرا سامان لے کر آ رہا ہے۔ باہر سے سیڑھیاں ہیں نا۔ اس لیے مجھے تمہارا یہ گھر پسند آیا ہے۔ پھر اس کی چھت بھی ہے۔ مجھے ایسا ہی گھر چاہیے تھا جس کے اوپر کھلا آسمان ہو۔" وہ سر اٹھا کر اوپر والے پورشن کو دیکھے جا رہی تھی۔ "چابیاں۔" اس نے ہاتھ عاصمہ کے آگے پھیلایا۔ عاصمہ خاموشی سے اندر گئی اور دیوار سے لگی کیل پر لٹکی چابیاں لا کر اس نے عورت کو تھما دیں۔ "ہوں بہت سمجھ دار ہو تم اور فرماں بردار بھی۔" وہ چابیاں مٹھی میں لے کر جیسے خوش ہو کر بولی۔ "یہ اپنی چھوٹی بچی کو دودھ میں ملا کر دے دو۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہو گی۔" اس نے دوسرا ہاتھ کھول کر ایک پڑیا سی اس کے آگے کی۔ عاصمہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ "لے لو تمہارے فائدے کی چیز ہے بلکہ تم سب بھی اسے گھول کر ایک ایک گھونٹ پی لو تو کبھی کوئی بیمار نہیں پڑے گا تم سمجھ رہی ہو ناں میری باتیں۔" کہتے ہوئے وہ بے تکلفی سے اندر کے کمروں کا چکر بھی لگا آئی۔ عاصمہ وہیں گڑی کھڑی تھی۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔
"سر میں درد ہے تو لاؤ میں دبا دیتی ہوں۔ تمہارا سر۔" وہ اس کے سامنے آ کر بہت محبت بھرے انداز میں بولی۔ عاصمہ لرز کر پیچھے ہٹی۔
"نہیں اب میں ٹھیک ہوں۔" اسے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ "تم ڈر تو نہیں گئیں۔" وہ لڑکیوں جیسی ہنسی کے ساتھ بولی۔ عاصمہ ڈرے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ "میں اوپر ہوں۔ ابھی میرا نوکر سامان لائے گا تو

میں باہر والا دروازہ کھول دوں گی۔ تمہیں زحمت نہیں ہوگی۔" وہ کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
"اور ہاں کوئی اوپر نہیں آئے گا۔ میری صرف یہی شرط ہے۔" وہ کہہ کر سرخ آنکھوں سے عاصمہ کو دیکھتی چلی گئی۔ عاصمہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پہ گر گئی۔ اس کے سر میں اب زور کا درد ہو رہا تھا۔ جی متلا رہا تھا جیسے ابھی قے آجائے گی۔ مجھے اس عورت کو گھر نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ عورت... اچھی لگتی ہے مگر مجھے کسی پہ اتنی جلدی بھروسا نہیں کرنا۔ وہ خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "مجھے ہاشم بھائی کہہ کر بھی گئے تھے کہ ڈیلر کے بغیر کسی کرائے دار کو گھر میں نہیں گھسانا۔ مگر یہ عورت... یہ تو بہت بے ضرر سی ہے۔ مجھے اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔" اس کا دل عجیب طرح سے دورائے دے رہا تھا۔ اس نے مٹھی میں ٹھنڈے پسینوں سے گیلے ہوئے نوٹوں کو سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جتنا کرایہ پچھلے کرائے دار دیتے تھے یہ اس سے دوگنا تھا اور پھر دو ماہ کا ایڈوانس یہ سب تو کوئی بھی نہیں دیتا۔ مگر یہ اکیلی عورت... اور کوئی اوپر نہیں آئے گا۔ یہ کیا شرط ہوئی بھلا۔ مجھے الیاس بھائی سے بات کرنا چاہیے۔ مگر نہیں اچھی عورت ہے۔ اس کی آنکھیں بند سی ہونے لگیں۔ وہ وہیں آڑی ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ نوٹ اس کے ہاتھوں میں کھلے پڑے تھے۔ اور چھت پہ کھڑی وہ عورت عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی سوئی ہوئی عاصمہ کو دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مگر انسپکٹر صاحب! میری بچی... وہ مثال کو مجھے واپس نہیں کرے گی۔ میں اس کی فطرت کو جانتی ہوں۔" بشریٰ سخت متذبذب تھی۔ انسپکٹر طارق مثال کو ساتھ لگائے کھڑا تھا۔
"محترمہ! آپ کو میرا اعتبار تو کرنا چاہیے میں نے آپ کو اپنی گارنٹی دی ہے۔ جس طرح اس گڑیا کو میں آپ سے لے کر جا رہا ہوں۔ اسی طرح میں اسے واپس آپ کو لا کر دوں گا۔ رات کو یہ آپ کے پاس ہوگی یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" انسپکٹر طارق پر اعتماد لہجے میں بولا۔ بشریٰ نے متذبذب نظروں سے ماں اور بھائی کی طرف دیکھا دونوں کچھ گھنٹوں کے لیے مثال کو بھیجنے کے لیے راضی تھے۔ پھر یہ انسپکٹر طارق جس طرح اس نے بشریٰ کو قائل کیا اور سچی بات ہے انسپکٹر طارق میں قائل کرنے کے علاوہ کچھ ایسی دھمکا دینے والی صلاحیت تھی کہ بشریٰ واقعی ڈر گئی تھی۔ قانون کے ذریعے عدیل مثال کو مستقل اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں قانون پولیس ہی تو ہے۔ اور بشریٰ کے سامنے یہ انسپکٹر ہی قانون تھا۔
پھر رات بھر مثال کو بخار رہا تھا۔
وہ ساری رات بابا' بابا پکارتی رہی تھی۔ اگرچہ صبح اٹھ کر اس نے باپ کے پاس جانے سے انکار بھی کیا تھا۔ مگر بشریٰ جانتی تھی کہ اس معصوم کا دل کیسے باپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اتنے سارے دن تو وہ عدیل سے ملے بغیر کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ مثال کی شکل' اس کی زرد رنگت اور بجھی ہوئی آنکھوں نے اس کے لیے اس مشکل فیصلے کو جیسے آسان کر دیا تھا اور پھر چند گھنٹوں کی کیا بات تھی۔ تین بجے سے... شام سات آٹھ بجے تک۔ مثال پھر اس کے پاس ہوگی۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر ہاں کہہ دی۔ عمران اور انسپکٹر طارق مثال کو لے کر چلے گئے اور وہ آنسو چھپانے کے لیے وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی۔ عدیل کے لیے یہ لمحات ناقابل یقین تھے۔
اتنے سارے دنوں کے بعد اس کی مثال اس کی زندگی' اس کی زندگی کا مقصد سب کچھ اس کی بیٹی مثال اس کی بانہوں میں تھی۔ وہ پاگلوں' دیوانوں کی طرح اسے چومے جا رہا تھا۔ پیار کیے جا رہا تھا۔ کبھی رو رہا تھا کبھی ہنس رہا تھا۔ بیٹے کی دیوانگی دیکھ کر نسیم کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے پہلی بار بڑے ملال اور دکھ کا شکار ہوئیں۔ کاش! وہ اپنے بیٹے کو ایسے مشتعل نہ کرتیں۔ کاش! وہ فضول ضد ان کے دماغ میں بھی

ماتی کاش! یہ سب کچھ کرنے سے پہلے بیٹے کی خوشی اس کی زندگی کا بھی سوچ لیتیں۔ فوزیہ تو اپنے گھر چلی گئی صرف چند دنوں کے فرق سے' صرف چند دنوں کے لیے وہ اتنی خود غرض' بے حس نہ ہوتیں۔ ان کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں اور عدیل کے سامنے اقرار کریں کہ آج جو اس کی حالت ہے' اس کی ذمہ دار صرف اس کی خود غرض ماں ہے۔ مائیں خود غرض ہو جائیں تو اولاد کی زندگی اسی طرح بنجر اور ویران ہو جایا کرتی ہے۔
"بس عدیل! اب ہم نے مثال کو واپس نہیں بھیجنا۔ ہم دونوں ماں بیٹا اسے مل کر پال لیں گے۔ ہماری گڑیا ہمارے پاس ہی رہے گی۔" دل کم بخت اور ضمیر بد تمیز کے شور و غل سے گھبرا کر نسیم نے جھپٹ کر مثال کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے عدیل سے کہا۔ "نہیں امی!" عدیل آنکھیں صاف کرتے ہوئے آہستگی سے مسکرایا۔
"ہم یہ نہیں کر سکتے۔"
"کیوں نہیں کر سکتے لو ہماری بچی ہے ہمارا مال۔ کوئی اور حق جتا نہیں سکتا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ عدیل ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔ "حق جتانے کے قابل رہا ہی کب ہوں میں۔" وہ گہرے دکھ سے بولا۔ "بابا! میں آپ کے پاس ہوں نا۔" مثال بے اختیار باپ کے ساتھ لگ کر بہت تسلی بھرے انداز میں بولی۔
"ہاں میری بیٹی میری جان میرا سب کچھ تم ہی تو ہو۔ تم ہو تو تمہارے بابا کے سینے میں بھی دل دھڑکے جا رہا ہے۔ تم مجھ سے چھن جاؤ گی نا! تو یہ دل بھی چپ ہو جائے گا۔" وہ اسے ساتھ لگا کے جذب کے عالم میں بولا۔
"اللہ نہ کرے عدیل! میرے بچے! تو باپ ہے تو میں بھی تیری ماں ہوں۔ ایسا الٹا سیدھا بولتے وقت میرا بھی خیال کر لیا کر۔" نسیم بیگم پیار بھری دھونس سے بولیں۔ عدیل صرف مسکرا کر رہ گیا۔
"اب میری بیٹی بتائے آج کہاں کہاں جانا ہے شاپنگ پر پہلے اور پھر پلے لینڈ میں آئس کریم اور جو کچھ میری گڑیا کہے گی۔"
"بابا! ہم گھر میں رہتے ہیں یاں دادو کے پاس۔ یہ بھی تو اکیلی ہیں۔" جو بات عدیل نہیں محسوس کر سکا تھا۔ وہ چھوٹی سی بچی نے جان لیا۔ نسیم کی آنکھوں سے تو آنسو ہی بہنے لگے۔ عدیل بھی چپ ہو گیا۔
"جان! آج میں نے آپ کی خاطر آفس سے چھٹی کی ہے۔ ہم تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ تو پھر دادو کے پاس ہی ہوں گے۔" وہ بچی کو بہلا کر بولا۔
"بلکہ امی! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے نا آپ تو کہیں بھی آتی جاتی نہیں۔" ماں کی دل جوئی کے خیال سے وہ کہہ ہی گیا۔
"نہیں... عدیل! یوں بھی ابھی فوزیہ اور خالد نے آنا ہے ملنے' گھر پہ نہیں ہوں گی تو اچھا نہیں لگے گا۔ اگلے ہفتے انہوں نے چلے جانا ہے' تم تھوڑی دیر کے لیے مثال کو لے جاؤ' پھر یہ آکر پھوپھی سے بھی مل لے گی جا! میری گڑیا! کچھ وقت باپ کے ساتھ گزار لے۔" وہ دل سے مثال کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔ "ہاں یہ دن بھی آنے تھے وقت گزارنے کو میرے بچے نے ترسنا تھا اپنی بیٹی کے ساتھ۔" وہ انہیں جاتے دیکھ کر آہ سی بھر کر بولیں۔
"سب میری جلد بازیوں کے رنگ ہیں۔" اس سے پہلے کہ پھر سے ضمیر لتاڑنا شروع کرے۔ وہ یوں ہی اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگیں۔
"فوزیہ اور خالد آئیں گے تو کھانے کے لیے کیا ہو گا۔ میں نے عدیل سے کہا بھی نہیں کہ آتے ہوئے کچھ لے آئے۔ اتنے دنوں سے ماں بیٹا جس طرح بازار کی روٹیاں کھا رہے ہیں۔ سالن تو جیسے تیسے بنا لیتی ہوں۔ یہ کوئی مستقل حل تو نہیں' مجھے دو چار دنوں میں عدیل سے بات کرنا ہوگی' وہ آگے کی پلاننگ سوچنے لگیں۔
"بلکہ فوزیہ سے کہتی ہوں۔ وہ عدیل سے بات کرے۔ میری بات پہ تو بھڑک اٹھے گا۔ مگر فوزیہ کی بات کم از کم تحمل سے سن تو لے گا۔ یہ صحیح رہے گا۔ اب فوزیہ آئی تو اس سے بات کرتی ہوں۔ بھائی یہ گھرداری کے سلسلے مجھ

بڑھیا سے نہیں چلنے والے۔" وہ خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتے ادھر ادھر ٹہلتی ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چلا کر یونہی چینل گھماتے ہوئے کچھ سوچتی چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ اچھی عورت نہیں ہے۔" واثق شام کے دھلے کپڑے اتار کر لایا تو ماں سے بولا۔
آٹا گوندھتی عاصمہ چونک کر رہ گئی۔
"کون سی عورت؟" وہ لمحہ بھر کو سمجھ نہیں سکی۔
"جو عورت آپ نے رینٹ پہ رکھی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔
"رینٹ پر عورت۔" عاصمہ کی ہنسی نکل گئی۔
"بیٹا اچھی عورت ہے' یوں نہیں کہتے۔" وہ سمجھانے کو بولی۔ واثق طریقے سے اپنے اور بہنوں کے کپڑے الگ کرنے لگا۔
"میں جو کہہ رہا ہوں' وہ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کس طرح کی ہے۔ مطلب مما آئی ایم کنفیوژڈ... میں کیسے کہوں... she looks بہت عجیب سی دکھتی ہے اور اس کی آنکھوں میں مما آپ اسے نہیں رکھیں۔" وہ بچہ جو بہت سمجھ دار بہت سیانا بچہ تھا اس عورت کے الگ ہونے کو بھلا کیسے محسوس نہ کرتا۔ عاصمہ ٹھٹک کر رہ گئی۔
"تم اس سے ملے تو نہیں؟" ایک دم سے اسے... خوف نے گھیرا تو واثق کا بازو سختی سے پکڑ کر بولی۔
"نہیں مما۔" ماں کے انداز سے کچھ ڈر کر بولا۔
"میں نے صرف اسے دیکھا تھا اور..." وہ بولتے ہوئے رک گیا۔
"اور کیا دیکھا؟" وہ کچھ خوف زدہ سی تھی۔
"مجھے نہیں پتا مما اوپر کمرے میں دھواں سا تھا۔" وہ رک کر بولا۔
عاصمہ اور بھی پریشان ہو گئی۔ اس کی دی ہوئی رقم سے وہ جا کر تھوڑا بہت راشن لے آئی تھی اگرچہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا مگر صرف یہی سوچ کر کہ الیاس بھائی سے جا کر کہوں گی کہ کسی اور کرائے دار کو ڈھونڈیں مگر...
"فورا" یہ خرچ کی ہوئی رقم کہاں سے بھرے گی رات سے گھر کا راشن بھی ختم تھا۔ نوکری کا کوئی سلسلہ نہیں تھا خالی ٹیوشن سے گھر تو نہیں چل سکتا تھا۔ بجلی اور گیس کے بل بھی جمع کروانے والے تھے۔
"مما کیا سوچنے لگیں آپ؟" واثق ماں کو گہری سوچ میں گم دیکھ کر بولا۔
"میں جا کر الیاس انکل کو بلا کر لاؤں۔" وہ ماں کا چہرہ پڑھنے لگا تو بخوبی جان گیا تھا تسلی دینے والے انداز میں بولا۔
"واثق میں کچھ رقم خرچ کر چکی ہوں اس عورت کے ایڈوانس سے۔" اسے بھی واثق سے اپنی پریشانی کہہ دینے کی عادت ہو گئی تھی۔ روہانسی ہو کر بولی۔
"تو وہ تو ہم نئے کرائے دار سے لے کر انہیں واپس کر دیں گے۔ آپ باقی کی رقم خرچ نہیں کریں۔" وہ چٹکی بجاتے ہی مسئلہ حل کرتے ہوئے بولا۔
عاصمہ مسکرا دی۔ اس کا بیٹا واثق بہت سمجھ دار تھا جو بات سامنے رکھی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔
"ہوں ٹھیک ہے جاؤ بلا کر لاؤ' ایسے میں خالہ حمیدہ ہوتیں تو مجھے اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ سارا معاملہ سنبھال لیتی ہیں اب تو اکیلی سی پڑنے لگی ہوں میں' پتا نہیں وہ کب آئیں گی۔" وہ بڑبڑا کر بولی۔
"میں جو ہوں مما آپ کے ساتھ۔" وہ بڑے عزم سے بولا۔ عاصمہ کو واقعی اس پر فخر سا ہوا۔ اس عورت نے جس طرح عاصمہ کو ٹریپ کر کے گھر حاصل کیا تھا اگر وہ واثق کو بتا دیتی تو شاید وہ ڈر جاتا۔

☼ ☼ ☼

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ تو میرے جیتے جی ممکن نہیں۔" بشریٰ تڑپ کر بولی۔
ذکیہ نے اس کی بات یوں سنی جیسے اس نے بہت معمولی سی بات کی ہو۔ یا جیسے انہیں پہلے ہی پتا تھا کہ بشریٰ یہی کہے گی۔
"نہیں امی!" وہ پھر زور دے کر بولی۔
"آج نہیں تو کل... کل نہیں تو کچھ مہینوں بعد تمہیں اس بات کو سوچنا ہوگا۔" ذکیہ بے نیازی سے بولیں۔ بشریٰ شاکڈ سی ماں کو دیکھتی رہ گئی۔
"بہرحال تم ساری زندگی یوں ہی تو نہیں بیٹھ سکتیں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور بچی کا ساتھ ہے۔ بہرحال تحفظ کے لیے اور پرورش کے لیے ایک مرد کے سہارے کی ضرورت پڑے گی تمہیں یہ سوچنا ہی ہوگا۔" ذکیہ نے بہت طریقے سے یہ سب کہا جیسے بشریٰ جو بھی رد عمل ظاہر کرے انہیں فرق نہیں پڑے گا۔ بشریٰ نے ناراضی سے ماں کی طرف دیکھا۔
"میں ایسا کبھی نہیں کروں گی میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" وہ پھر سے سخت لہجے میں بولی۔
"تمہاری عدت کچھ دنوں میں ختم ہونے والی ہے دو ایک جگہ میں نے بات چلائی ہے اور مجھے امید ہے۔"
"امی..." وہ اتنی زور سے چیخی کہ بستر پر سوئی مشال بھی ڈر کر اٹھ بیٹھی۔
"مما... مما... کیا ہوا؟" اس کی نیند بہت کچی ہو گئی تھی۔ ذرا سے کھٹکے سے ڈر کر اٹھ جاتی تھی۔
"کچھ نہیں میری جان تم سو جاؤ کچھ نہیں ہوا۔" وہ اسے ساتھ لگا کر تھپکنے لگی۔ ذکیہ مطمئن سی بیٹھی تھیں۔
"تمہیں پتا ہے نسیم عدیل کے لیے لڑکی دیکھتی پھر رہی ہے۔" وہ اپنے تئیں دھماکا کرتے ہوئے بولیں۔ بشریٰ کے ہاتھ مشال کو تھپکتے وہیں رک گئے۔
"وہ اپنے بیٹے کا کر سکتی ہے تو میری بچی تم تو پھر..."
"امی اس سے آگے کچھ نہیں۔" وہ سخت لہجے میں ماں کو ٹوک کر بولی۔
"میری عدت ختم ہو جائے تو آپ عمران کی شادی کی تاریخ رکھیں۔ اس کی شادی کریں میں کہیں بھی جاب کر لوں گی اور اوپر والے کمرے میں چلی جاؤں گی۔ آپ اور آپ کے بیٹے بہو کی زندگی میں دخل نہیں دوں گی۔ اس لیے آپ مجھ سے دوبارہ یہ سب نہیں کہیں گی۔" وہ حتمی انداز میں بولی۔
"بشریٰ تم سمجھ نہیں رہیں میری بچی یہ پہاڑ سی عمر یوں نہیں گزرے گی' تمہیں ایک ساتھی کی اور مشال کو ایک باپ کی ضرورت ہے۔" وہ اب کے کچھ عاجزی سے بولیں۔
"عدیل جیسا باپ مل سکتا ہے مشال کو کہیں۔" وہ طنز سے بولی۔
"نہیں" ذکیہ قطعیت سے بولیں۔
"مگر اس کے باوجود اسے ایک باپ کی چھت چاہیے۔ تو تمہیں ایک مرد کا تحفظ۔"
"امی مجھے نیند آرہی ہے' مجھے سونے دیں۔ پلیز!" وہ اکتا کر بستر پر لیٹتے ہوئے بولی۔
"انسپکٹر طارق شادی کرنا چاہتا ہے تم سے۔" ذکیہ نے اپنے تئیں ایک اور بم پھوڑا۔ اور بشریٰ ساکت سی ماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔
"امی یہ کیا کہا آپ نے۔" وہ خوف زدہ سی سوئی ہوئی مشال کو ایک نظر دیکھ کر بولی۔
"وہ شادی شدہ ہے لیکن بیوی کی سال بھر پہلے بچے کی ڈیلیوری کے دوران موت ہو گئی تھی بہت سلجھا ہوا سمجھ

دار شخص، پھر خاندان بہت اچھا ہے مثال سے تمہاری محبت اور وابستگی سے بھی بخوبی واقف ہے اس لیے اس رشتے میں رکاوٹ نہیں بنے گا کہ..... تم سے مثال کو دور کر دے۔" ذکیہ بہت مطمئن تھیں۔

یہ رشتہ حقیقتاً" ذکیہ کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ ایسا اچھا خوب رو جوان، پھر ایسی نوکری، اچھا گھر خاندان، سمجھو تو کنوارا بشریٰ کو اس سے اچھا رشتہ کہاں سے مل سکتا تھا۔

انہوں نے تو دل میں سوچ لیا تھا چاہے کوئی بہت بڑا ڈراما کرنا پڑے اپنی جان لینے کا، وہ بشریٰ کو مجبور کر کے ہی چھوڑیں گی طارق کا ہاتھ تھامنے کے لیے۔

جب سے انسپکٹر طارق نے یہ پیغام دیا تھا ذکیہ تو ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔

اب انہیں صرف بشریٰ کی عدت ختم ہونے کا انتظار تھا۔

"امی! آپ انہیں انکار کر دیں ورنہ میں کہہ دوں گی کیونکہ مجھے دوسری شادی نہیں کرنی..... کبھی نہیں، پہلی نے جتنے دکھ دیے ہیں۔ اس کے بعد میں ایسا سوچوں گی بھی نہیں اور آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔" کہہ کر وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ ذکیہ وہیں بیٹھی کچھ سوچتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ یوں ہی عشاء کی نماز کے بعد لیٹی تو اونگھ سی آ گئی۔ ابھی کچن میں برتن بھی دھونے والے تھے اور بچوں کے یونیفارم بھی استری کرنے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو بچے بھی سو چکے تھے وہ جلدی جلدی اٹھ کر کام نپٹانے لگی۔

برتن دھو کر کچن صاف کیا اور کچن بند کر کے کمرے میں آ کر کپڑے استری کرنے لگی۔

بارہ بجنے کو تھے۔

اس نے بچوں کے اوپر کمبل ڈالا اور خود باہر نکل آئی۔ باہر کافی خنکی سی تھی۔

وہ یونہی ٹہلنے لگی۔

بے وجہ ہی عفان کی یاد ستانے لگی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"عفان! میں بہت تھکنے لگی ہوں ابھی سے، ابھی تو آپ کے بعد چند قدم بھی نہیں چلی اور لگتا ہے۔ یہ سفر کبھی تمام نہیں ہو گا۔" وہ ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے یونہی روئے گئی۔

ایک دم سے اسے زور کی کھانسی آئی اور پھر آتی ہی چلی گئی۔

وہ منہ کے آگے ہاتھ رکھے کھانسی کو روکنے لگی۔

صحن میں سرخ رنگ کا دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔

وہ ایک دم سے ڈر گئی۔

"سرخ دھواں..... تو نہیں ہوتا۔" وہ تیزی سے بچوں کے کمرے کا دروازہ بند کرنے دوڑی۔

مگر اسے مسلسل کھانسی آتی جا رہی تھی۔

"یہ اس وقت کس نے کیا جلایا ہے۔ کیا ہے یہ۔" اس نے بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی دھواں ان کی اپنی چھت سے آ رہا تھا۔

وہ خوف زدہ سی کھڑی رہ گئی۔

لحہ بہ لحہ دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔

"یہ خبیث عورت کر کیا رہی ہے آخر؟ آخر یہ کوئی وقت ہے آگ جلانے کا۔ میں منع کرتی ہوں اسے جا کر۔"

وہ آخر برداشت نہ کر سکی تو تیزی سے بیرونی دروازہ کھول کر آہستہ قدموں سے اوپر کی سیڑھیاں چڑھ میں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔

وہ کچھ دیر باہر کھڑی رہی آگے بڑھے یا واپس چلی جائے پھر وہ آہستگی سے بند دروازے کی طرف بڑھی۔

کمرے کی کھڑکی ذرا سی کھلی تھی اور دھواں وہیں سے نکل رہا تھا۔

اس نے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا اور ساکت سی کھڑی رہ گئی۔ اندر کے عجیب منظر نے اس کو جیسے وہیں کھڑکی کے ساتھ جکڑ دیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"انسپکٹر طارق!" اس نے تو آنکھیں بند کیں اور چھم سے اس شخص کا سراپا اس کے سامنے آ گیا۔

وہ دوبار اس شخص سے ملی تھی مگر اسے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔

"امی جو کچھ کہہ کر گئی ہیں۔ اس بات میں کتنی حقیقت ہو گی بھلا؟" وہ سوچنے لگی۔

"ہو بھی تو مجھے نہیں سوچنا۔ میں کیوں سوچ رہی ہوں یہ سب، جب مجھے اس شخص کے بارے میں یا دوسری شادی کے بارے میں سوچنا ہی نہیں تو۔" اس نے خود کو جھڑکا۔

"دوسری شادی..... آہ!" اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ عدیل کے علاوہ، عدیل کے سوا..... ایک شخص تھا جو اس کی زندگی میں عدیل سے بہت پہلے آیا تھا اور اس نے اس کو بہت سوچا اور چاہا بھی تھا..... مگر وہ تو بہت پہلے کی بات تھی۔ عدیل سے پہلے کی بات۔

عدیل کے بعد تو اس نے کبھی بھول کر بھی اس گزرے کل کو نہ سوچا تھا۔ نہ چاہا تو پھر یہ تیسرا شخص کہاں سے بیچ میں آ گیا۔

"نہیں مجھے نہیں سوچنا میں امی..... نہیں میں طارق سے بات کر کے اسے صاف خود انکار کر دوں گی ورنہ امی تو سمجھا سمجھا کر مجھے پاگل کر دیں گی۔ ماں باپ الگ الگ کر دینے کے بعد میں اپنی بچی کو کسی تیسرے اجنبی شخص کے حوالے کروں..... کبھی نہیں۔" وہ فیصلہ کر کے مطمئن سی ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگی کہ گیٹ پر بجتی بیل نے اسے چونکا دیا۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے بھلا۔" بارہ بج چکے تھے۔

تین بار مسلسل بیل کے بجنے پر اسے مجبوراً" اٹھنا ہی پڑا شاید عمران بھی آج جلدی سو گیا امی نے تو نیند کی گولی لی ہو گی۔

"کہیں عدیل تو نہیں..... نہیں وہ نہیں ہو سکتا۔" گیٹ کے پاس پہنچ کر وہ سوچنے لگی۔

پھر سے بیل بجنے پر بے اختیار پوچھے بغیر اس نے گیٹ کھول دیا۔

"تم..... یہاں!" وہ سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

پھر رات کے پہلو میں سحر ڈھونڈ رہے ہیں
ہم پھر کوئی امکانِ سفر ڈھونڈ رہے ہیں

بے نام خموشی ہے جہاں پچھلے دنوں سے
گھبرا کے وہاں زخمِ جگر ڈھونڈ رہے ہیں

یہ شام ڈھلے اب بھلا گھر سے نکل کر
کس کو یوں سرِ راہ گزر ڈھونڈ رہے ہیں

کس کے لیے بے تاب ہوئی جاتی ہیں آنکھیں
اخبار میں یہ کس کی خبر ڈھونڈ رہے ہیں

دیوانگی لے آئی ہے کس موڑ پہ ہم کو
گھر لوٹ کے آئے ہیں تو گھر ڈھونڈ رہے ہیں

اب حبس بڑھا ہے تو ہواؤں کی طلب ہے
اب دھوپ بڑھی ہے تو شجر ڈھونڈ رہے ہیں

جو درد کی بجھتی ہوئی لو پھر سے بڑھا دے
پھر دستِ صبا میں وہ ہنر ڈھونڈ رہے ہیں

شمیم فاطمہ

نہ پوچھ کیوں مری آنکھوں میں آگئے آنسو
جو ترے دل میں ہے اس بات پر نہیں آئے

ابھی ابھی وہ گئے ہیں مگر یہ عالم ہے
بہت دنوں سے وہ جیسے نظر نہیں آئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں
وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آئے

عجیب منزلِ دلکش عدم کی منزل ہے
مسافرانِ عدم لوٹ کر نہیں آئے

نہ چھیڑ ان کو خدا کے لیے کہ اہلِ وفا
بھٹک گئے ہیں تو پھر راہ پر نہیں آئے

حفیظ کب انہیں دیکھا نہیں برنگِ دگر
حفیظ کب وہ برنگِ دگر نہیں آئے

حفیظ ہوشیارپوری

عنبر کے خط میں مجھے ان کے پیام آتے ہیں
کوئی مانے یا نہ مانے مرے نام آتے ہیں

عافیت کوش مسافر جنہیں منزل سمجھیں
عشق کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں

اب مرے عشق پہ تہمت ہے ہوس کاری کی
مسکراتے ہوئے اب وہ لبِ بام آتے ہیں

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

جن کو خلوت میں بھی تاثیر نہ دیکھا تھا کبھی
محفلِ عنبر میں اب وہ سرِ عام آتے ہیں

تاثیر

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ ملا بھی ہے
اس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستین
اُس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

یہ حسنِ اتفاق ہے یا حسنِ اہتمام
ہے جس جگہ فرات وہیں کربلا بھی ہے

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے آئینہ بھی ہے

اقبال شکر بھیجو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پوچھتا بھی ہے

اقبال عظیم

رائے

پاگل خانے کا دورہ کرنے والی ایک سماجی کارکن کو راستے میں ایک ادھیڑ عمر پاگل کھڑا نظر آیا تو وہ اس سے انٹرویو کرنے لگی۔
"آپ یہاں کتنے عرصے سے ہیں۔"
"بارہ سال سے۔" ادھیڑ عمر آدمی نے جواب دیا۔
"یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟" خاتون نے جاننا چاہا۔
"نہیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔
خاتون اس شخص سے مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد آگے بڑھیں تو رہنمائی کی غرض سے ان کے ساتھ چلنے والے صاحب کو یکدم کچھ یاد آیا تو خاتون سے پوچھنے لگے۔
"آپ ان صاحب کو کہیں پاگل تو نہیں سمجھ رہی تھیں؟"
"ہاں، میں تو پاگل سمجھ کر ہی ان کا انٹرویو کر رہی تھی۔" خاتون نے اعتراف کیا۔
"ارے میڈم! وہ پاگل نہیں۔ وہ تو ہمارے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔" انہوں نے بتایا۔
"اوہ!" خاتون متاسف ہوئیں پھر پلٹ کر سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس پہنچیں۔
"معاف کیجئے گا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ آئندہ میں محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں کوئی رائے نہیں قائم کروں گی۔"
ساجدہ ریحان۔۔۔ مسکن چورنگی

وجہ تسمیہ

ایک صاحب نے اپنے بے حد موٹے دوست سے کہا۔ "میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم جیسے موٹے آدمی عام طور پر بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں۔ بڑی سے بڑی نامعقول اور ناگوار بات کو بھی ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ بڑی بات ہے۔"
"اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارے لیے لڑنا اور بھاگنا دونوں ہی مشکل کام ہوتے ہیں۔" موٹے دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
نور فاطمہ۔۔۔ کورنگی

بری بات

صف اول کی ایک اداکارہ سے ایک اخبار نویس نے پوچھا۔
"آج کل آپ جن صاحب کے ساتھ سب سے زیادہ دیکھی جا رہی ہیں کیا ان سے آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"
اداکارہ برہم ہو کر بولی۔ "آپ اخبار نویسوں میں یہ ہی سب سے بری عادت ہے۔ ہم ایکٹریس جس کے ساتھ بھی وقت گزارنا شروع کر دیں آپ لوگ الزام لگا دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہماری شادی ہو چکی ہے؟"
امبر گل۔۔۔ ٹھڈو

پرہیز

ٹرین کے ڈبے میں ایک صاحب کو سگار سلگاتے دیکھ کر ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی خاتون نے نرمی سے کہا۔
"تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" وہ صاحب ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔

"محترمہ! ایسی صورت میں تو میں آپ کو بھی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی سے پرہیز کیا کریں۔"
ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

احتجاج

ایک بوئنگ طیارے نے سمندر پر پرواز کے دوران ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کیپٹن نے اعلان کیا۔
"خواتین و حضرات توجہ فرمایئے! طیارے کا ایک انجن خراب ہوگیا ہے۔ تاہم باقی تین انجن ہمیں بہ حفاظت ہماری منزل پر پہنچا دیں گے۔ البتہ آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔" ایک گھنٹے بعد کیپٹن کی پھر آواز ابھری۔
"توجہ فرمایئے! ہمیں افسوس ہے کہ طیارے کا دوسرا انجن بھی خراب ہوگیا ہے۔ تاہم باقی دو انجنوں پر ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ البتہ اب ہمیں دو گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔" تھوڑی دیر اور گزری تھی کہ کیپٹن نے پھر اعلان کیا۔
"خواتین و حضرات! ہم انتہائی دکھ کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ جہاز کا تیسرا انجن بھی خراب ہوگیا ہے۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ البتہ اب ہمیں تین گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔"
بار بار کے اعلانات سے بھنایا ہوا ایک مسافر بڑے غصے سے بولا۔
"کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ اگر چوتھا انجن بھی خراب ہو گیا تو کیا ہم ساری رات پرواز ہی کرتے رہیں گے؟"
ندا جمیل۔۔۔ میٹروول

اختتام

دو بچے آپس میں ریڈیو ریڈیو کھیل رہے تھے اور اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ اناؤنسر کون بنے گا اور پروگرام کون سنائے گا۔ بالآخر اس پر فیصلہ ہوا۔ ہارے ہوئے بچے کو اناؤنسر بننا تھا۔ اس نے اناؤنسمنٹ کی۔
"سامعین! رات کے بارہ بجے ہیں۔ اب ہماری نشریات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ اللہ حافظ۔۔۔!"
امبر مقصود۔۔۔ سخی حسن

آرام طلبی

مشہور امریکی طنز نگار مارک ٹوئن بڑا آرام طلب شخص تھا۔ مطالعہ اور تحریری کام وہ عموماً بستر میں ہی کرتا تھا۔ ایک دن ایک اخباری نمائندہ اس کے انٹرویو کے لیے آ پہنچا۔ مارک ٹوئن نے اپنی بیوی سے کہا۔
"اسے خواب گاہ میں ہی بھیج دو۔"
"تم بستر سے باہر کیوں نہیں آجاتے۔ کتنا برا لگے گا کہ تم بستر میں لیٹے رہو اور وہ کھڑا رہے۔" بیوی نے کہا۔
"اچھا۔۔۔" مارک ٹوئن نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اچھا ایسا کرو۔ ملازم سے کہو کہ یہاں ایک اور بستر لگا دے۔"
یاسمین ظفر۔۔۔ لاہور

گرم جوشی

ایک صاحب نے رومانس پر بات کرتے ہوئے اپنے دوست کو بتایا۔
"میری شادی کو پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ اس تمام عرصے میں میری محبت اور گرم جوشی میں ذرا سا فرق بھی نہیں آیا ہے۔"
"کیا واقعی؟" دوست نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں بالکل۔" ان صاحب نے اسی اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ الگ بات ہے کہ ابھی میری بیوی کو میری محبوبہ کے بارے میں علم نہیں ہے۔"
مدیحہ احمد۔۔۔ گلشن اقبال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا ذکر فرمایا۔ پھر منہ دوسری طرف پھیر لیا اور دوسری طرف توجہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہنم کو دیکھ رہے ہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جہنم سے بچو، کھجور کے دانے کا ایک حصہ ہی ہو۔"
تشریح۔ جہنم سے بچنے کے لیے کوئی اور چیز نہ ہو اور کھجور کا ایک دانہ ہی صدقہ کر کے بچنا پڑے تو بچ جاؤ۔

پیروی،

حضرت ام دردا رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔
"جب بھی حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوئی حدیث بیان کرتے تو ضرور مسکراتے۔ میں نے ان سے کہا۔
"مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اس طرح لوگ آپ کو بے وقوف سمجھنے لگیں گے۔"
انہوں نے فرمایا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی بات فرماتے تو ضرور مسکراتے۔"

قرآن کی حفاظت،

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
"جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو میں نے قسم کھائی کہ دو ہتھوں کے درمیان جو قرآن ہے جب تک اس سارے کو جمع نہیں کر لوں گا، اس وقت تک میں اپنی پیٹھ سے چادر نہیں اتاروں گا یعنی آرام نہیں کروں گا، چنانچہ جب تک میں نے سارا قرآن جمع نہیں کر لیا، یعنی یاد نہ کر لیا، اپنی پیٹھ سے چادر نہیں اتاری، بالکل آرام نہیں کیا۔"

علم کی عزت،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
"خود علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ اور علم کے لیے وقار اور سکون و اطمینان سیکھو اور جس سے علم سیکھو اس کے سامنے بھی تواضع اختیار کرو اور متکبر عالم نہ بنو۔ اس طرح تمہارا جہل تمہارے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا۔ بلکہ ختم ہو جائے گا۔

حسن نیت کا اجر،

بنی اسرائیل کے ایک شخص کا گزر ریت کے ایک ٹیلے پر سے ہوا۔ قحط کا زمانہ تھا، لوگ بھوک سے مر رہے تھے۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ اگر یہ ریت کا ٹیلا اناج بن جائے تو میں اس کو لوگوں میں تقسیم کر دوں۔
اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے نبی علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اس شخص سے کہہ دو کہ اللہ عزوجل نے تمہاری خیرات قبول کی اور نیک نیتی کی قدر فرمائی اور اسی قدر ثواب عطا فرمایا جتنا ٹیلے کی ریت کے برابر اناج خیرات کر دینے پر ملتا ہے۔
(حضرت امام غزالی۔ خطبات غزالی)

نماز میں خشوع کی تدبیر،

پانچ وقت کی نماز ہم سب پڑھتے ہیں لیکن ہمارا ذہن یکسو نہیں ہوتا، ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے، اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے۔

جب محنت بھی لگ رہی ہے۔ وقت بھی لگ رہا ہے تو اس سے نفع کیوں ... جو۔ ہر نماز میں خشوع کے حصول کی کوشش ... کریں۔ یعنی نماز کو ایک بے روح رسم کے بجائے اپنے رب سے ملاقات اور گفتگو میں بدلنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے صرف توجہ درکار ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ درج ذیل چیزوں پر توجہ مرکوز کرنا بھی کافی ہو سکتا ہے۔
- جو لفظ یا کلمہ زبان سے کہیں، اس کے معنی ساتھ ساتھ دل میں دہرائیں۔
- اللہ تعالیٰ میرے سامنے ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں یا کر رہا ہوں، اسے وہ سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے۔
- میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور بات چیت کر رہا ہوں۔
- میری یہ نماز آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی جائے گی، اپنے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ کروں کہ یہ قبول نہ ہو۔

خشوع کے حصول کی جو ترکیب قرآن نے بتائی ہے وہ یہی ہے کہ دل کو دھڑکا لگا رہے کہ اپنے رب سے ملاقات کرنا ہے اور اسی کے پاس واپس جانا ہے۔
آنے والی نماز ہی سے آپ خشوع پیدا کرنے کے لیے ان تدابیر پر عمل شروع کر دیں اور پھر ان پر برابر عمل کرتے رہیں تو ان شاء اللہ نماز سے آپ کو مطلوبہ زاد راہ ملنا شروع ہو جائے گا۔
(خرم مرادؒ)

دنیا دار،

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا۔
"اے امیر المومنین! دنیا دار کی آپ کیا تعریف فرمائیں گے؟"
آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔
"دنیا دار بھونکنے والے کتے کی طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسرے پر غراتے رہتے ہیں۔ درندوں کی طرح ان میں طاقت ور، کمزوروں کو کھا جاتے ہیں اور بڑے چھوٹوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔"
ثمینہ اکرم۔ لیاری کراچی

علم نجوم،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
"ستاروں کا اتنا علم حاصل کرو جس سے تم خشکی اور سمندر میں صحیح راستہ معلوم کر سکو، اس سے زیادہ نہ حاصل کرو۔"
نمرہ، اقرأ۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

- ذاتی لائبریری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور دماغی لائبریری بے بہا نعمت ہے۔
(لینن)
- آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب و اخلاق کی پابندی نہ کی جائے۔
(پوپ الیگزنڈر)
- ہر ناکامی کے بعد کامیابی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ مایوس نہ ہوا جائے۔
(والٹیئر)
- بے کار ہے وہ علم جو کام کرنے کا سلیقہ تو سکھا دے لیکن زندگی گزارنے کا سلیقہ نہ سکھائے۔
(والٹیئر)
- دنیا میں استاد کا احترام کرنے والوں کی ہی عزت ہوتی ہے۔ (لیو ٹالسٹائی)
- اعتماد زندگی کی متحرک قوت ہے۔
(لیو ٹالسٹائی)
- کتابیں انسان کی بہترین رفیق اور مونس ہیں۔
(ایمرسن)
- کامیابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے۔
(ایمرسن)

لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں

نصیحت،

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے فرمایا۔
"اے میرے بیٹو! میں تمہیں تین باتوں سے روکتا ہوں۔ انہیں اچھی طرح یاد رکھنا۔

★ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیث صرف معتبر اور قابل آدمی سے ہی لینا، کسی اور سے نہ لینا۔

★ قرضہ لینے کی عادت نہ بنا لینا چاہے چوغہ پہن کر گزارا کرنا پڑے۔

★ اشعار لکھنے میں نہ لگ جانا ورنہ ان میں تمہارے دل ایسے مشغول ہو جائیں گے کہ قرآن سے رہ جاؤ گے۔"

علم اور عمل،

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حذیفہ سے فرمایا۔

"اے قبیلہ بنو عبس والے! علم تو بہت زیادہ ہے اور عمر بہت تھوڑی ہے، لہٰذا دین پر عمل کرنے کے لیے جتنے علم کی ضرورت پڑتی جائے اتنا علم حاصل کرتے جاؤ اور جس کی ضرورت نہیں اسے چھوڑ دو اور اس کے حاصل کرنے کی مشقت میں نہ پڑو۔"

وقت کا مجسمہ،

صدیاں گزریں ملک یونان کے ایک شہر کے درمیان ایک عجیب و غریب مجسمہ کھڑا تھا۔ اس عجیب و غریب مجسمے کی شکل و صورت کچھ اس طرح سے تھی۔ وہ سر سے بالکل گنجا تھا۔ لیکن ماتھے پر بالوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تیز دھار والی قینچی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے دو لمبے پر تھے جو اس انداز سے ہوا میں لہراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے مجسمہ اُڑ رہا ہو۔ سنگ تراش نے اسے کچھ اس طرح بنایا تھا کہ لوگ بے اختیار اس کے متعلق سوچنے لگتے تھے کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ پوچھتے کہ اس کے پر کیوں ہیں؟ بتانے والا بتاتا "یہ ہر وقت اُڑتا رہتا ہے۔"

لوگ پوچھتے۔ "اس کا سارا سر گنجا اور ماتھے پر بال کیوں ہیں؟"

جواب ملتا۔ "اسے جو پکڑنا چاہتا ہے صرف اور صرف سامنے سے پکڑ سکتا ہے۔"

لوگ پھر یہ سوال اٹھاتے۔ "اس کے پاس قینچی کیوں ہے؟"

تو آواز آتی۔ "جو اس سے غافل ہوتا ہے تو یہ اس کے بے دردی سے ٹکڑے کر دیتا ہے۔"

آخر میں لوگ حیرت زدہ ہو کر اس کا نام دریافت کرتے تو بتایا جاتا کہ اس مجسمے کا نام "وقت" ہے جس نے اس کی قدر کی، وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اس کا ضیاع کیا وہ خود ضائع ہو گیا۔

کرن کرن روشنی،

☆ جب تمہیں محسوس ہو کہ تمہاری طبیعت کو ذکرِ خدا سے سکون محسوس ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ اللہ پاک تمہیں پسند کرتا ہے۔

☆ سب سے جلدی راضی ہونے والی ذات اللہ کی ہے۔ ہماری ندامت کا ایک آنسو اسے ہمارا بہت قریبی دوست بنا سکتا ہے اور جس کا سب سے قریبی دوست اللہ ہو تو اس کا کوئی بھی کام کیسے رُک سکتا ہے۔

☆ اگر رشتے سچے ہوں تو زیادہ سنبھالنے نہیں پڑتے اور جن رشتوں کو زیادہ سنبھالنا پڑے وہ سچے نہیں ہوتے۔

☆ اگر کوئی محبت کرنے والا تم پر غصہ کرنا چھوڑ دے تو سمجھ جاؤ کہ تم اس کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکے ہو۔

☆ سمندر بہت وسیع ہیں لیکن تم اتنا ہی پانی لے سکتے ہو جتنا تمہارے ہاتھ میں آئے۔ اسی طرح اللہ پاک کی رحمت لامحدود ہے لیکن تم اتنی ہی پا سکتے ہو جتنا تمہارا ایمان پختہ ہو۔

☆ علم وہ نہیں جو تم نے مکتب سے حاصل کیا بلکہ علم وہ ہے جو تمہارے عمل و کردار سے نظر آئے۔

رضوانہ شکیل راڈے۔ لودھراں

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

عائشہ ——— گوجرہ

وہ ہمسفر تھا، مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دھوپ، چھاؤں کا عالم رہا، جدائی نہ تھی
عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا بے وفائی نہ تھی

مسکان قریشی ——— بلال کالونی ملتان

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا
تم نے ہی کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

آمنہ اُجالا ——— ڈہرکی

کاروبارِ عشق میں ایسے بھی سودے ہیں جہاں
فائدوں کے گوشوارے اور خسارے ہیچ ہیں
ہے کہیں کوئی تعلق اور ہی انداز کا
جس کے آگے سب کے سب رشتے ہمارے ہیچ ہیں

سحر صبا ——— فیصل آباد

دُنیا کا کچھ بُرا بھی تماشا نہیں رہا
دل چاہتا ہے جس طرح ویسا نہیں رہا
کہتے ہیں ایک پل نہ جئیں گے ترے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں، وہ وعدہ نہیں رہا

تحریم ——— محراب پور

کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

فارعہ اقبال ——— کراچی

ہم کو بھی معلوم تھا، یہ وقت بھی آ جائے گا
ہاں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ پچھتائیں گے
یہ بھی طے ہے کہ جو بوئیں گے وہ کاٹیں گے وہاں
اور یہ جو بھی کھوئیں گے، وہیں پائیں گے

حنا سلیم اعوان ——— آخون باندی

رنگوں میں ایک رنگ تری سادگی کا رنگ
ایسی ہوا چلی کہ وہ رنگت نہیں رہی
باتوں میں ایک بات، تری چاہت کی بات
اور اب یہ اتفاق کہ چاہت نہیں رہی

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

کارِ دُنیا بھی، نیا عشق بھی، یادیں بھی سلیم
کتنے زخموں کو سنبھالے ہوئے گھر جاؤ گے تم

ہما مسعود بنگش ——— کوہاٹ

تو خبر دے اپنی تعلیم پر
نہ پڑ عشق کے عذابوں میں
اکثر وہ لوگ برباد ہوتے ہیں
جو رکھتے ہیں پھول کتابوں میں

صفیہ عباس ——— کروڑ لعل عیسن (لیہ)

اسے کبھی نہ کبھی تو بچھڑ جانا ہی تھا
یہ حادثہ بھی میری زندگی میں آنا تھا
وہ ایک شخص مجھے ساری عمر ترسے گا
نصیب اس کے کہ اس نے مجھے گنوانا تھا

شفق شان شاہ ——— گوجرہ

آنکھیں جن کو دیکھ نہ پائیں سپنوں میں بکھرا دینا
جتنے بھی ہیں روپ تمہارے، جیتے جی دکھلا دینا
دل ساگر ہے دل دریا ہے اس دریا کی اس ساگر کی
ایک ہی لہر کا آنچل تھامے عمر یہ ساری بتا دینا

راشدہ راشد ——— لیاری کراچی

کانچ کو خالص ہیرا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی
اک صحرا کو دریا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی
کتنی خوش فہمی تھی ہم کو، ان کی نہ کو ہاں گردانا
وہ کیا بولے ہم کیا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی

دستک دستک دستک

شاہین رشید

سبرین ہسبانی

"کیا حال ہیں اور صنم کی شادی کی بہت مبارک ہو۔"

"بہت شکریہ۔"

"شادی میں جو سادگی آپ لوگوں نے اپنائی' اس کا فیڈ بیک کیسا ملا؟"

"بہت اچھا۔ لوگ حیران ہیں کہ میڈیا کی ایک لڑکی جو اپنی شادی میں بہت دکھاوا کر سکتی تھی۔ بہت قیمتی ڈریسز بنوا سکتی تھی' اس نے اپنی شادی کو سادگی کے ساتھ کر کے ایک مثال قائم کر دی ہے۔"

"عروسی جوڑا مہنگا ہی ہوگا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ عروسی جوڑے کا جو دوپٹا تھا' بہت سادہ تھا اور اس پہ گوٹے کناری کا کام تھا۔ آج کل کہاں کوئی گوٹے کناری کو اہمیت دیتا ہے مگر صنم کی خواہش تھی کہ اس کے دوپٹے پہ گوٹا لگا ہوا ہو' جس طرح پرانے زمانے کی دلہنوں کے دوپٹوں پہ لگا ہوا ہوتا تھا اور پھر مزے کی بات یہ کہ گھونگھٹ میں رہی صنم۔ جبکہ اب گھونگھٹ کا بھی رواج نہیں ہے۔"

"حیرت ہے۔"

"اور مزید حیرت کی بات کہ لڑکے کا نکاح مسجد میں ہوا اور عام طور پر بلکہ اب تو لازمی ہو گیا ہے کہ دلہن کی رخصتی شادی ہال سے ہوتی ہے مگر صنم نے کہا کہ رخصتی گھر سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ رخصتی شادی ہال سے نہیں بلکہ گھر سے ہوئی۔ یوں سمجھیں کہ صنم نے تمام پرانی روایات کو پھر سے زندہ کر دیا۔"

"اور آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"میری مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ آج کل ڈرامہ سیریل "میری بیٹی" آن ایر ہے' اس کی کامیابی پر مبارک بادیں وصول کر رہی ہوں یا پھر صنم کی مبارک بادیں وصول کر رہی ہوں۔"

"او کے سبرین! ان شاء اللہ پھر تفصیل سے بات ہوگی۔"

سلیم معراج

"کیسے ہیں۔ "الو برائے فروخت" میں آپ کی پرفارمنس بہت عمدہ تھی۔"

"اچھا! بہت شکریہ پسند کرنے کا۔"

"اور کیا مصروفیات ہیں۔"

"مصروفیات تو بہت ہیں۔ تفصیل لمبی ہے۔"

"کلموہی" بھی اچھا ہے۔ آپ کی پرفارمنس بھی۔"

"ہوں۔ شکریہ۔ یہ آپ سب ناظرین کی محبت ہے کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ ورنہ بندہ ناچیز کیا ہے۔"

"بندہ ناچیز میں بہت ٹیلنٹ ہے ماشاء اللہ۔ ہر ڈرامے میں آپ کا رول آؤٹ کلاس ہوتا ہے۔ "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" میں تو آپ کی پرفارمنس بہت عمدہ تھی۔"

"اس رول نے تو مجھے بہت زیادہ شہرت دی ہے۔ لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔"

"آپ کا ہی انتخاب ہوا تھا اس رول کے لیے یا پہلے کسی اور کا ہوا تھا؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ پہلے کس کا ہوا تھا۔ لیکن جب مجھے یہ رول دیا گیا تو میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ کیونکہ میں نے پہلے ایسے گیٹ اپ کا رول کیا نہیں تھا۔"

"آپ کو اس گیٹ اپ میں دیکھ کر تو میں پہچانی ہی نہیں تھی۔"

"اچھا! ویسے اور بھی لوگ نہیں پہچانے تھے کیونکہ یہ میری زندگی کا سب سے مختلف رول تھا۔ شکر ہے کہ لوگوں نے پسند کیا۔"

"آئندہ بھی اس طرح کے رول کرنے کا ارادہ ہے۔"

"کیوں نہیں۔ اگر اچھے ملتے رہے تو ضرور کروں گا اور گیٹ اپ والے رول تو زیادہ اچھے ہوتے ہیں کہ لوگوں کو پہچاننے میں تھوڑی دشواری ہوتی ہے۔"

"اس فیلڈ میں آپ نے اپنی محنت سے تو نام بنایا ہی ہے' پھر بھی کوئی ایسی شخصیت جس کے شکر گزار ہوں آپ۔"

"بالکل۔ محنت کرنے کو بھی اسی وقت دل چاہتا ہے جب سامنے کوئی منزل یا راستہ ہو۔ میں اس فیلڈ میں آیا تو محنت کا عزم تو لے کر آیا ہی تھا' لیکن میری محنت کی جو حوصلہ افزائی کی اور جس طرح مجھے سپورٹ کیا۔ اس کے لیے میں ثانیہ سعید کا بہت شکر گزار ہوں۔"

"اور گھر والے؟"

"گھر والے حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ دعائیں کر سکتے ہیں' لیکن ثانیہ سعید نے مجھے سپورٹ کیا اور یہ بڑی بات ہے۔"

"کن ڈراموں سے آپ کو بریک تھرو ملا؟"

"کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی۔ اور خدا کی بستی سے۔ بس پھر تو چل سو چل والا کام ہوا۔"

"موڈ خراب میں شوٹنگ کرنا کیسا لگتا ہے۔"

"مشکل تو ہوتی ہے۔ مگر میں اپنے موڈ کو اپنے کام پر حاوی نہیں ہونے دیتا اور سیٹ پر آ کر سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ویسے موڈ ہوتا کب خراب ہے۔"

"موڈ کے خراب ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی' ہر وہ بات جو مزاج کے خلاف ہو' اس سے موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

"وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

"بالکل کرتا ہوں اور میرے موڈ کے خراب ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں وقت کی پابندی کرتا ہوں۔ وقت پر سیٹ پر پہنچ جاتا ہوں، مگر جب دوسرا کوئی نہیں آتا وقت پر تو پھر مجھے غصہ بھی بہت آتا ہے۔"

"وقت کی پابندی اور قدر نہ کرنے کی وجہ سے ہی تو ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔"

"جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، مسئلہ یہ ہے کہ اب ہمارے یہاں دیر سے آنے والوں کی بڑی قدر ہے اور جو وقت پر آجائے اس کے لیے یہی کہا جاتا ہے کہ بے چارے کے پاس کوئی کام نہیں ہوگا۔ اس لیے یہ وقت پر آگیا ہے۔ لوگوں کی غلط سوچ نے بھی بہت کام خراب کیا ہوا ہے۔"

"آپ پر تنقید ہوتی ہے یا تعریف۔۔۔ تعریف ہی ہوتی ہوگی۔"

"جی بالکل۔۔۔ منہ پر تو سب ہی تعریف کرتے، تنقید تو پیٹھ پیچھے ہوتی ہے۔ ویسے ایک بات تو میں نے بہت نوٹ کی ہے کہ جب تھوڑی سی بھی پرفارمنس آؤٹ کرو تو لوگ ضرور کہتے ہیں کہ آپ نے برا پرفارم کیا تو اچھا لگتا ہے اس وقت کہ کم سے کم لوگ غور سے ڈرامہ دیکھتے تو ہیں۔"

"کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" کے وقت کیا ریمارکس ملتے تھے۔"

"قہقہہ۔۔۔ "بہت برے۔۔۔ بہت گالیاں اور باتیں سنی تھیں میں نے گیٹ اپ میں بھی جو لوگ پہچان گئے تھے وہ پھر راستہ روک کر ضرور کہا کرتے تھے کہ آپ اچھا نہیں کر رہے۔ خیر بہت اچھا ڈرامہ تھا، بلکہ سوپ تھا۔"

"کون سے چینلز کے ڈرامے پسند ہیں؟"

"سب ہی چینلز اچھے ہیں۔ لیکن پھر بھی جس چینل پہ ڈرامے آتے ہیں وہی چینل زیادہ شوق سے دیکھتا ہوں اور اپنے ڈرامے بھی شوق سے دیکھتا ہوں کہ دیکھوں تو سہی کہ میں نے کیا کیا ہے۔ ویسے مجھے نیوز چینلز بھی بہت اچھے لگتے ہیں، باخبر رہتا ہے انسان۔"

"ٹاک شو بھی دیکھتے ہوں گے۔"

"ٹائم مل جائے تو ضرور دیکھتا ہوں اور سب ہی اینکرز بہت محنت کے ساتھ پروگرام کرتے ہیں اور بہت اچھے پروگرام کرتے ہیں۔"

"کافی ٹائم سے آپ کو اس فیلڈ میں دیکھ رہے ہیں۔ آپ ہمیشہ ایک سے نظر آتے ہیں، کبھی موٹا یا صحت مند نہیں دیکھا آپ کو؟"

"صحت مند تو میں ہوں، کیونکہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں ہے۔ ہاں دبلا بہت ہوں اور اس کی وجہ ایک تو شاید ہڈی ایسی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں نے کبھی موٹا ہونے پر توجہ ہی نہیں دی۔ میرے خیال میں میں ایسا ہی اچھا ہوں۔"

"ویسے کھانے میں کیا پسند ہے؟"

"آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں جیسے کچھ کھلانے کا ارادہ ہو۔۔۔" ہنستے ہوئے۔ "خیر مجھے آلو قیمہ پالک گوشت اور نہاری بہت پسند ہے۔"

"گھر پر ہی کھاتے ہیں یا گھر سے باہر۔"

"گھر پر ہی کھانا، کھانا پسند ہے۔ لیکن اکثر دوستوں کے ساتھ بھی جانا پڑ جاتا ہے۔ اس وقت جب شوٹ پر دیر ہو جائے۔ پھر بیگم کو فون پر بتا دیتا ہوں کہ میں گھر پر کھانا نہیں کھا سکوں گا۔"

سوہائے علی ابڑو

"کیا حال ہیں۔۔۔ جی؟"

"ٹھیک حال ہیں جی۔"

"آج کل آپ کے دو سیریلز "کھویا کھویا چاند" اور "رشتے کچھ ادھورے سے" آن ایئر ہیں۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ دونوں سیریلز پسند کیے جا رہے ہیں، لیکن زیادہ جو پسند کیا جا رہا ہے "وہ کھویا کھویا چاند ہے۔"

"اس میں تو آپ کی ڈیتھ دکھا دی گئی۔۔۔ کیسا لگا تھا؟"

"جی جی۔۔۔ اس میں میرا کردار ختم ہو گیا ہے، جو بھی کچھ دکھایا جاتا ہے وہ فلیش بیک کے سین ہوتے ہیں اور کیسا لگا تو ڈراموں میں تو یہ سب چلتا رہتا ہے، کوئی خدانخواستہ سچ تو نہیں ہوتا۔ پر پھر بھی گھر والوں کو زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر میرے والدین حیات ہوتے تو شاید بہت زیادہ محسوس کرتے۔"

"رشتے کچھ ادھورے سے میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیزی نہیں ہے کیا؟"

"ہے تو سہی۔۔۔ بات کو بہت لمبا کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی لوگ اسے دیکھ تو رہے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "جی شاید۔۔۔ موضوع تو اچھا تھا۔۔۔ مسئلہ بھی اہم تھا۔ مگر طوالت نے شاید ناظرین کو بور کر دیا ہے۔"

"اور آنے والے پروجیکٹ کیا ہیں؟"

"کافی ہیں ماشاء اللہ سے۔۔۔ 2014ء سے آن ایئر ہوں گے۔ ابھی ڈس کلوز کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں رہے گا۔"

"بہت اچھے رول کیے ہیں اب تک آپ نے۔۔۔ آنے والے وقت میں کیا ارادے ہیں؟"

"ارادے بالکل نیک ہیں۔ اچھے ہی رول کروں گی۔۔۔ لیڈ رول ہی کرنا چاہوں گی اور پرفارمنس سے بھرپور رول کرنا چاہوں گی۔ خواہ وہ ماڈرن ہو۔ سادہ ہو یا کسی معذور اور غریب لڑکی کا رول ہو۔ بس پاور فل ہو۔"

"شوبز کی فیلڈ میں کامیابی کا کیا پیمانہ ہے۔ خوب صورتی، تعلیم یا ٹیلنٹ؟"

"میرے خیال میں اگر ہم اپنا کامن سینس یوز کریں تو پہلے نمبر پر ٹیلنٹ، دوسرے نمبر پر تعلیم اور پھر تیسرے نمبر پر خوب صورتی ہے۔ ہماری اس فیلڈ میں اور دیگر ممالک میں اگر آپ نظر دوڑائیں تو ہر وہ لڑکی اور لڑکا کامیاب ہوا ہے جس کے پاس شکل سے زیادہ ٹیلنٹ ہے۔ ٹیلنٹ ہو تو واجبی شکل پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے اور تعلیم کی جہاں تک بات ہے تو تعلیم تو ہر شعبے کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر تو آپ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔"

"ہمارے ڈرامے خواتین کے "مسائل" پر ہی بن رہے ہیں۔ کیا واقعی خواتین پر بہت ظلم ہو رہے ہیں؟"

"اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کے بہت مسائل ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خواتین پہ بہت ظلم ہوتے ہیں۔" "اور گھرداری کا وقت مل جاتا ہے یا صرف اداکاری پر ہی توجہ ہے۔"

"گھرداری کا بہت شوق ہے، والدین کے بعد خصوصاً امی کے بعد میری دادی نے مجھے گھرداری میں بہت ماہر کر دیا۔ اس لیے مجھے کھانا پکانے اور روٹی پکانے میں مشکل نہیں ہوتی۔"

☆

تبصیر نشاط

چاہتے ہیں تو اس لیے ان کا ساتھ دینے کا دل چاہتا ہے۔ (لو جی ملک چھوڑو انڈسٹری سنبھالو۔)

ثنا کی دوبارہ آمد

اداکارہ ثناء نے لولی وڈ کی دو فلمیں کرنے پر رضا مندی کا اظہار کر ہی دیا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے فلم انڈسٹری نہیں چھوڑی (بلکہ انڈسٹری نے انہیں چھوڑ دیا) البتہ وہ اچھی آفرز کی تلاش میں تھیں۔

(معاوضے کی؟) انہیں مختلف فلموں کی آفرز ہوتی رہی ہیں اب انہوں نے دو فلمیں سائن کی ہیں۔ (کیوں مارننگ شو والوں نے بلانا چھوڑ دیا؟) مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہماری انڈسٹری میں دوبارہ سرگرمیاں شروع ہو رہی ہیں اور نئے نئے لوگ آ رہے ہیں (تو آپ؟)

شان اور سیاست

اداکار شان جو کہ آج کل وار کی کامیابی کی مبارک بادیں وصول کر رہے ہیں' ان کا ارادہ آئندہ الیکشن میں حصہ لینے کا ہے (تمام پارٹیاں سن لیں۔) وہ کہتے ہیں کہ "ذاتی طور پر انہیں مسلم لیگ (ن) کی پالیسیاں پسند ہیں" (لو جی گل ہی مک گئی) اگر نواز شریف صاحب نے اپنے دور اقتدار میں اپنے انتخابی وعدے پورے کیے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ان کی پارٹی میں شامل ہو جائیں (اور اگر نہیں کیے تو پھر۔۔۔؟) حمزہ شریف بہترین نوجوان سیاست دان ہیں (ہیں جی۔۔۔!) وہ (بھئی حمزہ شریف) پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بہت کچھ کرنا

اب یقیناً" پاکستان کی فلم انڈسٹری بحران سے نکل آئے گی۔

دوسری شادی

راحت فتح علی خان نے انڈیا سے شہرت حاصل کی اور اب انڈیا کے میڈیا سے ہی ناراض ہیں۔ (کیا کام کم مل رہا ہے؟) ان کا کہنا ہے کہ "بھارتی میڈیا پاکستانی میوزک انڈسٹری سے خائف ہے" (آہم!) انہوں نے بھارتی اخبار میں شائع ہونے والی اس خبر کی سختی سے تردید کی ہے کہ انہوں نے انڈین ماڈل فلک سے "خفیہ شادی" کر لی ہے اور ان کی اپنی پہلی بیوی ندا سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ (یعنی کہیں ملن کہیں جدائی) راحت فتح علی خان نے مزید کہا کہ وہ اس اخبار کے خلاف جلد ہی قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ راحت فتح علی خان کا خیال ہے کہ افواہیں پھیلانے والے میری نئی البم سے خوف زدہ ہیں (کیوں کیا اس میں فلک اوہو جسے آپ جانتے نہیں موجود ہے؟)

بھید

اداکارہ لیلیٰ جو پردہ اسکرین سے زیادہ حقیقی زندگی میں اداکاری کرتی نظر آتی ہیں ان کے ساتھ حقیقی زندگی میں فلمی سین ہو گیا۔ ہوا یوں کہ لیلیٰ جس وقت کراچی سے لاہور پہنچیں تو ایئرپورٹ پر جو انہیں لینے پہنچے تھے ان سے گلے ملنے کے بعد لیلیٰ کی نظر ایئرپورٹ پر آئے ہجوم پر پڑی تو وہ حیران رہ گئیں اور سب سے ہاتھ ملاتی مسکراتی گزرنے لگیں تو ان کی نظر ان کیمروں پر پڑی جو بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ ان کی "حرکتوں" کو محفوظ کر رہے تھے۔ کیمرے دیکھ کر لیلیٰ سر پکڑ کر بھاگیں اور ان پر بھید کھلا کہ یہ کیمرے لاہور پہنچنے والے کھلاڑیوں کی کوریج کے لیے آئے ہیں۔ لیلیٰ تو گرپوں میں آگئی تھیں۔

اِدھر اُدھر سے

☆ "تخلیقی کام کرنے والوں کا دماغ درست نہیں ہوتا۔" ڈریے نہیں یہ ہم نہیں کہہ رہے یہ تو پاکستان کے مقبول ترین سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کا کہنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میرا دماغی توازن درست نہیں ہے یہ کیفیت میری نہیں ہے بلکہ تمام تخلیقی کام کرنے

والوں کی ہوتی ہے۔"

☆ امریکی ریالٹی ٹی وی شو اسٹار کم کارڈیشیان کے بارے میں "لائف اینڈ اسٹائل" میگزین کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "کم نے ماں بننے کے بعد اپنے جسم سے چربی کم کرنے اور جلد کے نشانات زائل کرنے کے لیے خصوصی سرجری کرائی ہے۔" کم کارڈیشیان نے ان خبروں کی سختی سے تردید کی ہے کہ انہوں نے اس سرجری پر 80 ہزار ڈالر خرچ کیے ہیں بلکہ میں نے خود کو اس بات کا عادی بنانے کے لیے سخت محنت کی ہے کہ مجھے صرف اچھی اور صحت بخش غذا کھانی ہے۔ میں ورزش پر بہت توجہ دیتی ہوں یقیناً یہ ایک مشکل ترین مرحلہ تھا مگر میں نے اپنی محنت اور کوشش سے اسے ممکن کر دکھایا۔

☆ شبانہ اعظمی جو خود کو سیکولر کہتی ہیں، ان کے شوہر جاوید اختر بھی سیکولرازم کے دعوے دار ہیں۔ ایک ٹی وی پروگرام میں شبانہ اعظمی یہ کہتے ہوئے رو پڑیں کہ "ہمیں مسلمان ہونے کی بنا پر بمبئی میں کوئی گھر دینے کو تیار نہیں۔"

یہ ہے سیکولر بھارت کا اصل چہرہ!

☆۔ جنرل شاہد نے اپنی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" میں ایک حیران کن انکشاف کیا جو سوات کا بچہ بچہ جانتا ہے "لیکن نہ یہ خبر میڈیا پر نشر ہوتی ہے نہ کوئی سیاست دان، دانش ور، تبصرہ نگار بیان کرنے کی جرات کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کی تقریب رونمائی میں کہا۔

"سوات میں امن معاہدہ جنرل مشرف کی حکومت اور فوج نے امریکی دباؤ پر سوات امن معاہدہ توڑا اور اس کا الزام طالبان پر لگا دیا۔"

یہ فقرہ ایسا تھا جس پر پورا ہال سناٹے میں آگیا۔

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

طولون اور مصر کی گورنری

ایک دن امیر المومنین ہارون الرشید قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب اس آیت پر پہنچا۔

اس آیت میں خدائے تعالیٰ فرعون کے متعلق بتاتا ہے کہ "وہ فخر کرتا تھا۔ ملک مصر اور نیل کی نہروں پر جو درختوں کے نیچے ہیں۔"

ہارون الرشید پڑھتا پڑھتا رک گیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد حاجب کو حکم دیا کہ "تمام بغداد میں گشت کرو اور اپنے آدمیوں کو بھی بھجوا کر ایسا شخص تلاش کرو جو تمہیں تمام بغداد میں سب سے زیادہ حقیر، نالائق، غلیظ اور کمینہ معلوم ہو۔" حاجب اور دوسرے ملازم تلاش کرتے کرتے ایک اجاڑ محل کے کھنڈروں کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ زمین پر ایک شخص مُردے کی طرح بے خبر پڑا سو رہا ہے اور اس کے ادھر ادھر بہت سے کتے لیٹے ہیں۔ حاجب نے سوچا کہ اس سے زیادہ ذلیل شخص کون ہوگا کہ کتوں کے ساتھ رہنے سہنے پر راضی ہے۔ اسے جگا کر ہارون الرشید کے پاس لے گیا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "کیا نام ہے؟"

جواب دیا۔ "طولون"

پوچھا۔ "کیا کام کرتا ہے؟"

بولا۔۔۔ "کتے پالتا ہوں۔"

خلیفہ نے پوچھا۔ "کسی مقام کا امیر بنا کر بھجوا دوں؟ بشرطیکہ اپنا فرض منصبی اچھی طرح بجالائے۔"

طولون نے جواب دیا "اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں

اگر امیر المومنین مجھے اس لائق خیال فرمائیں تو حاضر ہوں۔"

ہارون الرشید نے حکم دیا کہ مصر کی ولایت کا فرمان اس کے نام لکھ دیا جائے اور اس کی تیاری کا تمام سامان فراہم کیا جائے۔ چنانچہ طولون کے لیے قیمتی لباس، نوکر چاکر، گھوڑے اور امیرانہ سازو سامان اکٹھا کیا گیا۔

لوگوں کو یہ حال معلوم ہوا تو بہت حیران ہوئے۔ ایک خاص مصاحب نے امیر المومنین سے پوچھا کہ "اس ذلیل ترین شخص کو اتنے بڑے عہدے پر مامور کرنے کا کیا سبب ہے؟"

خلیفہ نے جواب دیا۔ "فرعون ملعون کو ملک مصر پر بڑا ناز اور غرور تھا۔ میں نے اس کے غرور کو نیچا دکھانے کے لیے بغداد کے سب سے حقیر اور ذلیل آدمی کو اس ولایت کا والی بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ خدائے عزوجل کے نزدیک دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے۔"

خدا کی قدرت دیکھیے کہ جب طولون نے مصر کی امارت کی باگ سنبھالی تو اس نے بڑے بڑے کام انجام دیے اور مدت تک مصر کا والی بنا رہا۔ اس کا بیٹا احمد بن طولون ہوا جس نے سخاوت اور فیاضی میں بڑا نام پایا۔ اس کی عادت تھی کہ جو قیمتی پوشاک صبح کو پہنتا تھا۔ شام کو بخش دیتا تھا۔ اس پوشاک کی قیمت پانچ سو دینار ہوا کرتی تھی۔ اس کی اس روزانہ بخشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوشاکوں میں کمی ہو گئی۔ مختاروں نے یہ تدبیر نکالی کہ پانچ سو دینار میں وہی پوشاک واپس لینے لگے۔ احمد بن طولون کو معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ پوشاک میں کوئی نشان ایسا بنا دیا جائے، جس کے سبب سے اس کی شناخت میں آسانی ہو جائے اور مختار بخشی ہوئی پوشاک دوبارہ نہ خرید سکیں۔

امیر المومنین ہارون الرشید نے حساب کتاب کے بارے میں کبھی طولون سے بازپرس نہ کی اور نہ کبھی اس سے زیادہ آمدنی کا مطالبہ کیا۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے ڈاکٹر کرن چیمہ کا ہے، لکھتی ہیں۔

شعاع کے ساتھ میرا تعلق میری پیدائش سے بھی پہلے سے ہے۔ یوں کہ شعاع میری ماما جان کو پسند رہا تو اپنی پیدائش سے پہلے کے شمارے بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ میری اردو اچھی ہونے کی وجہ صرف اور صرف شعاع ہے۔

"شمارے" کا آغاز "حمد" سے کیا۔ یہ شعر بہت پسند آیا

میں ہمیشہ اپنے سوال شوق کی کمتری پر خجل رہا
کہ تیری نوازش بے کراں نے میری طلب سے سوا دیا

امجد اسلام امجد نے کیا خوب کہا۔

آپ سے آگہی کی شرط ہے یہ
پہلے تسخیر ذات کی جائے

ادارے کی طرف سے جو احادیث شائع ہوتی ہیں بہت معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

"رقص بسمل" نبیلہ عزیز کی تحریر ہے ہرچند ابھی ناول کے کردار واضح ہو کر سامنے نہیں آئے۔ پر انہوں نے کچھ فقرے بہت باکمال تحریر کیے ہیں۔ ہاں پورے شہر میں ایک ہی خاص ہستی ہوتی ہے اس جیسا کوئی نہیں ہوتا۔ جیسے لاہور میں میرے لیے ایک بہت خاص ہستی موجود ہے اور ان کی وجہ سے پورا لاہور ہوائیں، پھول، گاڑیوں کا دھواں شور۔ کبھی درست راستہ نہ بتانے والے لوگ (کہ مجھے گھنٹوں خوار ہونا پڑا تھا اور دو بار چالان ہوتے ہوتے بچا) پسند ہیں۔" محض اس ایک خاص ہستی کی وجہ سے۔"سبز کائی" شریں ملک کی تحریر ہے "اینٹوں پر جمی کائی تو برش سے اتر ہی جاتی ہے پر کاش کوئی ایسا برش ہوتا جو دلوں پر جمی تعصب کی کائی تو برش سے اتر جاتی ہے پر کاش کوئی ایسا برش ہوتا جو دلوں پر جمی تعصب کی کالی کائی کو اتار سکتا۔" اگر ایسا ہوتا تو ہمارا ملک خون بہانے والوں سے محفوظ رہتا۔

آسیہ آنٹی کی تحریر پر کوئی تبصرہ نہیں۔ وہ ہمیشہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اب سورج کو بھلا کیا چراغ دکھائیں۔

"محبت من محرم" سمیرا حمید نے بہت خوب صورت لکھا۔ لبنیٰ جدون کا عشق دعا ہے۔ عنوان بہت خوب صورت ہے، پر تحریر سے اختلاف ہے۔ عمر خان کو جتنا غصیلا اور ضدی دکھایا گیا ہے ایسا ہوتا نہیں، پٹھان ایک بار جس کا ہاتھ تھام لیں، کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ میرے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا رہا ہے عبداللہ خان۔ اس کے والد کی شادی جرگے کے فیصلے کے مطابق خون بہا کے تاوان میں آئی لڑکی سے ہوئی۔ پر انہوں نے میرے دوست کی والدہ کو جو مان دیا وہ سوچوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ ربیط کا کردار بھی اصل سے کافی دور ہے یہ لوگ عورت کا جتنا احترام کرتے ہیں کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

"دیمک زدہ محبت" نے دس ماہ تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ سکینہ کی محبت نے میرے دل کی زمین کو ہمیشہ ہی نم رکھا۔ "ایک تھی مثال" رخسانہ جی تحریر کرتی ہیں۔ رخسانہ جی آپ کو پتا ہے کہ گھریلو سیاست میں ماہر عورتوں کے سامنے ہمارے ملک کے سیاست دان بھی مات کھا جائیں..... بہت بہترین تحریر ہے۔

ج: کرن! بہت خوب صورت خط لکھا آپ نے اگر صفحات کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم آپ کا پورا خط شائع کرتے۔ لبنیٰ جدون کے ناول پر آپ کے اعتراض سے ہم بالکل متفق نہیں۔ اچھے برے لوگ ہر قوم' ہر مذہب' ہر گھر میں پائے جاتے ہیں۔ کہانیوں میں کسی قوم کی' کسی صوبے کی' کسی خاص زبان بولنے والوں کی نہیں بلکہ ایک گھریلو فرد کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ربیط خان وقتی طور پر غصہ کا شکار ہوا اور اس نے غلط حرکت کی لیکن بعد میں وہ پشیمان بھی ہوا اور اس نے تلافی بھی کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے یہ سوچنا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا غلط ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عائشہ اختر بٹ نے سرگودھا سے لکھا ہے

آپ نے جو مشورہ دیا تھا (پرائیویٹ پڑھائی جاری رکھنے کا) وہ میں نے من و عن مان لیا ہے یقین مانیے جس طرح آپ نے میرے منتشر ذہن کو خوب صورت الفاظ سے سمیٹا' میں ذہنی طور پہ بہت پر سکون ہو چکی ہوں۔ گھر میں بھی سب ٹھیک جا رہا ہے' میں نے سمجھوتا کیا ہے لیکن آپ کا حوصلہ دیتا انداز کبھی نہیں بھول سکوں گی سرورق بہت خوب صورت لگا ہنستی مسکراتی شیزا (ماڈل) اچھی لگیں۔ایک بات پہ حیرت ہوتی ہے یہ لوگ ماڈلز کو "ایویں ہی بس ٹھیک' ذرا اچھی نہ لگی جیسے القابات سے کیوں نوازتے ہیں' کیا آپ کو بھول جاتا ہے کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے مدیحہ افتخار سے مل کر اچھا لگا' شوہر سے جدائی بہت تکلیف دہ ہے لیکن وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں ناں کہ جو شریک سفر ہوتے ہوئے بھی اسے کسی اور کو سونپ کر حوصلے سے صبر سے زندگی گزاریں کوئی اور نہیں میری اپنی والدہ محترمہ بشریٰ امین صاحبہ ایسی ہی ہستی ہیں۔ میرے بابا جان اپنی دوسری وائف کے ساتھ گاؤں میں رہتے ہیں لیکن وہ صبر کرتی ہیں' ہم لڑنے جھگڑنے کے بجائے ہنسی خوشی رہتے ہیں اور میں یہ بات علی الاعلان کہتی ہوں کہ ہمیں ایک دوسرے سے بہت شدید محبت ہے' ویک اینڈ وہ سب ہمارے ساتھ ہی گزارتے ہیں ہمیشہ' یا ہم ان کے ساتھ۔ ایک تھی مثال کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن پہلے حمد اور نعت اور احادیث کا ذکر کرتے چلیں عنایت علی خان' امجد اسلام امجد ویل ڈن! خدا آپ کو اور توفیق دے (تعریف بیان کرنے کی) نکاح سے متعلق احادیث میرے بابا کو بہت پسند آئیں۔ میں تو پہلے سے پڑھ چکی ہوں یہ سب لیکن بابا جان عمل کرتے ہیں' اس لیے ان کو سناتی ہوں وہ شمارے کے اس حصے کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں / مطلب سنتے ہیں لوگوں کے فیصلے بھی کرواتے ہیں جرگہ ٹائپ سمجھ لیں لیکن سخت اصول وہ بھی اسلامی فالو کرتے ہیں۔ نرم دل بھی ہیں پہلے الیکشن لڑا کرتے تھے آج کل ویلے (فارغ) ہوتے ہیں بھئی میرے دو بڑے بھائی فیکٹری سنبھالتے ہیں اس لیے ہاں تو "ایک تھی مثال" عدیل اور بشریٰ کی بے وقوفیوں کی بھینٹ چڑھے گی معصوم "مثال"

ج: پیاری عائشہ! ہمیں خوشی ہے کہ آپ مثبت انداز سے سوچتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بہن بھائیوں کی آپس میں محبت کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ زندگی میں خوشی' سکون' اطمینان صرف محبت میں ہے۔ نفرت دوسروں کو کم نقصان پہنچاتی ہے۔ خود کو زیادہ جلاتی ہے۔ آپ کا خط ان لوگوں کے لیے مثال ہے جو سگے' سوتیلے رشتوں کو بنیاد بنا کر نفرتوں کی فصل کاشت کرتے ہیں اور پھر نفرتیں ہی کاٹتے ہیں آپ کے بابا کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ فیصلے کرانا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ اس فرض کو اسلامی اصولوں کے مطابق سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ ان کے لیے بھی بہتر ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ جن معاشروں میں انصاف نہ ہوں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔

فوزیہ رحمٰن قاران سے لکھتی ہیں

ایک ہی نشست میں دو کہانیاں پڑھ لیں۔ دونوں ہی محبت کی کہانیاں۔ ایک میں محبت واقعی دیمک زدہ' تو ایک میں آخر کار محبت مقدس ٹھہری۔

"ایک تھی مثال" میں اب مثال بے چاری کے ساتھ تو جانے کیا ہو۔ مجھے ذاتی طور پر نبیلہ عزیز کا یہ ناول "رقص بسمل" پسند نہیں آیا۔ ان کو اب مکمل ناول لکھنا چاہیے تھا۔ اس میں تو پتا ہی نہیں چل رہا کہ ہیرو کون ہے۔ناول افسانوں میں "سبز کائی" پسند آیا۔ شاہین رشید سے گزارش ہے کہ پلیز ثمینا ثانی کا انٹرویو لیں اور نبیلہ ابر راجہ سے بھی التجا ہے کہ اب ایک مکمل ناول ہی لکھ دیں پلیز۔

ج: پیاری فوزیہ! نبیلہ عزیز اس ناول پر پوری توجہ نہیں دے پا رہی ہیں کرن کا ناول جلد ہی اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ پھر نبیلہ اس ناول پر بھرپور توجہ دیں گی اور آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔ سمیرا حمید اور صائمہ اکرم تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

سعدیہ مریم سعدی نے کولاچی سے لکھا ہے

شعاع میں اتنے بہترین سلسلے' بندھن' شادی مبارک' شاعری سچ بولتی ہے' شادی کے ساتھ ساتھ' یہ تمام سلسلے کسی اور شمارے میں کہاں پائے جاتے ہیں بھلا۔ صائمہ اکرم چودہری' ایک بہترین نام اور اعلیٰ کام ایک ایسی کہانی ہے جو مرتے دم تک نہیں بھولے گی' پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے ایک کہانی پڑھ کر پرچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ابھی تک ہم اداسیوں بھرے حصار میں ہیں۔ ایک اور بات پوچھنی تھی ادارہ خواتین ڈائجسٹ شاعری کی کتابیں بھی شائع کرتا ہے؟

ج: پیاری سعدیہ! خوش آمدید۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے شاعری کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ آپ مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون کر کے ان کے بارے میں پتا کر سکتی ہیں فون نمبر یہ ہے 021-32216361 آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ پڑھ کر ہی رائے دے سکتے ہیں۔ ایک کہانی جنوری کے شمارے میں شامل ہے کولاچی سے پہلا خط موصول ہوا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

مہر گل نے کراچی سے لکھا ہے

"شعاع" ہمیں سرشار کر گیا۔ حمد و توصیف رسول سے عقیدت کے پھول چنتے ہوئے "خط آپ کے" کی جانب دوڑے مگر ہائے یہ طرز تغافل "گڈریا" پر تبصرہ بہت منفرد لگا۔ آخر مصنف بھی تو "اشفاق احمد (مرحوم)" تھے ادب کی جانی مانی شخصیت "رقص بسمل" کی رفتار سست لگی۔ "سبز کائی" اور "خلش" بھی بہترین تھیں مگر "مداوا" تو رعین دل خوش کر دیا آپ نے "محبت من محرم" ایک لیجنڈ تحریر مگر سمیرا نے اس کا اختتام بہت جلدی میں کیا' کچھ تشنگی کا احساس رہ گیا۔ "زود پشیماں" میں آسیہ جی اپنے پرانے انداز میں نظر آئیں مگر نوید کی والدہ کا رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ "تم جان جاؤ گی" اچھی تحریر تو تھی مگر کیا

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ شہزادی عباس خلجی کی والدہ محترمہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں جیسی نعمت کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم شہزادی عباس کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

زینب اور زوار خوش رہ سکیں گے یا یونہی سمجھوتے کی زندگی تا عمر گزاریں گے۔

اور پھر عشق کی تڑپ رشتوں کی تحریم محبت اور الفت کے اچھوتے اور نازک دھاگوں سے بجی "عشق دعا ہے" سامنے آئی' الفاظ سے احساسات بیان کرنے کا فن' ربیط اور مرجانہ کی محبت' شبیر اور فیض کا پیار اور شرارتیں ثوبانہ اور فاطمہ کا کرب حیات' عمر خان کا پل پل مرتے ہوئے زیست کرنا' لالنی کی حساسیت اور لالنی اور ساریہ کا مستقبل زیاد خان کی کشمکش' ان تمام احساسات نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

ج: پیاری مہر آپ کا خوب صورت الفاظ میں تبصرہ بہت اچھا لگا ہمیں بے حد افسوس ہے آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بنت داؤد راولپنڈی سے شریک محفل ہیں

سرورق پسند آیا۔ آپ نے ٹھیک کہا "کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں" فرقہ واریت و تعصبات نے ہمیں تباہ کر رکھا ہے۔ "صبا گل کے شکوے" کے جواب میں آپ نے میرے خیالات کی عکاسی کی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پوری قوم کے ہیرو ہیں اور ہم سب انھیں اپنا محسن تصور کرتے ہیں بلا کسی تفریق کے۔

اب آتے ہیں باقی شعاع کی طرف۔ محبت من محرم اور دیمک زدہ محبت کا ایک ساتھ اختتام ہوا۔ دونوں نے ہی محبت کو خوب بیان کیا۔ کہیں محبت زندگی کی پیامبر ہے تو کہیں یہ موت کا پروانہ تھما دیتی ہے۔ سمیرا حمید کا انداز تحریر بہت زبردست تھا' ان کا انٹرویو لیں۔ رخسانہ نگار بہت سبق آموز لکھ رہی ہیں۔ رقص بسمل کی یہ قسط بھی شاندار رہی۔ ماورا نے آتے ہی ہیرو بنا دیا۔ واہ مزا آگیا۔ "عشق دعا ہے" پہ تبصرہ محفوظ ہے۔ سید آل رضا کی غزل پسند آئی۔

ج : بنت داؤد! آپ اپنے ناول کا بقیہ حصہ بھجوا دیں۔ ہم پورا پڑھ کر ہی رائے دے سکتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صدیقہ' انیق ملک سمندری سے شرکت کر رہی ہیں' لکھا ہے

سب سے پہلے ناول "دیمک زدہ محبت" پڑھا۔ واہ جی واہ صائمہ جی بہت خوب لکھا۔ ویری نائس "محبت من محرم" ناول کا اینڈ بہت اچھا کیا سمیرا جی' ویل ڈن۔ اب آتے ہیں اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر "نبیلہ آپی" بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بی گل کا کردار بہت اچھا لگتا ہے۔ "ایک تھی مثال" اسٹوری پڑھ کر تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ رخسانہ آپی بہت اچھا لکھ رہی ہیں بٹ اتنا دکھ..... افسانے' نعیمہ ناز اور نور عین نے بھی بہت اچھے لکھے نائس جی۔

ج : صدیقہ اور انیقہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

جام پور سے شمع مسکان کا خط ہے' لکھتی ہیں

پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں نکاح کے متعلق میرے علم میں اضافہ ہوا۔ نکاح سے پہلے اک نظر دیکھنا جائز ہے۔ یہ تو بالکل بھی میرے ناقص علم میں نہیں تھا اور آزاد عورت سے کیا مراد تھی کچھ سمجھ نہ سکی' پلیز وضاحت کر دیں۔ تحاریر میں سب سے پہلے سمیرا حمید کا "محبت من محرم" پڑھا۔ اینڈ حسب توقع ہوا۔

ناولٹ "دیمک زدہ محبت" حسب توقع سکینہ قبر کی گود میں سلا دی گئی۔ مگر خلاف توقع ڈاکٹر خاور علی کے دل میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے کھڑی سکینہ کی محبت۔ کیا یہ صائمہ اکرم بشریٰ انصاری ہیں۔ جو ہماری بہت اچھی اداکارہ بھی ہیں۔ ضرور بتائیں۔

"ایک تھی مثال" کہانی تو ہمارے لیے ایک مثال ہی بن گئی۔ بہت دکھ و اضطراب لیے یہ اسٹوری آگے بڑھ رہی ہے۔ نبیلہ عزیز کا "رقص بسمل" ناول بہت خوب صورتی سے آگے کی طرف گامزن ہے۔ نزہت شبانہ حیدر کے ناولٹ میں تزکی کا غرور تو قائم رہا کہ زوار کو اسی سے محبت ہے مکمل ناول میں "زود پشیماں" آسیہ رزاقی کا سبق آموز ناول اچھا لگا۔ نرم نرم الفاظ میں گہرے دکھ سے روشناس کرواتی ایک اچھوتی تحریر۔ کیا ماں ایسی بھی ہوتی ہے پورا ناول یہی سوچتے سوچتے پڑھا کہ اب کہ اب آسیہ جی واضح کرتی ہیں کہ نوید کو فلاں سے گود لیا ہے۔ مگر نہیں ..... وہ تو ان کی اپنی سگی اولاد تھا۔ نوید کا عظمیٰ سے نکاح ورطۂ حیرت میں ڈال گیا۔ وہ تو تبریز کو پسند کرتی تھی۔ بے شک یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی۔ مگر تھی تو اور نوید بھی۔ نوید کو ماں تو مل ہی گئی دولت نہ ملی تو کیا ہوا۔ افسانے تینوں ہی اچھے تھے مگر خلش نے گہرا اثر چھوڑا۔

میں یہاں ذکر کروں گی صبا گل ڈی آئی خان کے خط کا۔

صبا آپنے اور سائرہ رضا نے بھی کچھ غلط نہیں لکھا دین اسلام کلمہ طیبہ ہی ہماری پہچان ہے۔ آج کل تو کوئی اپنے فیملی ممبر کے متعلق اتنے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا جتنا آپ نے پٹھانوں کے متعلق کہا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے شہری معاشرے میں بھی ایسی فیملیز ہیں جہاں غیر برادری میں سے رشتہ آنے پر ہی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔

ج : شمع! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ ہم نے آپ کے خط کا انتخاب بھی کیا تھا لیکن صفحات کی کمی آڑے آگئی۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" کے لیے آپ کا تعارف ان شاء اللہ ضرور شائع ہو گا۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔

نزہت شبانہ حیدر کے ناولٹ میں تزکی کو غرور نہیں تھا۔ بس وہ اپنی خوب صورتی سے آگاہ تھی۔ لیکن وہ زوار سے محبت ضرور کرتی تھی۔ تب ہی جب زوار نے اسے چھوڑ کر زینب سے شادی کی تو وہ بیمار پڑ گئی۔ رہی غرور کی بات تو غرور تو اس کا اسی دن ٹوٹ گیا تھا جب زوار نے اسے محبت کے خواب دکھا کر درمیان میں چھوڑ دیا' اس کے بعد زوار کا فیصلہ تو تابوت میں آخری کیل تھی۔

آسیہ رزاقی کے ناولٹ میں تبریز کو عظمیٰ پسند کرتی تھی محبت نہیں۔

ہم آپ سے متفق ہیں کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ ہر جگہ' ہر قوم میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

صائمہ اکرم اور بشریٰ انصاری دو مختلف شخصیات ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی رشتہ' تعلق حتیٰ کہ کوئی مماثلت بھی نہیں ہے۔

فائزہ بلال اقرا نے جام پور پنجاب سے لکھا ہے

شعاع' خواتین سے ناتا زیادہ پرانا نہیں۔ بابا جان بہت مخالفت کرتے ہیں رسالے پڑھنے کی "دیمک زدہ محبت" میں ماہم اور عائشہ کا کردار پسند تھا۔ مجھ میں بہت سی خصوصیات ماہم کی جیسی ہیں۔ چیزوں کی ظاہری حالت کی بنا پر ریجکٹ کر دینا' استعمال شدہ چیزیں بھی دوسروں کو دیتے ہوئے دل دکھنا۔ میری ریکویسٹ ہے کہ آپ مصنفین کے انٹرویوز شائع کیا کریں۔

ج : پیاری فائزہ شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ ابھی آپ بہت کم عمر ہیں' اس عمر میں ظاہری خوب صورتی اور چمک دمک بہت متاثر کرتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پتا چلتا ہے کہ اصل خوب صورتی کیا ہے۔ ظاہری چیزوں سے متاثر ہونا تو اتنا غلط نہیں البتہ ظاہری حالت کی بنا پر ریجیکٹ کرنا بری بات ہے۔ اپنی اس عادت کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں اور کسی کو اپنی چیز نہ دینا بھی اچھی عادت نہیں ہے۔ یہ بخل ہے۔ مصنفین سے انٹرویو کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ بس تھوڑا انتظار۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گاجر اور انڈوں کا حلوہ

اجزا :

گاجر	ایک کلو
انڈے	چار عدد
چینی	آدھا کپ
بادام/پستے	سجاوٹ کے لیے
کھویا	ایک چوتھائی کپ
پاؤڈر ملک	دو کپ
کنڈینسڈ ملک	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ

ترکیب :

گاجر دھو کر کدوکش کرلیں۔ پھر ڈھکنے پانی میں ہلکی آنچ پر خشک ہونے تک پکائیں۔ الگ دیگچی میں گھی گرم کرکے گاجر ڈال کر بھونیں۔ پاؤڈر ملک، چینی، کنڈینسڈ ملک اور تین انڈے پھینٹ کر شامل کریں۔ گاجر اور انڈے اچھی طرح مکس ہوجائیں تو کیوڑہ ڈالیں۔ پھر ڈش میں نکال کر بادام پستے کی ہوائیاں کھویا اور ایک ابلے ہوئے انڈے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر سجاوٹ کریں اور پیش کریں۔

پارسی مچھلی مسالا

اجزا :

سرمئی/رہو	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
ہری مرچ کا پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا کھوپرا	آدھا کپ
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

مچھلی کے سلائس بنالیں پھر لہسن پیسٹ اور سرکے میں مکس کرکے رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد دو کھانے کے چمچے تیل میں ہلکا سا فرائی کرکے پلیٹ میں نکال لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے چوپ کی ہوئی پیاز سنہری کریں پھر میتھی دانہ اور باقی لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد تمام مسالے ڈال کر دس منٹ تک بھونیں۔ تیل الگ ہونے لگے تو ایک کپ پانی اچھی طرح مکس کرکے فرائیڈ فش سلائس الگ الگ احتیاط سے رکھ کر دیگچی ہلائیں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ ڈش میں نکالتے وقت ایک کھانے کے چمچہ لیموں کا رس چھڑک دیں۔

بادام کا حلوہ

اجزا :

بادام	ایک سیر
گھی	ایک پاؤ
کشمش/پستے	ایک ایک کھانے کا چمچہ
کھویا	ایک کپ
کیوڑہ	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	آدھا کلو

ترکیب :

باداموں کو بھگو کر چھلکا اتارلیں اور پیس لیں۔ گرم گھی میں الائچی دانے کڑکڑا کر پسے ہوئے بادام ڈال دیں۔ چینی اور کھویا شامل کرکے خوب بھونیں۔ پھر کشمش اور پستے بھی ڈال دیں۔ چاہیں تو آدھا پاؤ بالائی بھی ڈال سکتی ہیں۔ گھی چھوڑدے تو اتارلیں اور ٹرے میں جما کر چاندی کے ورق لگائیں اور کاٹ لیں۔

بادام کا سوپ

اجزا :

بادام	پندرہ عدد
دودھ	ایک کپ
کریم	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

گرم پانی میں بادام بھگو کر چھیل لیں اور باریک پیس لیں۔ دودھ میں کارن فلور مکس کرکے گاڑھا سا پیسٹ بنالیں۔ تیل میں پیاز نرم کرکے آدھی پیاز الگ کردیں۔ اس ساس پان میں کارن فلور پیسٹ، بادام پیسٹ، نمک اور ڈیڑھ کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پھر کریم بھی شامل کردیں۔ دس منٹ پکانے کے بعد پیالے میں نکال کر بقیہ پیاز ڈال کر پیش کریں۔

خوب صورت نظر آنا ہر عورت کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ اس کی ضرورت اور حق بھی ہے۔ لیکن خوب صورتی کسی قدرتی جسمانی خاصیت کا نام نہیں ہے' بلکہ خوب صورتی کا اہم ترین عنصر دمکتی ہوئی پر کشش اور تروتازہ جلد کے حصول میں پوشیدہ ہے مگر یہ راز آپ باآسانی پاسکتی ہیں۔ بس اپنے کچن میں موجود اشیا پر غور کرنا ہے اور ان کے بہتر استعمال کو اپنانا ہے۔ اس کے علاوہ موسم کی تبدیلی کو بھی مدنظر رکھنا ہے۔

جلد کے لیے

موسم سرما چونکہ خشک ہوتا ہے۔ اس لیے جلد پر اس کا فوری اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اس موسم میں احتیاط لازم ہے۔ گرمیوں کی طرح سردیوں میں بھی خود کو دھوپ سے بچائیں' کیونکہ سردیوں کی دھوپ جلد کو کملا کر اس کی دلکشی ماند کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ ایلوویرا کا رس بطور سن بلاک چہرے پر ضرور لگائیں۔ یہ جلد کی اسی فیصد حفاظت کرتا ہے۔

بند گوبھی کے چند پتوں کو گرائنڈ کرکے ان کا جوس نکال لیں۔ اس میں شہد ملائیں اور چہرے اور گردن پر موٹی تہ لگالیں۔ بیس منٹ لگا رہنے دیں' پھر پانی میں تولیے کو گیلا کرکے اتار لیں۔ یہ ماسک جھریوں سے بچانے کے لیے بہترین ہے۔

جلد کی ملائمت کے لیے آپ اپنے چہرے پر مایونیز سے بھی مساج کر سکتی ہیں۔ ہلکے ہاتھوں سے مساج کر کے بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں پھر سادے پانی سے دھولیں۔ مہنگی کریموں کا نعم البدل ہے۔

بالوں کے لیے

سردیوں کے موسم میں بال گرنے کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اگر آپ کے بال بہت زیادہ گر رہے ہوں تو ایک چائے کا چمچہ کیسٹر آئل' ایک چائے کا چمچہ ناریل کا تیل اور ایک چمچہ ادرک کا رس لے کر اچھی طرح مکس کریں اور بال دھونے سے ایک گھنٹہ پہلے اچھی طرح اس کا سر پر مساج کرلیں۔

بال پتلے اور چھدرے ہوں تو روزانہ انگلیوں کی پوروں کی مدد سے زیتون کے تیل کی مالش کریں' تاکہ دوران خون تیز ہوسکے۔ پھر چند منٹ تک بالوں میں برش کریں اور گرم پانی میں بھیگا تولیہ سر پر لپیٹیں' اس سے بال تیزی سے بڑھتے ہیں۔

فلو سے بچاؤ کے لیے

جسم کی مدافعت بڑھانے کے لیے لہسن اور پیاز کا استعمال مفید ہے۔ نیم گرم پانی میں لیموں کا رس اور شہد ملا کر پئیں۔ فلو سے بچنے کے لیے چائے پکاتے وقت اس میں ذرا سی ادرک اور دار چینی کا ٹکڑا ڈال دیں۔ صبح شام یہ چائے پئیں۔

کیا کھائیں

موسم سرما میں اکثر ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں شل ہوجاتی ہیں۔ اس کا عام سبب خون میں فولاد کی کمی ہوتی ہے۔ آئرن کی کمی دور کرنے کے لیے مچھلی' کلیجی' مرغی' دالیں اور ہرے پتوں والی سبزیاں باقاعدگی سے کھائیں۔ پالک کا ساگ آئرن کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اسے پکاتے ہوئے زیادہ بھونا نہ جائے تاکہ فولاد ضائع ہونے سے بچ جائے۔

جسم میں آئرن جذب ہونے میں وٹامن سی بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سنگترے کا رس وٹامن سی کا بہترین ذریعہ ہے۔ روزانہ ایک کینو ضرور کھائیں۔